دروس القرآن

۴

متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ

مرکز اھل السنۃ والجماعۃ

نام کتاب .... دروس القرآن جلد چہارم

تالیف: .... متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ

تاریخ اشاعت .... مارچ 2020ء

بار اشاعت .... اوّل

تعداد اشاعت 1100

ناشر .... مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ، 87 جنوبی لاہور روڈ سرگودھا

0321-6353540
0335-7500510

www.ahnafmedia.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

سورۃ ص ------------------------------ 98

سورۃ المؤمن ------------------------ 156

سورۃ محمد ---------------------------------- 324

سورۃ الفتح ---------- 344

سورۃ الرحمٰن ---------------------------- 496

سورۃ الواقعۃ -- 515

سورۃ یٰس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰسٓ ﴿۱﴾ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۳﴾﴾

فضائل و اسمائے سورت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اِنَّ لِکُلِّ شَیۡئٍ قَلۡبًا وَقَلۡبُ الۡقُرۡاٰن یٰسٓ "[1]

ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن پاک کا دل سورۃ یٰسین ہے۔

اس کی وجہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اصل مقصود آخرت ہے، قبر ہے، حشر ہے، اللہ کی رضا ہے اور اس سورت مبارکہ میں قیامت اور آخرت کے مضامین کو بڑی اہمیت سے بیان کیا گیا ہے اور جب انسان کے دل میں آخرت بیٹھ جاتی ہے تو نیک اعمال کرنا اور گناہ چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ خوفِ آخرت گویا دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح جسم میں دل ہے، وہ ٹھیک ہو تو بندہ ٹھیک ہے، وہ خراب ہو تو پورا جسم خراب ہوتا ہے۔ اسی طرح خوفِ آخرت شریعت میں دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ اس سورت میں معاد اور قیامت کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان

1۔ سنن الترمذی، رقم:2887

کیا ہے اس لیے اس سورت کو قرآن کریم کا دل کہا جاتا ہے۔

اس کا ایک نام سورت عظیمہ بھی ہے کہ یہ بہت عظمت والی ہے۔ اس کا ایک نام مُدَافِعہ بھی ہے کہ جو اس کو پڑھتا ہے اس سے عذاب کو روک دیتی ہے۔ اس کا ایک نام مُعِمَّہ بھی ہے مُعِمَّہ کا معنی کہ انسان کے دنیا اور آخرت کے احوال کو سنبھالتی ہے اور آسان کرتی ہے۔ اس کا ایک نام قاضیہ بھی ہے کہ بندے کی حاجات اور ضرورتیں پوری کرتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"وَاقْرَؤُوْهَا عَلٰى مَوْتَاكُمْ." [2]

کہ سورت یٰسین کو اپنے مردوں پر پڑھا کرو۔

جب موت کا وقت قریب ہو تو سورت یٰسین پڑھنے سے روح آسانی سے نکل جاتی ہے۔

﴿یٰسٓ﴾ کا معنی:

یہ مقطعات اور مَتَشابہات میں سے ہے جس کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اگرچہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ "یٰسٓ" یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام ہے۔

یاسین نام رکھنے کا حکم:

یہاں ایک مسئلہ یاد رکھ لیں کہ کسی شخص کا نام یاسین رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہے کہ "یٰسٓ" اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس لیے یہ نام نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ یہ نام اللہ کے ساتھ خاص ہے جیسے رازق،

2۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج8 ص500 رقم الحدیث 16905

خالق، رحمٰن وغیرہ یا مخلوق کے لیے اس کی گنجائش ہے جس طرح آپ اسمائے باری تعالیٰ کی بحث القواعد فی العقائد کے سبق میں پڑھ چکے ہیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یاسین نام رکھ سکتے ہیں اور صحیح بات بھی یہی ہے کہ یاسین نام رکھنا جائز ہے لیکن جب یاسین کسی شخص کا نام رکھیں تو یوں نہ لکھیں جس طرح قرآن میں لکھا ہے [یٰسٓ] بلکہ اس طرح لکھیں یا.. الف.. سین.. یا.. نون.. کے ساتھ یعنی یاسین کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾﴾[3] یہ معروف قرأت ہے اور ایک قرأت میں ہے "سَلَامٌ عَلٰٓى اٰلِ يَاسِيْنَ" تو ایک قرأت میں چونکہ مستقل یاسین مخلوق کے لیے استعمال ہوا ہے، اس لیے یاسین نام رکھنا جائز ہے۔

جزیرۃ العرب میں حضور علیہ السلام سے پہلے کوئی نبی آیا یا نہیں؟

﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۵﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۶﴾﴾

قسم ہے قرآن کی جو حکمت والا ہے بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں، آپ سیدھے راستے پر ہیں، یہ قرآن اس ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے جو غالب اور رحم کرنے والی ہے، آپ کو رسول اس لیے بنایا گیا ہے تا کہ آپ ایسی قوم کو ڈرائیں جن کے آباء واجداد کو نہیں ڈرایا گیا اسی وجہ سے یہ لوگ غفلت میں ہیں۔

یہاں فرمایا: ﴿لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ﴾ کہ آپ ایسی قوم کو ڈرائیں کہ جن کے آباء واجداد کو نہیں ڈرایا گیا... حالانکہ سورۃ فاطر میں ہے: ﴿وَاِنْ

3۔ الصّٰفّٰت 130:37

مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ﴿۲۴﴾[4] کہ اللہ ہر امت میں ایک بندہ ڈرانے والا بھیجتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام انہی کے آباء واجداد میں آئے تھے، پھر یہ کیسے کہا گیا کہ ان کے آباءواجداد کو نہیں ڈرایا گیا؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بعد بہت لمبا وقت گزرا ہے کہ اس میں ان میں کوئی پیغمبر نذیر نہیں آیا، ہر جگہ پر "نذیر" کا معنی یہ نہیں کہ ہر جگہ نبی ہی جائے گا بلکہ کسی جگہ پر نبی جائے گا اور کسی جگہ پر نبی کا نائب جائے گا۔ خصوصاً آپ آخری امت دیکھ لیں۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نذیر بن کر آئے ہیں لیکن جزیرہ عرب سے باہر آپ کے اسفار نہیں ہیں۔ تو ﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ﴿۲۴﴾﴾ کا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت محمدیہ کے نبی ہیں، ایک جگہ پر تو خود نذیر بن کر آئے ہیں، ہر جگہ اور ہر شہر میں آپ نہیں گئے لیکن آپ کے نائب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور امت کے علماء ہر جگہ پر موجود ہیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ جو اثر براہِ راست نبی سے ہوتا ہے وہ نبی کے نائب سے نہیں ہوتا۔ اس لیے فرمایا کہ ان میں کوئی ڈرانے والا نہیں آیا یعنی بطورِ نبی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بعد۔

حضور علیہ السلام کے مخالفین کی حالت:

﴿اِنَّا جَعَلۡنَا فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ اَغۡلٰلًا فَهِیَ اِلَی الۡاَذۡقَانِ فَهُمۡ مُّقۡمَحُوۡنَ﴿۸﴾ وَ جَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ سَدًّا وَّ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَیۡنٰهُمۡ فَهُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ﴿۹﴾﴾

یہاں دو مثالیں ان لوگوں کی دی ہیں جو پیغمبر کی بات کو نہیں مانتے۔ پہلی

4۔ فاطر 24:35

مثال جیسے کسی شخص کی گردن میں طوق ڈال دیں تو وہ نیچے دیکھنا بھی چاہے تو نہیں دیکھ سکتا، جب نیچے نہیں دیکھ سکتا تو چلے گا کیسے؟ نہیں چل سکتا نا۔

اور دوسری مثال کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے چاروں طرف دیوار ہوتی ہے اور وہ دیوار سے نکلیں گے نہیں تو چلیں گے کیسے۔

اور ایسے آدمی بھی دو قسم کے ہوتے ہیں؛ بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جو نیچے نہیں دیکھ سکتے اور بعض ایسے ہیں کہ جو چاروں طرف نہیں دیکھ سکتے، ہر اعتبار سے اندھے ہیں، ان پر کلام اثر ہی نہیں کرتا۔ تو ان دو قسم کے لوگوں کے لیے دو قسم کی مثالیں بیان کی ہیں۔

اِنذار کا فائدہ حضور علیہ السلام کو تو ہو گا:

﴿وَ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝١٠﴾

ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کو کچھ فائدہ نہیں ہو گا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس پر سوال یہ ہے کہ جب ڈرانے کا فائدہ نہیں ہے تو پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کیوں ڈراتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے ﴿وَ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ء﴾ فرمایا ہے، "سَوَآءٌ عَلَيۡكَ" نہیں فرمایا یعنی ان کو ڈرانے کا آپ کو ثواب تو ملے گا لیکن ان کو فائدہ پھر بھی نہیں ہو گا، یہ لوگ ڈھیٹ اور ضدی ہیں، لہذا ڈراتے رہنا چاہیے۔

اعمال اور ان کے اثرات:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نُحۡيِ الۡمَوۡتٰى وَ نَكۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَهُمۡ﴾

بے شک ہم ہی مردوں کو زندہ کریں گے اور ہم لکھتے ہیں جو انہوں نے اعمال

آگے بھیجے ہیں اور جو ان کے اعمال کے اثرات ہیں ان کو بھی لکھتے ہیں۔

آگے بھیجنے کا معنی یہ ہے کہ آدمی نیک یا برا عمل کرے تو وہ اللہ کے ہاں محفوظ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ [5]

جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا۔

عمل کے نتائج بھی لکھے جاتے ہیں:

﴿وَاٰثَارَهُمۡ﴾... اس کا ایک معنی یہ ہے کہ تمہارے اعمال کے جو ثمرات اور نتائج نکلتے ہیں ہم ان کو بھی لکھ لیتے ہیں۔ ایک عمل ہوتا ہے اور ایک اس عمل کا متعدی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بندے نے کوئی علمی کام کیا مثلاً وعظ کیا، کوئی کتاب لکھی تو یہ اس کا عمل ہے اور اس کے بعد لوگوں نے اس سے نفع حاصل کیا، لوگ راہِ راست پر آگئے تو یہ اس کا اثر ہے۔ ایک انسان قرآن کریم پڑھاتا ہے آگے اس کے شاگرد ہوتے ہیں، یہ قرآن کریم پڑھانا اس کا عمل ہے، آگے شاگرد یہ اس کا نتیجہ ہے۔ ایک بندے نے کوئی برا کام کیا سینما بنا دیا تو جو لوگ اس سینما میں فلمیں دیکھیں گے تو یہ اس بندے کے عمل کا اثر ہے۔ جیسے حدیث پاک میں آیا ہے:

" مَنۡ سَنَّ فِي الۡإِسۡلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجۡرُهَا وَأَجۡرُ مَنۡ عَمِلَ بِهَا بَعۡدَهُ مِنۡ غَيۡرِ أَنۡ يُنۡتَقَصَ مِنۡ أُجُورِهِمۡ شَيۡءٌ وَمَنۡ سَنَّ فِي الۡإِسۡلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيۡهِ وِزۡرُهَا وَوِزۡرُ مَنۡ عَمِلَ بِهَا. " [6]

کہ جو شخص اسلام میں کوئی نیک کام ایسا شروع کرتا ہے کہ جس پر لوگ عمل

5۔ النحل 96:16

6۔ صحیح مسلم، رقم: 1017

کرتے ہیں تو اس نیک عمل کا اجر اس کو ملے گا اور جو لوگ نیک عمل کریں گے ان سب کا اجر بھی اس بندے کو ملے گا اور اگر کوئی شخص گناہ کا ایسا کام کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ گناہ کرتے ہیں تو اس کے گناہ کا وبال اس پر ہو گا اور لوگ جو گناہ کرتے ہیں ان سب کے گناہوں کا وبال بھی اس پر ہو گا۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم بندوں کے اعمال بھی لکھتے ہیں اور ان کے اثرات اور نتائج کو بھی لکھتے ہیں۔

آثار کا ایک معنی نشان بھی آتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث پاک میں آیا ہے کہ انسان جب نماز کے لیے جاتا ہے تو ایک قدم پر اسے ایک نیکی ملتی ہے۔ یہ آثار ہیں۔ جس طرح نماز پڑھنے کا ثواب ہے ان آثار قدموں کے نشانات کا بھی ثواب ہے۔ اللہ اس کو بھی لکھ لیتے ہیں۔

بستی والوں کا قصہ:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۚ﴿١٣﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿١٤﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿١٥﴾﴾

اوپر جن منکرینِ نبوت و رسالت کفار کا ذکر آیا ہے ان کو متنبہ کرنے کے لیے قرآن کریم بطورِ مثال کے پہلے زمانے کا ایک قصہ بیان کرتا ہے جو ایک بستی میں پیش آیا تھا۔ فرمایا: ان کے سامنے ایک بستی والوں کی مثال بیان کرو۔ جب ان کے پاس ہمارے رسول آئے۔ جب ہم نے -شروع میں- ان کے پاس دو پیغمبر بھیجے تو اس بستی والوں نے ان کو جھٹلا دیا۔ ہم نے ایک اور پیغمبر ان کی تصدیق اور تائید کے لیے بھیجا۔ اب ان تینوں نے کہا کہ یقیناً ہم تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ انہوں نے

پھر ان کو بھی جھٹلایا، کہا کہ تم تو ہم جیسے آدمی ہی ہو اور رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی، تم جھوٹ بول رہے ہو - معاذ اللہ -

ان رسولوں نے کہا کہ ہمارے رب کو خوب معلوم ہے کہ ہمیں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، ہمارا کام صرف یہی تھا کہ ہم واضح طور پر تمہارے پاس رب کا پیغام پہنچا دیں - بعض روایات میں ہے کہ ان پیغمبروں کی دعوت نہ ماننے کی وجہ سے ان بستی والوں پر قحط کا عذاب آیا تو - ان بستی والوں نے کہا کہ ہمیں تو تمہارے اندر نحوست محسوس ہو رہی ہے، اگر تم اس کام سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور تمہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ پیغمبروں نے جواب دیا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ تم یہ باتیں اس لیے کر رہے ہو کہ تمہیں ایک واضح پیغام پہنچایا گیا ہے؟ تم لوگ تو حد سے تجاوز کرنے والے ہو!

بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے ان پیغمبروں کو شہید کر دیا۔

اب یہاں ایک بات سمجھیں۔ ﴿قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ﴾ وہ لوگ کہتے تھے کہ ہمیں تو تمہارے اندر نحوست محسوس ہو رہی ہے، کیا مطلب کہ تمہاری وجہ سے ہم پر عذاب آیا ہے۔ جب تم نہیں تھے تو ہمارے اوپر کبھی عذاب نہیں آیا اور جب تم آئے ہو تو ہمارے اوپر دو عذاب آئے ہیں؛ ایک تو ہماری قوم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے، آپس کے اختلافات کا شکار ہو گئی ہے جس سے ہماری طاقت ختم ہو گئی ہے۔ قوم کا ٹوٹ جانا یہ بہت بڑا عذاب ہوتا ہے اور دوسرا ہم پر قحط کا عذاب آیا ہے، اور جن کو تم گناہ کہہ رہے ہو کفر... شرک... بڑے بڑے جرم... یہ سارے گناہ ہم پہلے بھی کرتے تھے مگر ہمارے اوپر کبھی عذاب نہیں آیا۔ اب عذاب کا آنا یہ تمہاری وجہ سے ہے۔

اب دیکھیں! بظاہر ان کی بات وزنی معلوم ہوتی ہے۔

اس کا جواب سمجھیں کہ جب پہلے کفر اور زنا کرتے تھے تو عذاب اس لیے نہیں آیا کہ ان کے پاس کوئی سمجھانے والا داعی نہیں پہنچا تھا، ان پر حجت تام نہیں ہوئی تھی اور جب انہیں سمجھایا گیا کہ کفر سے باز آجاؤ، شرک سے باز آجاؤ، جرم کو چھوڑ دو! جب یہ باز نہ آئے تو حجت تام ہوگئی اس لیے اب عذاب آیا۔ تو عذاب کا آنا یہ تمہارے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے ہے۔

اور دوسرا جو تم آپس میں ٹکڑے ہوئے ہو تو یہ تمہاری وجہ سے ہے، پہلے تم ایک دین؛ کفر پر تھے، ہم نے سمجھایا کہ یہ کفر ہے اس کو چھوڑ دو، کچھ نے چھوڑا اور کچھ نے نہیں چھوڑا تو ٹکڑے ہو گئے۔ اگر سارے کفر چھوڑتے اور ایمان قبول کرتے تو ٹکڑے نہ ہوتے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام نے کہا: ﴿طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ یہ تمہاری نحوست تمہارے ہی ساتھ ہے۔

جبیب ابن اسماعیل نجار کا ذکر:

﴿وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٠﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

شہر کے دوسرے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، کہنے لگا کہ اے میری قوم! ان رسولوں کی بات مان لو، ان کی بات مان لو جو تم سے اجرت نہیں مانگتے اور صحیح راستے پر ہیں۔

یہ "رجل" کون تھا؟ کہتے ہیں حبیب ابن اسماعیل نجار تھا۔ اس کے بارے میں ایک روایت میں ہے کہ یہ جذام کا مریض تھا۔ یہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے دعا کرتا تھا کہ میری بیماری ٹھیک کر دیں لیکن کچھ افاقہ نہیں ہوتا تھا۔ ستر سال سے یہ بیماری اس پر تھی اور اس کا مکان شہر کے کنارے پر سب سے آخری دروازے پر تھا، یہ

وہاں پڑا رہتا تھا۔ رسول جب اس شہر میں داخل ہوئے تو اسی دروازے سے داخل ہوئے جہاں اس کا مکان تھا۔ تو ان کی پہلی ملاقات اسی شخص سے ہوئی۔ رسولوں نے اس کو دین کی دعوت دی، اللہ کی توحید کی بات کی تو اس نے کہا کہ تمہارے پاس اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل یا علامت ہے؟ انہوں نے کہا بالکل ہے۔ اس نے کہا: میں بیمار ہوں کیا میری بیماری ٹھیک ہو سکتی ہے؟ رسولوں نے کہا کہ ہم اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ تمہیں ٹھیک کر دیں گے۔ اس نے کہا کہ میں اپنے معبودوں سے ستر سال سے صحت مانگ رہا ہوں یہ ٹھیک نہیں کر سکے تو تمہارا خدا فوراً کیسے ٹھیک کر دے گا؟ انبیاء علیہم السلام نے دعا مانگی تو یہ ٹھیک ہو گیا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

جب اس نے شہر والوں کا یہ حال سنا کہ وہ رسولوں کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں تو وہ دوڑ کر شہر میں آیا اور آکر قوم کو بڑے احسن انداز میں سمجھایا۔ اس نے کہا: ﴿یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ کہ ان رسولوں کی بات مان لو۔

حبیب نجار کو من جانب اللہ تسلی:

یہ نبی کون ہیں؟ ﴿مَنۡ لَّا یَسۡـَٔلُکُمۡ اَجۡرًا﴾ جو تم سے کچھ مانگتے نہیں، ﴿وَّ ہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ﴾ خود بھی ہدایت پر ہیں اور خیر کی باتیں کرتے ہیں لہذا تمہیں خیال کرنا چاہیے اور اسلوب کیسا پیارا اختیار کیا، کہا: ﴿وَ مَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ کہ جس اللہ نے مجھے پیدا کیا میں اس کی عبادت کیوں نہ کروں! اب یہ ان کو نہیں کہہ رہے بلکہ اپنے آپ کو خطاب کر رہے ہیں کہ مجھے اس رب کی عبادت کرنی چاہیے، میں اللہ کو چھوڑ کر اور خدا کیسے بنالوں؟ مجھے خود خیال کرنا چاہیے لیکن قوم نے بجائے بات ماننے کے اس کو شہید کر دیا۔

اللہ رب العزت نے بذریعہ فرشتہ ان کو بتا دیا کہ تم گھبراؤ مت! اب تمہارا

ٹھکانا ان شاء اللہ جنت ہو گا۔ یہ جو فرمایا: ﴿قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ﴾ کہ اسے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جا اہلِ باطل اس سے استدلال کرتے ہیں کہ موت کے بعد عذاب اور ثواب کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اللہ فرما رہے ہیں: ﴿ادْخُلِ الْجَنَّةَ﴾ کہ جنت میں داخل ہو جا! جنت میں تو آدمی جائے گا حشر کے بعد اور اس کو حشر سے پہلے دخولِ جنت کی بات کہی جا رہی ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ جسم نہیں بلکہ روح کو دخولِ جنت کا حکم ہو رہا ہے، معلوم ہوا کہ سارے معاملات روح کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں۔

ہم نے کہا کہ اس کا معنی ہر گز یہ نہیں ہے جو تم نے بیان کیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روح تو علیین میں ہے، ابدی جنت جہاں رہنا ہے وہاں تو روح نہیں ہے، شہداء کے بارے میں تو نص ہے ہم اس بات کو تو مانتے ہیں۔ یہاں ان کو یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ تم نے قربانی دی ہے تو اس کا نتیجہ جنت ہو گا اور تم اس قربانی کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گے، اور قبر میں دخولِ جنت نہیں ہوتا بلکہ اس میں عرضِ جنت ہوتی ہے جس کو کبھی دخولِ جنت سے تعبیر کر دیتے ہیں، قبر میں جنت دکھائی جاتی ہے، جنت کی خوشبو سونگھائی جاتی ہے، جنت کی فضا دکھاتے ہیں اور قبر میں جنت اور بندے کے درمیان جو دروازہ ہے اس کو کھول دیتے ہیں تو جنت کا منظر بن جاتا ہے۔ جب جنت کا یہ منظر ان کو ملا تو انہوں نے کہا: ﴿يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾ اے کاش! میری قوم کو پتا چل جاتا کہ اللہ نے مجھے معاف کیا ہے اور خدا نے مجھے کتنی عزت دی ہے۔ کاش ان کو پتا چل جاتا۔

بستی والوں کی تباہی:

﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿٢٨﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿٢٩﴾﴾

جب انہوں نے اس بندے کو قتل کیا،ایک روایت میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی انہوں نے شہید کیا تھا تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس قوم کے لیے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارنے پڑے بلکہ ایک چیخ سے ان کو تباہ وبرباد کر دیا گیا۔

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۰﴾

افسوس ان بندوں پر کہ ان کے پاس جب بھی رسول آتے ہیں تو یہ بات سننے کے بجائے الٹا ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کئی قوموں کو ہلاک کر دیا کہ وہ ان کے پاس لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ ان پر عذاب کے لیے حضرت جبرائیل امین آئے، شہر کے دروازے کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور ایک سخت آواز لگائی، اسی آواز کی وجہ سے سارے مر گئے۔

وہ بستی تھی یا شہر: تحقیقی قول:

یہاں فرمایا: ﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ﴾ قریہ کی بات کی ہے اور آگے فرمایا: ﴿وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ﴾ یہاں شہر کی بات کی ہے۔ تو بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ پہلے قریہ یعنی بستی کا لفظ ہے، پھر مدینہ یعنی شہر کا لفظ ہے۔ یہ دو الگ الگ جگہوں کے واقعات تو نہیں ہیں؟

جواب یہ ہے کہ واقعہ ایک ہی جگہ کا ہے، دراصل عربی زبان میں مدینہ؛ شہر کو کہتے ہیں اور قریہ؛ چھوٹی بستی کو بھی کہتے ہیں اور شہر کو بھی کہتے ہیں، دیہات کو بھی کہتے ہیں اور شہر کو بھی کہتے ہیں دونوں کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ طائف والوں نے کہا تھا:

﴿لَوۡ لَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ ﴿۳۱﴾﴾[7]

یہ قرآن ان دو قریوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا؟

ان دو قریوں سے مراد مکہ اور طائف کے شہر ہیں۔ تو قریہ کا اطلاق شہر پر ہونا یہ قرآن کریم سے ثابت ہے، اس لیے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

بستی اور رسولوں کے نام:

اس پر مفسرین نے کلام کیا ہے کہ بستی کون سی تھی؟ تاریخی روایات میں ہے کہ یہ بستی انطاکیہ تھی۔ انطاکیہ شام میں واقع ہے، اور ان رسولوں کے نام کیا تھے؟ بعض کہتے ہیں کہ ایک رسول کا نام صادق تھا، ایک کا صدوق تھا، ایک کا شلوم تھا اور بعض کہتے ہیں کہ تیسرے کا نام شلوم نہیں بلکہ شمعون تھا۔

میں نے آپ سے پہلے عرض کیا تھا کہ ہر بندے کا اپنا ایک ذوق ہوتا ہے، میرا اس معاملے میں ذوق یہ ہے کہ جس معاملے کو قرآن کھولتا ہے اس کو کھولو اور جس کو قرآن چھوڑ دیتا ہے اس کو چھوڑ دو! بستی کا تعین نہ بھی ہو تو اس سے واقعہ پر کیا فرق پڑتا ہے؟ نبی اس بستی میں آئے تھے، بستی والوں نے جھٹلا دیا تھا تو ان پر عذاب آیا۔ اس سے بندے کو عبرت حاصل ہوتی ہے، نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ناموں کا پتا نہیں چلے گا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس لیے ان مباحث میں اسرائیلی روایات اور ضعیف روایات کو لے کر قرآن کریم کی تفسیر کرنے کے بجائے جو چیزیں مطلوب ہیں بس ان پر غور کریں۔

توحید باری تعالیٰ کی نشانیاں:

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَيۡتَةُ ۚۖ اَحۡيَيۡنٰهَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا

7۔ الزخرف 31:43

فَمِنْهُ يَأْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

اللہ رب العزت نے اب اپنی توحید پر نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی نشانی کیا ہے؟ فرمایا کہ اس زمین کو دیکھو یہ بنجر ہوتی ہے، ہم اس کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں اور ہم اس سے غلے نکالتے ہیں جن کو تم کھاتے ہو۔ ہم نے اس زمین میں کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور پانی کے چشمے جاری کیے تاکہ لوگ اس سے پیدا شدہ چیزیں کھائیں - پھل، سبزیاں، میوے کھائیں - ﴿وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ﴾ اور جو اپنے ہاتھوں سے یہ کماتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ پھل کو پیدا تو اللہ فرماتے ہیں آگے انسان کے ہاتھ کا کام شروع ہوتا ہے مثلاً کیلا ہے تو اس کا چھلکا اتار کر کھالیا، پھلوں سے فروٹ چاٹ بنالی، جوس بنالیا وغیرہ، یہ ﴿وَ مَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ﴾ ہے، پھل کی ابتدائی تخلیق اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور کھانے سے پہلے تغیرات یہ بندہ اپنی طرف سے کرتا ہے۔

پھر انسان کے علاوہ جتنے حیوانات ہیں ان کی خوراک مفرد ہے اور انسان کی خوراک مرکب ہے۔ جو جانور گھاس کھاتے ہیں وہ گھاس ہی کھاتے ہیں، وہ گوشت نہیں کھاتے اور جو گوشت کھاتے ہیں وہ گوشت ہی کھاتے ہیں، وہ گھاس نہیں کھاتے، اور انسان گوشت بھی کھاتا ہے اور سبزیاں بھی کھاتا ہے، کبھی گوشت الگ کھاتا ہے اور سبزی الگ کھاتا ہے اور کبھی دونوں کو مکس کر کے کھاتا ہے۔ جو جانور گھاس اور سبزیاں کھاتے ہیں وہ ان میں تغیرات نہیں کرتے جیسے اگتی ہیں ویسے کھا لیتے ہیں اور انسان ایک ایک سبزی کو بیس بیس سٹائل سے کھاتا ہے، جو جانور گوشت کھاتا ہے تو جیسے

گوشت ہے ویسے کھالیتا ہے اور انسان گوشت کی مختلف ڈشیں بنابنا کر کھاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے انسان کو یہ خصوصیات عطا فرمائی ہیں۔

تو انسان جب دونوں قسم کی غذائیں کھاتا ہے، الگ الگ بھی اور اپنی کاریگری سے مکس کر کے بھی، تو اللہ نے دونوں کا ذکر فرمایا؛ کھجور اور انگور الگ الگ غذاؤں کا ذکر بھی کیا اور ﴿وَ مَا عَمِلَتۡهُ اَیۡدِیۡهِمۡ﴾ میں اس کی اپنی کاریگری کا ذکر بھی کیا۔ اللہ نے انسان کا ظاہر کتنا اچھا بنایا! خوراک کتنی اچھی بنائی! سب کچھ اللہ نے اس انسان کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

مخلوقات کے جوڑے جوڑے:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾

پاک ہے وہ ذات جس نے سب چیزوں کے جوڑے بنائے ہیں، زمین سے اگنے والی چیزوں کے جوڑے، خود انسانوں کے جوڑے؛ مرد اور عورت اور ان چیزوں کے بھی جوڑے جن کو یہ نہیں جانتے!

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر جمادات میں جوڑے ہوں تو کیا بعید ہے؟ کیونکہ اللہ خود فرماتے ہیں: ﴿وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ﴾ کہ ان چیزوں میں بھی جوڑے ہیں جن کو انسان نہیں جانتے! تو ہو سکتا ہے کہ جمادات میں بھی جوڑے ہوں؛ نر اور مادہ لیکن ہمیں اس کا علم نہ ہو۔

اور ازواج کا ایک معنی ہوتا ہے جوڑا، مرد؛ عورت کے لیے زوج اور عورت مرد کے لیے زوج، دونوں پر زوج کا اطلاق ہوتا ہے، ﴿اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ یہ زوج کی جمع ہے۔ تو زوج دونوں جگہ پر بولا جاتا ہے اور کبھی زوج کا معنی نوع بھی ہوتا ہے۔

تو﴿خَلَقَ الْاَزْوَاجَ﴾ کا معنی ہو گا کہ ہم نے ہر چیز کی کئی قسمیں پیدا کی ہیں جیسے انگور ایک ہے اور اس کی قسمیں کئی ہیں، کیلا ایک ہے قسمیں کئی ہیں، سبزی ایک ہے قسمیں کئی ہیں، گوشت ایک ہے اس کی کئی اقسام ہیں، تو ہم نے کتنی انواع پیدا کی ہیں تمہارے لیے۔

اسی طرح خود انسانوں میں کیسی انواع ہیں، مرد کو دیکھو تو رنگ الگ ہے، عورت کو دیکھو تو رنگ الگ ہے، نام الگ ہے، علاقے الگ ہیں۔ یہ اللہ رب العزت نے زمین کی نشانی بیان فرمائی ہے۔

رات؛ قدرتِ حق کی نشانی:

﴿وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

زمین میں اصل ظلمت ہے اور کواکب، نجوم، شمس اور قمر کی وجہ سے اس میں روشنی عارضی ہوتی ہے اور جب وہ غروب ہو جاتے ہیں تو پھر زمین میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ ”سلخ“ کا معنی ہوتا ہے کھال اتارنا۔ تو اللہ رب العزت رات سے دن نکال لیتے ہیں اور دن سے پھر رات نکال لیتے ہیں۔ جس طرح زمین میں اصل میت؛ بنجر پن ہے، پانی سے سرسبز ہو جاتی ہے، جب پانی نہیں ہوتا تو پھر بنجر ہو جاتی ہے۔ آگے پھر نشانی بیان فرمائی:

سورج کا مستقر کیا ہے؟

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾﴾

آپ تھوڑا سا اور اوپر جائیں اور دیکھیں سورج اپنے مستقر پر چلتا ہے، مستقر

یہ ظرف زمان بھی ہو سکتا ہے اور ظرف مکان بھی۔ ظرف زمان کا معنی کہ سورج چلتا رہتا ہے اپنے استقرار کی جگہ تک کے لیے یعنی چلتے... چلتے... چلتے... ایک وقت آئے گا کہ جہاں پر اس نے ٹھہرنا ہے، وہاں پہنچ کر ٹھہر جائے گا اور اس سے مراد قیامت ہے۔ تو مستقر سے مراد اس کے رکنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ مستقر سے مراد رکنے کا زمانہ ہے۔ سورۃ الزمر میں ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ [8]

کہ ہر سیارہ یا سیارچہ ایک وقت مقرر کی حد تک اپنے مدار میں چلتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقر سے مراد استقرار زمانی ہے کہ سورج چلتا رہے گا اپنے رکنے کے زمانے تک۔

یا مستقر سے مراد مکان ہے کہ سورج چلتا ہے اور رکنے کی جگہ پر ٹھہرتا ہے اور پھر چل پڑتا ہے۔ اب اس سے مراد کیا ہے؟ حدیث پاک میں ہے کہ سورج روزانہ تحت العرش سجدہ کرتا ہے، پھر اللہ سے اجازت مانگتا ہے، اجازت ملتی ہے تو پھر چلتا ہے اور قیامت تک یوں ہی ہو گا۔ جس دن قیامت قائم ہو گی سورج غروب کے بعد سجدہ کرے گا پھر اجازت مانگے گا تو اس کو آگے چلنے کی اجازت نہیں ملے گی اور اس کو حکم ہو گا کہ مغرب کی طرف واپس چلے جاؤ اور پھر وہاں سے طلوع ہو! جب وہاں سے طلوع ہو جائے گا تو اب قیامت شروع ہو جائے گی، توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

یہاں اگر مستقر سے مراد زمان ہو تو اس پر کوئی اشکال نہیں اور اگر مستقر سے مراد مکان ہو تحت العرش تو اس پر اشکالات ہیں فن فلکیات کی وجہ سے بھی اور

8۔ الزمر 5:39

مشاہدات کی وجہ سے بھی۔ ایک اشکال تو یہ ہے کہ سورج ایک ملک میں غروب ہوتا ہے اور دوسرے ملک میں طلوع ہوتا ہے، اس کا طلوع اور غروب مسلسل چل رہا ہے اس میں ٹھہراؤ تو نہیں ہے اور جب مستقر کا معنی ہے کہ سورج غروب کے بعد عرش کے نیچے رکتا ہے پھر سجدہ کرتا ہے پھر اجازت لیتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ عرش کے نیچے ٹھہرتا ہے جبکہ فلکیات اور مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مسلسل حرکت ہے، اس میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔

سورج کے سجدہ کرنے کا معنی:

دوسرا سوال یہ ہے اللہ تعالیٰ کے عرش کی جو کیفیت قرآن و سنت سے سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر محیط ہے، یہ زمین، تمام آسمان، نجوم و کواکب جو بھی ہیں عرش نے ان سب چیزوں کو اپنے اندر لیا ہوا ہے، اس لحاظ سے سورج تو ہمیشہ ہر حال اور ہر وقت عرش کے نیچے ہے تو پھر غروب کے بعد تحت العرش جانے کا کیا مطلب ہو گا؟

جوابات کئی لوگوں نے دیے ہیں۔ بہترین جواب وہ ہے جو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نوّر اللہ مرقدہ نے دیا ہے۔[9] حضرت کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم سجدہ کا معنی وہ سمجھے ہیں جو سجدہ ہم کرتے ہیں کہ آدمی رک جائے، سکون اختیار کرے اور پیشانی زمین پر رکھ دے، یہاں جو حدیث پاک میں ہے کہ سورج عرش کے نیچے آ کر سجدہ کرتا ہے تو اس سے مراد عرفی سجدہ نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ سورج کا طلوع و غروب ہونا یہ اللہ کے حکم کا پابند ہے، اس کی حرکت اللہ کے فرمان اور حکم کی پابند ہے اسی کو سجدہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر چیز کا سجدہ اس کی شان کے موافق ہوتا

9۔ رسالہ سجود الشمس از علامہ عثمانی

ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ﴾[10] دنیا میں ہر چیز کو اللہ نے حکم دیا ہے نماز اور تسبیح کا اور ہر چیز کی تسبیح اور صلوٰۃ اس کی شان کے موافق ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو سمجھتا ہے۔

سورج کے سجدے کا معنی یہ ہے کہ سورج ہر وقت اللہ کے حکم کے تابع ہے، ہر غروب کے بعد طلوع اپنی مرضی سے نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے حکم سے ہے اور جیسے اللہ کا حکم ہے ویسے وہ چل رہا ہے۔ تو سجدے کا معنی یہ ہے کہ جس طرح سجدہ کر کے بندہ اپنے آپ کو اللہ رب العزت کے حوالے کرتا ہے بالکل اسی طرح سورج نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے تحت العرش کیا ہوا ہے اور خدا کے حکم کے مطابق چل رہا ہے۔

چاند؛ قدرتِ حق کی ایک عظیم نشانی:

﴿وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿٣٩﴾﴾

اور چاند کو دیکھو اللہ کی نشانی ہے، ہم نے چاند کی بھی منزلیں متعین کی ہیں، یہاں تک کہ کم ہوتے ہوتے ایک وقت آتا ہے کہ ایسا ہو جاتا ہے جس طرح کھجور کی پرانی ٹہنی ہوتی ہے۔ تو چاند ایسا باریک سا ہوتا ہے۔ چاند ایک مہینے میں اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ یہ روزانہ غروب ہوتا ہے، جہاں غروب ہوتا ہے وہ اس کی منزلیں ہیں، تیس یا انتیس ہیں ایک مہینہ میں، پھر ایک رات ایسی بھی آتی ہے کہ اس میں چاند نظر نہیں آتا، اس لیے بعض حضرات چاند کی اٹھائیس منزلیں کہہ دیتے ہیں۔

سورج اور چاند کا مرتب نظام:

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ

10۔ النور 41:24

﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾

سورج چاند سے آگے نہیں نکل سکتا اور رات دن سے آگے نہیں نکل سکتی۔ رات نے اپنے وقت پر آنا ہے، دن نے اپنے وقت پر آنا ہے، سورج نے اپنے وقت پر آنا ہے اور چاند نے اپنے وقت پر آنا ہے۔

اللہ رب العزت انبیاء علیہم السلام کو انسانوں کی طرف مبعوث فرماتے ہیں، انسانوں میں تھوڑی عقل والے بھی ہوتے ہیں اور زیادہ عقل والے بھی ہوتے ہیں اور پیغمبر کی مبارک عادت ہوتی ہے کہ وہ ایسی علمی موشگافیاں اور فنی باتیں نہیں کرتے جو عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوں، پیغمبر ایسی باتیں کرتا ہے جو عوام کے لیے سمجھنا بہت آسان ہو۔ جیسے قرآن کریم میں ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ﴾[11] کہ انہوں نے پوچھا کہ چاند کیا ہے؟ اللہ نے جواب دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ﴾ میرے پیغمبر! ان کو جواب دیجیے کہ اس سے حج کا پتا چلتا ہے، حج کے علاوہ اور احکامات کا پتا چلتا ہے۔ اب دیکھو اللہ نے ہمارے احکاماتِ حج، روزہ، عیدین، زکوٰۃ، عورتوں کی عدت کے مسائل ان سب کو چاند سے جوڑ دیا اور یہ کتنا آسان سا حساب ہے!

پھر چاند نکل آیا ہے تو اب اس کی علامت کیا ہے؟ فرمایا کہ دو گواہ ہوں یا تم خود دیکھ لو، یہ بہت آسان ہے۔ اس کے لیے کسی سائنس اور علم کی ضرورت نہیں ہے۔ تو احکامِ شریعت کو چاند سے جوڑ دیا اور چاند کے دیکھنے کو شہادت سے جوڑ دیا۔ اب اس کے لیے کون سا فن چاہیے؟! اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے کیسا سادہ سا نظام دیتے ہیں جو ہر بندے کی سمجھ میں آجاتا ہے۔

11۔ البقرۃ 189:2

کشتیاں؛ اللہ کی نشانیاں

﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾﴾

اللہ نے ایک اور نشانی کا ذکر فرمایا۔ فرمایا: ان کے لیے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو کشتیوں پر سوار کیا- یہاں ”اَنَّا حَمَلْنٰهُمْ“ نہیں فرمایا بلکہ ﴿اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ فرمایا حالانکہ یہ خود بھی تو سوار ہوتے ہیں تو اللہ نے صرف ان کی اولاد کی بات کیوں کی ہے؟ یہ بات سمجھانے کے لیے کہ بسا اوقات اولاد تو ہوتی ہے لیکن بندہ ایک جگہ پر رہتا ہے اور دوسری جگہ سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو خود نہیں جانا چاہتا بلکہ اس کی اولاد جانا چاہتی ہے۔ تو فرمایا کہ ہم نے اس کی اولاد کے لیے کشتیاں بنا دی ہیں کہ کشتیوں پر بیٹھیں، اپنی ضرورت پوری کریں اور واپس آ جائیں۔ تو بندے کی جگہ بھی نہیں بدلتی اور ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں۔

﴿وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾

اور صرف کشتیاں ہی نہیں بلکہ ہم نے کشتی کے مثل اور بھی بہت سی چیزیں بنائی ہیں جس پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ اس سے مراد اونٹ ہے۔ ایک ہے سفینۃ البر خشکی کا جہاز مراد اونٹ ہے اور ایک ہے سفینۃ البحر پانی کا جہاز مراد کشتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ہم نے ان جیسی چیزیں ان کو اور بھی دی ہیں جس پر یہ سواریاں کرتے ہیں۔ اللہ سب کو ان سواریوں کی نعمت عطا فرمائے۔ آمین

سمندری نظام:

جب تک آپ کشتی یا بحری جہازوں پر سفر نہ کریں تو یقین کریں کہ اس وقت تک ان جیسی آیات کا مفہوم کھلتا نہیں ہے اور بندے کو سمجھ نہیں آتا کہ اللہ پاک کا یہ کیسا نظام ہے؟ اتنے بڑے بڑے جہاز کہ آپ کے تصور سے بھی ماوراء ہیں! ایک جہاز

جاتا ہے اس پر بیس ہزار کنٹینر ہوتے ہیں اور ایک کنٹینر میں کئی ٹن وزن ہوتا ہے، یہ جو ہمارا گاؤں ہے یہ چھوٹا ہے، اس گاؤں سے بھی بڑے جہاز ہوتے ہیں اور پانی پر تیر رہے ہوتے ہیں۔ بحری بیڑوں پر جنگی ہوائی جہازوں کے اڈے بنائے ہوئے ہوتے ہیں، اسی سے اڑتے ہیں اور اسی پر اترتے ہیں۔ اندازہ کریں وہ بحری بیڑا کتنا بڑا ہو گا؟ ایک جہاز جاتا ہے جس پر پانچ پانچ ہزار بندے سوار ہوتے ہیں، دو دو مہینے کا سفر ہوتا ہے، اس میں ان کی خوراک کی جگہ بھی ہے۔ ان کے غسل کی جگہ بھی ہے، ان کے پانی پینے کا انتظام بھی ہے اور اس کے علاوہ فٹ بال کھیلنے کے لیے گراؤنڈ بھی بنایا ہوتا ہے، یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، نہانے کے لیے جہاز پر سوئمنگ پول ہوتے ہیں۔ کیسا عجیب خدا کا نظام ہے؟ مجھے تو ان کے نام نہیں آتے۔ سفر تو میں کرتا ہوں۔ میں کئی بار ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ تمہیں نام آتے ہیں لیکن تمہارے پاس یہ نعمتیں نہیں ہیں اور ہمیں نام نہیں آتے لیکن وہ نعمتیں مل جاتی ہیں۔

یہاں موٹر سائیکل پر چڑھتے ہیں اور سڑک پر دوڑاتے ہیں، اب سمندر پر چلنے کے لیے موٹر سائیکل بنے ہوئے ہیں، ایسے ترتیب سے بنے ہیں کہ بس بیٹھیں اور چلا دیں، بہت رفتار سے دوڑتے ہیں اور میں نے خود دوڑائے ہیں، ان کے سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، بس چابی لگاؤ ریس دو اور چل پڑو! پھر اس کا نظام ایسا بنایا ہے کہ آپ جتنا بھی تیزی سے موڑیں وہ گرتا نہیں، پانی میں ڈوبنے کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ لائف جیکٹ پہنا دیتے ہیں اور مزید پیچھے امداد والے پہنچ جاتے ہیں جو بندے کو ڈوبنے نہیں دیتے۔ یہ اللہ کا عجیب نظام ہے۔

کفار کو انفاق کا حکم؟

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ﴾

جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ جو خدا نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں: اللہ چاہتے تو ان کو کھلا دیتے، ہمیں کیوں کہتے ہو کہ خرچ کرو۔ اس پر بظاہر اعتراض ہوتا ہے کہ کفار تو انفاق فی سبیل اللہ کے مکلف ہی نہیں ہیں تو انہیں مال خرچ کرنے کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ انفاق کا حکم تو ان کو ہونا چاہیے جو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے پابند ہوں!

اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کو جو انفاق کا حکم دیا جا رہا ہے یہ شریعت کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ مروت اور انسانی غیرت کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی مر رہا ہو تو ہم اس کو بچائیں گے کیونکہ ہم پابند ہیں، اگر نہیں بچائیں گے تو گناہ ہو گا۔ یہ ہم مسلمانوں کو اللہ کا حکم ہے اور کافر یہ تو نہیں سمجھتا کہ یہ اللہ کا حکم ہے لیکن مرنے والے کو بچانا انسانی ہمدردی ہے۔ تو انسانی ہمدردی میں کہا جاتا ہے کہ تمہیں خدا نے مال دیا ہے تو خرچ کیا کرو!

کافر یہ کہتے ہیں کہ اللہ چاہتا تو ان مساکین کو کھلاتا، ہم کیوں کھلائیں؟ تو اس کا آسان سا جواب یہ ہے کہ اللہ چاہتا تو تمہیں نہ دیتا، تمہیں بھی تو خدا نے دیا ہے تم نے کون سا اپنے پاس سے دینا ہے؟ اللہ کے دیے ہوئے میں سے تو دینا ہے، اور اللہ کا نظام جانور اور انسان کے لیے الگ ہے۔ جانور کو اللہ رزق بلاواسطہ دیتے ہیں اور انسان کو بالواسطہ دیتے ہیں۔ اگر انسان کو بلاواسطہ رزق ملتا تو انسانیت میں تمدن کا نظام ختم ہو جاتا۔ اس لیے بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ملتا ہے تو انسان میں تمدن کا نظام قائم رہتا ہے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں سمجھانے کے لیے۔ یہاں طلبہ پڑھ رہے ہیں، ہر طالب علم کو براہِ راست اللہ کھانا دیتا تو یہ مہتمم کو جوتے پر بھی نہ رکھتے، کہتے کہ ہم خود کھاتے ہیں، تمہارا ہمارے اوپر کیا احسان ہے؟ لیکن چونکہ اللہ رب العزت کھانا

مدرسے والوں کے واسطے سے دیتے ہیں تو مدرسے والے قانون بناتے ہیں کہ تم ایک ہفتہ لیٹ آؤ گے تو ہم بطورِ سزا تمہارا کھانا بند کر دیں گے تو اب یہ طالب علم وقت پر آئے گا کیونکہ کھانا بند ہو گا اور اگر کھانا براہِ راست وقت پر ملتا تو یہ مدرسے کی انتظامیہ کی کیسے مانتا؟ کہتا کہ لیٹ جائیں گے پھر بھی کھانا ملنا ہے تو پابندی کی ضرورت کیا ہے؟! اس لیے بالواسطہ ملتا ہے تاکہ نظم اور تمدن قائم رہے۔

اگر اللہ تعالیٰ ہر بندے کو براہِ راست رزق دیتے تو غریب اور امیر ختم ہو جاتا اور دنیا کا نظام ہی باقی نہ رہتا۔ اب امیر کے پاس پیسہ ہے اور غریب کے پاس ہنر ہے۔ وہ ہنر لگاتا ہے یہ پیسہ لگاتا ہے تو بلڈنگ تیار ہو جاتی ہے، وہ ہنر لگاتے ہیں امیر پیسہ لگاتا ہے تو کھانے پک جاتے ہیں، کپڑے تیار ہو جاتے ہیں، اللہ نے نظام ایسے بنایا ہے۔

نفخ صور اور قبروں سے نکلنا:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿٥١﴾﴾

اور جب صور میں پھونک دیا جائے گا- "الْاَجْدَاثِ" یہ جَدْث کی جمع ہے جس کا معنی قبر ہے- تو یہ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف تیزی سے دوڑیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ قبروں سے نکل کر تیزی سے دوڑیں گے۔ ایک اور آیت میں بھی اسی طرح ہے:

﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾[12]

کہ یہ قبر سے نکل کر دوڑیں گے

جبکہ ایک آیت میں ہے:

12۔ المعارج 43:70

﴿فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ ۝٦٨﴾[13]

یہ لوگ ہکے بکے کھڑے ہو کر دیکھتے رہیں گے۔

بظاہر ان آیتوں میں تعارض ہے لیکن حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جب قبروں سے اٹھیں گے تو مٹی جھاڑتے ہوئے ہکے بکے ہو کر کھڑے ہو جائیں گے کہ اب ہمارا کیا بنے گا؟ ہم کدھر جائیں؟ اور جب چیخ آئے گی اور ملائکہ دھکیلیں گے تو یہ محشر کی طرف دوڑیں گے۔ تو ﴿فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنظُرُونَ﴾ پہلی حالت ہے اور ﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا﴾ یہ آخری حالت ہے۔

﴿قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ۝٥٢﴾

کہیں گے کہ ہمیں اس سونے کی جگہ سے کس نے اٹھا دیا ہے؟ ان سے کہا جائے گا کہ یہ اللہ وہ کا وعدہ ہے جو تمہارے ساتھ تھا اور جو پیغمبروں نے سچی بات کی تھی یہ وہ ہے۔

نیند اور موت میں مناسبت:

قبر کو یہاں پر "مرقد" فرمایا سونے کی جگہ۔ اگر یہ آیت سمجھ میں آجائے تو پھر بندے کو موت بڑی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ حدیث پاک میں جس طرح نیند پر موت کا اطلاق ہوا ہے اس طرح موت پر نیند کا اطلاق بھی ہوا ہے۔ جب آدمی سونے لگتا ہے تو دعا پڑھتا ہے "اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَأَحْيٰى"[14] کہ اے اللہ! تیرے نام کے

13۔ الزمر 68:39

14۔ صحیح البخاری، رقم: 6314

ساتھ میں مرتا ہوں اور تیرے نام کے ساتھ زندہ ہوتا ہوں حالانکہ یہ سو رہا ہے تو اس کو تو یہ دعا پڑھنی چاہیے "اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ أَنَامُ وَأَسْتَيْقِظُ" کہ اللہ! تیرے نام کے ساتھ میں سوتا ہوں اور تیرے نام کے ساتھ اٹھتا ہوں... صبح جب اٹھتا ہے تو "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ"[15] پڑھتا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی دی ہے حالانکہ اسے کہنا چاہیے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَيْقَظَنَا بَعْدَ مَا أَنَامَنَا" کہ رات کو سلایا تھا اور اب اٹھا دیا۔ تو ان احادیث میں نیند پر موت کا لفظ آیا ہے۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ جب انسان کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہے۔ وہ اس میت سے سوال کرتے ہیں۔ ایک سوال یہ کرتے ہیں: "مَا كُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟" تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے؟ تو بندہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے۔ یہ ٹھیک جواب دے دیتا ہے تو قبر اس کے لیے وسیع کر دی جاتی ہے اور نور سے بھر دی جاتی ہے۔ پھر فرشتے اسے کہتے ہیں: "نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ" سو جا جس طرح پہلی رات کی دلہن سوتی ہے۔[16]

اب دیکھیں! موت ہے لیکن لفظ سونے کا لائے ہیں۔ تو جس طرح نیند پر موت کا لفظ آیا ہے اسی طرح حدیث میں موت پر نیند کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ موت سمجھ آتی ہے جب آدمی نیند سمجھ لے اور جب نیند سمجھ لے تو موت کا

15۔ صحیح البخاری، رقم: 6314

16۔ سنن الترمذی، رقم: 1071

سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

دیکھیں! آدمی سوتا ہے اور صبح اٹھ کر غسل خانے میں کھڑا ہوتا ہے۔ بھائی کیا ہوا؟ کہتا ہے کہ مجھ پر غسل واجب ہو گیا ہے، کیوں ہوا؟ اب یہ کہتا ہے کہ یار! مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے... فلاں لڑکی خواب میں آگئی تھی تو غسل واجب ہو گیا۔ اب کوئی بھی اس خواب دیکھنے والے کو جھوٹا نہیں کہتا کیونکہ یہ جو خواب میں عمل ہوا ہے یہ جسم کا نہیں بلکہ روح کا عمل ہے اور اس کے جو آثار ہیں وہ روح پر نہیں، روحانی عمل کے آثار جسم پر ہو رہے ہیں، کپڑے جسم نے پہنے ہیں روح نے نہیں، اب کپڑے ناپاک ہو گئے، بدن ناپاک ہو گیا، پھر یہ اپنے بدن اور کپڑوں کو دھو رہا ہے روح کو نہیں دھو رہا۔ اس کا معنی کہ نیند میں احوال براہِ راست روح پر آتے ہیں اور اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے۔ تو جب موت کو نیند فرمایا تو اس کا معنی یہ ہے کہ موت میں احوال براہِ راست روح پر آتے ہیں اور اس کا اثر جسم پر ہوتا ہے۔

چونکہ ہم اس دنیا میں ہیں اور سونے والا اس دنیا میں ہے تو روح کے احوال کی وجہ سے جو جسم پر آثار آئے ہم اس کو دیکھ رہے ہیں اور مان بھی رہے ہیں لیکن موت کے بعد احوال روح پر ہیں اور اس کے آثار جسم پر ہیں وہ ہمیں نظر نہیں آرہے لیکن مان پھر بھی رہے ہیں۔ وہ نظر کیوں نہیں آرہے؟ کیونکہ ان کے احوال اور آثار برزخ یعنی پردے میں ہیں، تو پردے کے نیچے والی چیز نظر نہیں آتی لیکن مانتے پھر بھی ہیں۔

آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں اور امی ساتھ ہوں اور امی نے پورا برقعہ پہنا ہو تو آپ ڈاکٹر صاحب سے کہتے ہیں: ڈاکٹر صاحب! یہ میری امی ہے، اسے چیک کریں۔ اب ڈاکٹر صاحب کو برقع تو نظر آرہا ہے لیکن اس میں امی نظر نہیں آرہی لیکن مان پھر بھی رہا ہے کہ آپ کی امی ہے یعنی جو پردے میں ہے وہ نظر نہیں آتا لیکن ہوتا ضرور

ہے، اسی طرح برزخ کا معاملہ ہے، اس میں جو احوال ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے لیکن ہوتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر کیوں مانتا ہے کہ پردے میں امی ہے اس لیے کہ وہ جب نبض چیک کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ امی ہے، جب وہ بخار چیک کرنے کے لیے منہ میں تھرمامیٹر رکھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ امی ہے، دھڑکن چیک کرنے کے لیے آلہ لگاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ امی ہے اور برزخ میں جو احوال ہیں ہم دیکھنا چاہیں تب بھی نہیں دیکھ سکتے لیکن مانتے پھر بھی ہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

نیند سمجھ آئے تو پھر موت سمجھ آتی ہے۔ آپ سوئے ہوئے ہیں آپ کے ساتھ ایک بندہ سویا ہے، وہ ڈر کے اٹھ جاتا ہے، آپ نے پوچھا کیا ہوا؟ کہتا ہے کہ مجھے سانپ نے ڈسا ہے یا مجھے کتے نے کاٹا ہے، اب اسے کوئی بھی نہیں کہتا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں! حالانکہ وہاں اس کے پاس کوئی سانپ نہیں ہوتا کوئی کتا نہیں ہوتا، آپ اس کو جھوٹا کیوں نہیں کہہ رہے کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جو سانپ اور کتا ہے یہ جسم کے ساتھ نہیں ہے بلکہ روح کے ساتھ ہے اور اس کے آثار جسم پر ظاہر ہو رہے ہیں، جسم گھبرا جاتا ہے، جسم ڈر جاتا ہے، بندے کا پسینہ چھوٹ جاتا ہے، پیاس لگ جاتی ہے۔ اب بالکل اسی طرح قبر والے بندے کو سانپ ڈس رہا ہوتا ہے، فرشتے گرز مار رہے ہوتے ہیں اور ہمیں پتا نہیں چلتا، کیوں پتا نہیں چلتا؟ اس لیے کہ وہ برزخ میں ہے۔

سونے والا دنیا میں ہے اس کی روح کے احوال کا بھی پتا نہیں چلتا اور مرنے والا برزخ میں ہے اس کے احوال کا بھی پتا نہیں چلتا لیکن یہ سونے والے کے احوال آپ کیوں مان رہے ہیں اس لیے کہ آپ ان احوال سے خود گزر رہے ہوتے ہیں اور برزخ والے کے احوال ہیں لیکن ہم ان سے گزرے نہیں ہیں مگر مانتے پھر بھی ہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اب احوال کے جو آثار اور نتائج ہیں دنیا میں وہ نظر آتے ہیں جسم پر اور موت کے بعد روح کے احوال اور اس کے جو

آثار ہیں وہ نظر نہیں آتے، مانتے پھر بھی ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اب دیکھو! ﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ ہمیں اس سونے کی جگہ سے کس نے اٹھایا؟ اور سورۃ الکہف میں ہے ﴿وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ﴾[17] اصحاب کہف کو تم سمجھ رہے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ رَقَدَ، يَرْقُدُ، رُقُوْدًا کا معنی سونا ہوتا ہے۔ آپ کوئی قبر دیکھ لو، منکرینِ حیات کے جو بانی ہیں ان کی قبر پر جاکر دیکھ لیں وہاں بھی مرقد لکھا ہوا ہے۔ سب مرقد مبارک لکھتے ہیں۔ ہر بندہ سمجھتا ہے کہ یہ مرقد یعنی سونے کی جگہ ہے۔ تو بتاؤ! سونے والا زندہ ہوتا ہے یا مردہ؟ زندہ، تو پھر وہ زندہ ہوئے یا مردہ؟ زندہ!

قبر کے سوالات امتی سے ہوں گے، نبی سے نہیں:

میں اگلی بات کہنے لگا ہوں۔ روح نکل جاتی ہے پھر لوٹتی ہے پھر تین سوال ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا تعلق امتی سے ہے ان کا نبی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نبی سے قبر میں سوالات نہیں ہوتے بلکہ یہ صرف امتی سے ہوتے ہیں۔ امتی جب جواب دیتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: ”نَم“ سو جا! نبی سے نہ سوال ہے نہ جواب اور نہ ہی سونے کا حکم ہے۔ تو امتی ایسے ہے جیسے سویا ہوا ہے اور نبی ایسے ہے جیسے جاگ رہا ہے۔ سونے والے کے سماع میں اختلاف ہوتا ہے کہ سنتا ہے یا نہیں لیکن جاگنے والے کے سماع میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اس لیے عام اموات کے سماع میں اختلاف ہے صحابہ کا کہ سنتے ہیں یا نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے سماع میں کسی کا اختلاف نہیں، پوری امت کا اتفاق ہے کہ وہ سنتے ہیں کیونکہ سونے اور جاگنے والے میں فرق ہوتا ہے۔

17۔ الکہف 18:18

ہمارے یہ حضرات بہت زور لگاتے ہیں کہ ''سویا مویاہِکو جیا'' [سونے اور مرنے والا ایک جیسا ہوتا ہے] میں نے کہا: اگر ''ہِکو جیا'' ہے یعنی ایک جیسا ہے تو ہم پھر بھی ماننے کے لیے تیار ہیں کہ سونے والا اور مرنے والا ایک جیسا ہے لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ جب آدمی سوئے اور چار بجے کا الارم لگادے، پھر الارم بجے اور بندہ اٹھ جائے تو سوال یہ ہے کہ اس نے سنا ہے پھر اٹھا ہے یا اٹھا ہے پھر سنا ہے؟ سنا ہے پھر اٹھا ہے نا، اس کا معنی یہ ہوا کہ سونے والا سنتا ہے۔

میں نے کہا: تمہارے مدارس میں جب طلبہ سوتے ہیں، تم ان کو نماز کے لیے اٹھاتے ہو تو وہ تمہاری آواز سن کر اٹھتے ہیں یا اٹھ کر آواز سنتے ہیں؟ کہا: جی سن کر اٹھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر اس کا معنی ہے کہ تم بھی مانتے ہو کہ سونے والا سنتا ہے اور ہم بھی مانتے ہیں کہ سونے والا سنتا ہے۔

دو موتوں اور دو حیاتوں کا صحیح مفہوم:

کہتے ہیں: جی قرآن میں ہے: ﴿اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ﴾[18] کہ دو موتیں اور دو حیاتیں ہیں، تو یہ قبر والی حیات کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ ﴿یٰوَیۡلَنَا مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا﴾ یہ بھی تو نص ہے، یہ قرآن تمہیں نظر نہیں آرہا کہ قیامت کو اٹھ کر کہے گا کہ ہمیں سونے کی جگہ سے کس نے اٹھایا ہے! قبر کی جگہ کو قرآن سونے کی جگہ کہتا ہے، یہ بھی تو آیت ہے نا! پھر آیات کے، معانی ایسے بیان کرو کہ آیات میں تعارض اور ٹکراؤ ختم ہو جائے۔

دو موتیں اور دو حیاتیں... اس میں بھی کوئی اشکال نہیں ہے۔ جب یہ آیت آئے گی تو پھر اس پر بات کریں گے۔ مختصراً سمجھ لیں کہ ایک ہوتی ہے کھلی حیات اور

18۔ المؤمن 11:40

ایک ہوتی ہے چھپی حیات، اسی طرح ایک ہوتی ہے کھلی موت اور ایک ہوتی ہے چھپی موت۔ ماں کے پیٹ میں موت ہے روح جو نہیں ہے، پھر روح آئی تو حیات آگئی ہے اور آدمی زندہ ہو گیا۔ پھر دنیا میں آنے کے بعد بندے پر موت آئی، یہ بندے پر دوسری موت ہے، ایک موت آچکی اور اب یہ دوسری موت ہے، اور ایک حیات قیامت کے دن ملے گی جو کھلی حیات ہو گی۔ اب قبر میں پھر حیات ملی ہے، یہ حیات کھلی ہے یا چھپی ہے؟ یہ چھپی حیات ہے۔ تو یہ جو کہتے ہیں کہ دو موتیں اور دو زندگیاں تو یہ دو موتیں اور دو زندگیاں وہ ہیں جو کھلی ہیں جو ہر بندہ دیکھتا ہے اور قبر کی حیات ہے لیکن چھپی ہے، اس لیے یہ نظر نہیں آتی۔ اس لیے اس پر اشکال نہیں کرنا چاہیے۔

"دلہن کی طرح سو جا!" پہ عجیب نکتہ:

﴿يَوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾

اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتہ کہتا ہے "نَمْ" سو جا! اور آگے اضافہ فرمایا: "كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ" کہ پہلی رات کی دلہن کی طرح سو جا! الفاظِ نبوت پہ غور کرنا! صرف یہ نہیں فرمایا کہ سو جا بلکہ دلہن کی طرح سو جا، یہ دلہن کا لفظ کیوں لائے؟ یہ بات سمجھانے کے لیے کہ کوئی لڑکی کسی لڑکے کو چاہتی ہے لیکن میسج نہیں کر سکتی خاندان کا مسئلہ ہے، قبیلہ ہے، بغاوت نہیں کر سکتی، اللہ سے بھی ڈرتی ہے، یہ گناہ ہے خوف کھاتی ہے لیکن یہی لڑکی کلمۂ نکاح کے ساتھ دلہن بن کر کمرے میں آ جائے تو جس خاندان کا ڈر تھا وہ باہر کھڑے ہیں، اب اس کو ڈر نہیں ہے، پہلے میسج اور فون کا ڈر تھا، اب بغل میں بغل ڈال کر سوئی ہے کوئی ڈر نہیں ہے، کیونکہ کلمۂ نکاح کے ساتھ آئی ہے۔ بالکل اسی طرح قبر ظلمت کا گھر ہے، کیڑوں کا گھر ہے، وحشت کا گھر ہے، عذاب کا گھر ہے اور جب بندہ کلمۂ ایمان کے ساتھ آ جائے تو اب کوئی ڈر نہیں ہے اور یہ بات دلہن کے لفظ کے بغیر سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔

میں اس لیے طلبہ سے کہتا ہوں کہ اس کو پہلے خود سمجھو پھر آگے سمجھاؤ! جب تم سمجھو گے نہیں تو عوام میں بیان کیسے کرو گے؟ تم نے پھر جھجکنا ہے، ڈرنا ہے، گھبرانا ہے کہ میں اس کا جواب کیا دوں گا! اس لیے اس کو خوب سمجھو!

پہلی رات دلہن سوتی بھی ہے؟

میں نے بتایا تھا کہ مجھے ایک جگہ سبق کے بعد طلبہ نے چٹ دی کہ استاد جی! پہلی رات دلہن سوتی بھی ہے؟ میں نے کہا کہ سوال تو آپ کا ٹھیک ہے۔ اس کا جواب ذہن میں رکھ لیں کہ جب اس قبر والے سے سوال ہوتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے، تیرا نبی کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ یہ جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، میرا دین اسلام ہے، تو اس کے ذمے جو کام تھا وہ پورا ہو گیا تو فرمایا کہ اب سو جا! اور دلہن کے ذمہ جو کام ہوتا ہے جب وہ پورا ہو جائے تو وہ بھی سو جاتی ہے اور ایسے سکون سے سوتی ہے کہ بس وہ دلہا جانتا ہے یا دلہن جانتی ہے!

جنت کی نعمتوں کا حال:

﴿اِنَّ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِىۡ شُغُلٍ فٰكِهُوۡنَ ۝٥٥ هُمۡ وَ اَزۡوَاجُهُمۡ فِىۡ ظِلٰلٍ عَلَى الۡاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوۡنَ ۝٥٦ لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ ۝٥٧﴾

جنت میں نہ نماز ہو گی، نہ روزہ ہو گا، نہ نیند ہو گی۔ پھر اللہ ان کی مشغولیت پھل بنا دیں گے، پھل شوق سے کھاؤ، بیوی کو دیکھیں گے اور بیوی کے ساتھ معانقہ کریں گے، ستر سال گزر جائیں گے سینہ سے سینہ لگا کر کھڑے ہیں، ہمبستری شروع کریں گے تو پانچ سو سال گزر جائیں گے۔ یہاں پانچ سو سال بڑی مدت ہے لیکن وہاں پانچ سو سال کوئی مدت نہیں ہو گی کیونکہ ابدی زندگی ہے۔ یہ خوشیاں تمہاری منتظر ہیں، اس دنیا کی غلاظت پر لعنت بھیج دو پھر دیکھو حلال خوشیوں میں مزا کتنا آتا ہے۔ اللہ

رب العزت نے ان نعمتوں کا تذکرہ کیوں کیا ہے؟ اس لیے کیا ہے کہ لوگوں کو سمجھاؤ، رغبت دلاؤ۔ ہم اس کو بیان کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے! اللہ نے قرآن میں بیان کیا ہے کہ ان کو سمجھاؤ، ان گندگیوں سے ان کی جان چھڑاؤ، پاکدامن عورتوں کی بات کرو۔ بیٹا! اِس لعنت سے بچو اُس حسن کو دیکھو، یہ سونا چھوڑو وہاں کے کنگن پہنو، یہ بات سمجھاؤ نوجوانوں کو، تم ایک سو کو سمجھاؤ گے تو دس تمہارے ساتھ چل پڑیں گے اور عفت اور پاکدامنی کی زندگی گزاریں گے! لیکن یہ ضروری ہے کہ سمجھانے والے پر حال طاری ہو صرف قال نہ ہو!

﴿إِنَّ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِىْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَ أَزْوَاجُهُمْ فِىْ ظِلٰلٍ عَلَى الْأَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿٥٦﴾﴾

سبحان اللہ! شوہر ہے اور ساتھ بیویاں ہیں، تکیے لگے ہوئے ہیں، سایہ بنا ہوا ہے اور گپ شپ کر رہے ہیں، اس گپ شپ پر اللہ بھی کتنے خوش ہو رہے ہوں گے!

اللہ کی قسم! میں تمہیں جنس کی دعوت نہیں دیتا، میں کہتا ہوں کہ جنت کی نعمتوں کو سوچو! ﴿لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّ لَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ﴾ وہاں ان کے لیے میوے ہوں گے اور ہر وہ چیز ملے گی جو وہ منگوائیں گے۔ یہاں "وَلَهُمْ مَّا يَسْئَلُوْنَ" نہیں فرمایا کہ جس چیز کا سوال کریں گے وہ انہیں ملے گی بلکہ ﴿وَّ لَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ﴾ فرمایا، یدّعون کا لفظ دعوت سے ہے، سوال سے جو چیز ملتی ہے اس کو دعوت نہیں کہتے بلکہ جو بغیر سوال کے ملے اس کو دعوت کہتے ہیں۔ اللہ لفظ "يَسْئَلُوْنَ" کے بجائے "يَدَّعُوْنَ" لائے ہیں۔ یہ جو پھل ہوں گے یہ جو بیویاں ہوں گی یہ جو تخت ہوں گے یہ خدا کی طرف سے تمہاری لیے دعوت ہو گی۔ ﴿مَّا يَدَّعُوْنَ﴾ کا معنی بعض نے کیا ہے کہ "جو وہ مانگیں گے"، لیکن ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ "جو وہ چاہیں گے"۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:
اللہ! ہم جنت اس وجہ سے نہیں مانگتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں، اس وجہ سے مانگتے ہیں کہ ہم جہنم کو برداشت نہیں کرسکتے، بس اللہ! ہمیں جنت عطا فرمادے۔

اللہ کی طرف سے سلام:

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾﴾

رب رحیم کی طرف سے سلام کہا جائے گا۔

دنیا میں اگر ہمیں کوئی کہے کہ آپ کو فلاں بزرگ کی طرف سے سلام آیا ہے، آپ کو فلاں صاحب نے سلام کہا ہے تو بندے کو خوشی ہوتی ہے، لیکن جنت میں جب اللہ سلام کریں گے تو بندے پر کیا کیفیت طاری ہوگی کہ اللہ نے مجھے سلام کیا ہے، کتنا مزہ آئے گا؟ ہماری درس گاہ میں کوئی بزرگ آئیں اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہیں، ہمیں سلام کریں تو دل خوش ہو جاتا ہے اور جنت میں اللہ سلام کریں گے تو جنت کا کیسا پیارا منظر ہوگا؟

مجرمو! الگ ہو جاؤ!

﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾

ساتھ یہ بھی اعلان ہوگا کہ جو مجرم ہیں وہ الگ ہو جائیں۔ حشر میں مجرم الگ ہو جائیں، غیر مجرم الگ ہو جائیں۔ اللہ ہمیں ان مجرموں میں سے نہ بنائیں۔ آمین

قیامت کے دن زبان پر مہر لگنے کا مطلب:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾﴾

آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے، ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان

کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کرتے تھے؟!۔ اللہ ہمیں اس منظر سے بچائے، اللہ میری اور آپ سب کی حفاظت فرمائے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ پر مہر لگائی جائی گی اور ہاتھ پاؤں بولیں گے حالانکہ قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ پر ہے:

﴿يَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾[19]

ان کے خلاف قیامت کے دن ان کی زبان بھی بولے گی، ہاتھ بھی بولیں گے اور پاؤں بھی گواہی دیں گے کہ وہ کیا عمل کرتے تھے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان پر مہر لگے گی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان بولے گی۔ تو بظاہر دونوں آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ مہر لگانے کا معنی یہ نہیں ہے کہ منہ کو بند کر دیا جائے گا اور زبان بول نہیں سکے گی بلکہ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ منہ کو پابند کیا جائے گا کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں بولے گا بلکہ وہ بولے گا جو خدا چاہے گا۔ اب زبان بولے گی کہ میں نے گناہ کیا تھا۔ یہ معنی ہے مہر لگانے کا۔

حضور علیہ السلام کو شعر کی تعلیم نہیں دی گئی:

﴿وَ مَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَ مَا يَنۡۢبَغِيۡ لَهٗ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنۡذِرَ مَنۡ كَانَ حَيًّا وَّ يَحِقَّ الۡقَوۡلُ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۷۰﴾﴾

ہم نے پیغمبر کو شعر کا علم نہیں دیا اور نہ ہی شاعری پیغمبر کی شان کے لائق

19۔ النور 24:24

ہے، یہ تو نصیحت کی بات ہے اور نہایت واضح قرآن ہے تا کہ آپ ڈرائیں اس کو جو زندہ ہے، -"حَيًّا" سے مراد جس کا دل زندہ ہے ورنہ زندہ تو سارے ہی ہوتے ہیں- اور کافروں پر یہ بات ثابت ہو جائے کہ پیغمبر نے سنایا تھا!

میں پہلے بھی یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ یہاں اشکال یہ ہے کہ کفار پیغمبر پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ شاعر ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو شعر سکھایا ہی نہیں تو سوال یہ ہے کہ کفار نے کیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہا اور کیسے اس قرآن کو شعر کہتے تھے کہ یہ شاعر کی باتیں ہیں؟! بلکہ حدیث پاک میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن طرفہ کا شعر پڑھا۔ شعر یہ ہے:

سَتُبْدِیْ لَكَ الْاَيَّامُ مَا كُنْتَ جَاهِلًا
وَيَأْتِيْكَ بِالْاَخْبَارِ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ

یعنی جن باتوں کا تم کو علم نہیں ہے وقت آنے پر تمہیں سمجھ آ جائے گی اور تمہارے پاس وہ بندہ خبر لائے گا جس کو تم نے خبر لانے کے لیے مقرر نہیں کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر پڑھا تو آپ نے یوں پڑھا:

سَتُبْدِیْ لَكَ الْاَيَّامُ مَا كُنْتَ جَاهِلًا
وَيَأْتِيْكَ مَنْ لَّمْ تُزَوِّدِ بِالْاَخْبَارِ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: حضور! یہ شعر ایسے نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور شاعری میرے مناسب بھی نہیں ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ پھر کفار کیسے کہتے رہے کہ یہ شاعر ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں شبہ اس لیے ہوا کہ کفار جو کہتے تھے کہ یہ شاعر ہیں اور یہ قرآن شاعر کی باتیں ہیں اس سے ہم یہ سمجھے کہ شاعر کہتے ہیں مسجّع اور مقفّٰی کلام کہنے والے کو حالانکہ

وہاں شاعر کا معنی صرف یہ نہیں ہے، لغتِ عرب میں شعر کا ایک معنی ہوتا ہے ایسی بات جو فرضی ہو، خیالی ہو اور غیر تحقیقی ہو اور شاعر کہتے تھے جو خیالی اور فرضی باتیں کرے۔ تو عرب کے اس ماحول میں شاعر کا معنی یہ ہے کہ یہ خیالی باتیں کرتا ہے، فرضی باتیں کرتا ہے -العیاذ باللہ- من گھڑت باتیں کرتا ہے جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ﴾ کا ترجمہ یہ کیا ہے ”ہم نے آپ کو شاعری یعنی خیالی مضامین مرتب کرنے کا علم نہیں دیا۔“ [20] دیکھیں! بیان القران سے سب اشکال ختم ہوگئے اور میں پھر آپ سے کہتا ہوں یہ مسئلہ درسگاہ میں آپ نے سمجھا ہوگا تو بیان القرآن سمجھ میں آئے گا ورنہ آپ کو بیان القرآن پر بھی اشکال ہو جاتا ہے کہ حضرت تھانوی نے ترجمہ ٹھیک نہیں کیا!

عاص بن وائل کی حماقت:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾﴾

سورۃ یٰسٓ کی یہ آخری پانچ آیات ایک واقعہ میں نازل ہوئیں۔ مکہ مکرمہ میں عاص بن وائل ایک مشرک تھا۔ اس نے ایک بوسیدہ ہڈی لی، اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ پھر اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیا قیامت کے دن اللہ اس کو زندہ کرے گا جس کا یہ حال ہو رہا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، اللہ تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا اور پھر جہنم رسید کرے گا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾﴾

20۔ بیان القرآن: ج3 ص242

کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے ایک نطفے سے بنایا ہے، پھر وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے لگتا ہے، ﴿وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا﴾ اور یہ ہمارے بارے میں مثالیں بیان کرنے لگا- ہڈیاں اٹھا اٹھا کر مثالیں دیتا پھرتا ہے- ﴿وَّ نَسِیَ خَلْقَهٗ﴾ اور اپنی پیدائش کو بھول گیا ہے، ﴿قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ هِیَ رَمِیْمٌ﴾ اور پھر کہتا ہے کہ ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ جب یہ بوسیدہ ہوں گی، آپ فرمائیں ﴿یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ جس خدا نے پہلے پیدا کیا ہے وہی دوبارہ پیدا کرے گا، ﴿وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُۙ ﴿۷۹﴾﴾ اور اس کو پتا ہے کہ میں نے کس کو کیسے پیدا کرنا ہے! ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾﴾ وہی ہے جس نے سبز درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دی ہے جس سے تم آگ جلا لیتے ہو۔

عرب میں دو درخت تھے، ایک کا نام تھا مرخ" اور ایک کا نام تھا عفار، دونوں کی سبز ٹہنیاں ہوتیں، ٹہنی پر ٹہنی مارتے تو آگ جلتی۔ اللہ فرماتے ہیں تم دیکھتے ہو کہ سبز درخت ہے اور اس سے آگ جلتی ہے، تم اس کو سلگاتے ہو ماچس کی طرح اور تم بعثت کا انکار کرتے ہو، بتاؤ سبز درخت اور آگ میں کیا جوڑ ہے؟ وہ اللہ جو سبز درختوں سے آگ کو پیدا کرتا ہے اس کے لیے بوسیدہ ہڈی سے دوبارہ پیدا کام کرنا کیا مشکل ہے؟ ﴿اَوَ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؔ بَلٰی ۗ وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ﴿۸۱﴾﴾ کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں کہ ان جیسا دوبارہ پیدا کر دے؟ کیوں نہیں! وہ بڑا پیدا کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے، ﴿اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۸۲﴾﴾ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے کہ

ہو جا، وہ چیز ہو جاتی ہے۔

جنت چھوٹی خدائی کا نام ہے:

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جنت چھوٹی خدائی کا نام ہے کیونکہ ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾﴾[21] جنت میں جو چاہو گے وہ ملے گا، جو بولو گے وہ ملے گا، اور خدائی کیا ہے؟ ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ جنت کو چھوٹی خدائی کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ اس میں یہ سارے اختیارات اللہ کی طرف سے ہیں، اللہ چاہیں تو دے دیں چاہیں تو چھین لیں، یہ بڑی خدائی تو نہیں ہے، تو فرمایا کہ چھوٹی خدائی اللہ دے گا۔

اور یہ حکمت سمجھنا! دنیا میں بندہ وہ کرے جو اللہ چاہتا ہے تو جنت میں وہ ہو گا جو بندہ چاہے گا!

”کُنْ فَيَكُونُ“ کا معنیٰ:

﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾﴾

اس کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو فرماتا ہے کہ ہو جا، وہ چیز ہو جاتی ہے۔ اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ اگر اللہ کے ”کُنْ“ فرمانے سے چیز ہو جاتی ہے تو پھر بچہ نو ماہ بعد کیوں پیدا ہوتا ہے، فوراً کیوں نہیں پیدا ہوتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ یہ جو فرماتے ہیں ”کُنْ“ کہ ہو جا، تو کتنے وقت میں ہو جا؟ یہ مقدر ہوتا ہے، یہ ہمارے علم میں نہیں بلکہ اللہ کے علم میں ہے، پھر ”فَيَكُونُ“ میں وہ وقت مخفی ہوتا ہے جو اللہ نے ”کُنْ“ کے اندر مقدر رکھا ہے۔ مثلاً

21۔ حٰم السجدۃ 31:41

میں کہتا ہوں کہ پانی لاؤ! اب اس کا کیا معنی ہے کہ ایک سیکنڈ میں لاؤ؟ مجھے پتا ہے کہ "پانی لاؤ!" کا معنی ہے کہ اتنی دیر میں لاؤ! تو پانی لاؤ میں وہ وقت مخفی ہوتا ہے کہ یہ اتنی ہی دیر میں لائے گا۔ ہم کہتے ہیں: بھائی دکان سے مٹھائی لاؤ! اب اس کا معنی یہ نہیں کہ فوراً حاضر کرو بلکہ اس کا معنی ہے کہ جاؤ اور لاؤ! اور کتنا وقت لگنا ہے؟ یہ لفظ "لاؤ" میں موجود ہے۔ تو اللہ جب بچے کی پیدائش کا حکم دیتے ہیں تو "کن" فرماتے ہیں کہ ہو جا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ نو ماہ میں ہو جا، یہ نو ماہ میں ہو جا کا حکم مخفی ہے **فیکون** کہیں تو نو ماہ خود بخود آ جاتے ہیں۔

﴿فَسُبۡحٰنَ الَّذِیۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾﴾

پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور تم سب نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ الصّٰفّٰت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰـہَکُمۡ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا وَ رَبُّ الۡمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾﴾

فرشتوں کی قسمیں:

اللہ رب العزت نے ابتداءً تین قسمیں کھائی ہیں۔ قسم ہے ان فرشتوں کی جو صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں -یعنی شیاطین جب عالمِ بالا کی طرف جانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ فرشتے ان کو روکتے ہیں- اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو تلاوت کرتے ہیں ذکر کی۔

قسمیں کھانے کی وجہ:

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے ملائکہ اور فرشتوں کی قسمیں کھائی ہیں کہ "وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا"... ملائکہ مخلوق ہیں، خالق نہیں ہیں، مخلوق کی قسم کھانا جائز نہیں ہے تو پھر اللہ رب العزت نے ان کی قسم کیوں اٹھائی ہے؟

اس کا آسان جواب یہ ہے: ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾[22] احکام کے مکلف بندے ہیں اللہ نہیں ہے، کس کی قسم کھانی ہے اور کس کی نہیں کھانی ان احکامات کے بندے پابند ہیں اللہ نہیں، اللہ تعالیٰ جو چاہیں انہیں کوئی نہیں پوچھ سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ مخلوقات میں سے جس مخلوق کی قسم کھاتے ہیں اس کی خاص وجہ ہوتی ہے، بسا اوقات اس مخلوق کی عظمت بتانا مقصود ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾[23]

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کی قسم کھائی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بتانے کے لیے۔ اسی طرح بسا اوقات کسی چیز کی قسم کھائی جاتی ہے اس کے فوائد بتانے کے لیے جیسے ﴿وَ التِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ ۙ﴿۱﴾ وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ﴿۲﴾﴾[24] تو کسی بھی جگہ قسم کھانے کی خاص وجہ ہوتی ہے۔

یہاں ملائکہ کی قسم کیوں کھائی ہے؟ اس لیے کہ مشرکینِ مکہ میں سے ایک خاص طبقہ تھا جو ملائکہ کی عبادت کرتا تھا۔ تو اللہ نے ملائکہ کی قسم کھائی ہے کہ جس کی تم عبادت کرتے ہو یہ تو خود عابدین ہیں، عبادت کرتے ہیں تو عابد کو معبود بنانے کا کیا معنی ہے؟! اس لیے یہاں ملائکہ کی قسمیں کھائی ہیں۔

نظم وضبط کی اہمیت:

آپ کو یاد ہو گا میں حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ ذکر کر چکا ہوں ﴿اَنِ

22۔ الانبیاء 23:21

23۔ الحجر 72:15

24۔ التین 2،1:95

﴿اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ﴾[25] کے تحت کہ حضرت داؤد علیہ السلام ایک خاص انداز سے خَود کی کڑیاں بناتے تھے، چھوٹی بڑی نہیں بلکہ ترتیب سے... اس سے ثابت ہوا کہ شریعت میں نظم پسندیدہ ہے۔ اب یہاں فرمایا: ﴿وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا﴾ صف بندی کے ساتھ عبادت کرنا یہ نظم ہے۔ تو اللہ رب العزت کو نظم پسند ہے، اس لیے بے نظمی کبھی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، یہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی لکھی ہے۔ اگر ملائکہ عبادت اس طرح کریں کہ دو کہیں ہوں، چار کہیں ہوں، پانچ کہیں ہوں، دس کہیں ہوں عبادت ہو تو سکتی ہے لیکن نظم وضبط کے بغیر ہو گی، اس لیے ملائکہ سے بھی صف بندی کے اہتمام کے ساتھ عبادت مطلوب ہے۔[26]

اور ایک حدیث مبارک میں بھی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ملائکہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو صف باندھ کر کرتے ہیں، صف میں قریب قریب کھڑے ہوتے ہیں۔[27]

تو ہمیں بھی حکم ہے کہ نماز میں صف سیدھی رکھیں، قریب قریب کھڑے ہوں، اس کا بہت زیادہ خیال کریں۔ جب عبادات میں نظم مطلوب ہے تو بتائیں باقی معاملات میں کیسے نہیں ہو گا؟ اس لیے نظم کا مزاج بنائیں۔

اللہ کی بادشاہت کا بیان:

﴿اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝۴ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ

25۔ سبا 11:34

26۔ معارف القرآن: ج7 ص417

27۔ صحیح مسلم، رقم: 430

رَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿۵﴾

قسمیں کھانے کے بعد فرمایا: تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے جو آسمانوں کا بھی رب ہے اور زمین کا بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کا بھی رب ہے اور مشرقوں کا بھی رب ہے۔ سورج ہر روز ایک نئی جگہ سے نکلتا ہے، طلوع ہونے کی جگہ کو مشرق کہتے ہیں، چونکہ سورج سال بھر میں ہر دن ایک نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے اس لیے فرمایا کہ ﴿رَبُّ الْمَشَارِقِ﴾ اللہ مشارق کے رب ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ مشرقین اور مغربین کے بھی رب ہیں۔

ستارے؛ زینت اور حفاظت کا ذریعہ:

﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ ﴿۶﴾ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ﴿۷﴾

ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کے ساتھ مزین کیا اور ہر سرکش شیطان سے اس کی حفاظت کی۔

یہاں ملائکہ کے تذکرے کے بعد شیاطین کی بات کی ہے اور بطورِ خاص کواکب کی بات کی ہے کہ جنات کو جب یہ کواکب لگتے ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ پہلے شیاطین اوپر جا کر عالمِ بالا کی خبریں سنتے تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان کو آسمان پر جانے سے روک دیا گیا۔ اگر یہ کوشش بھی کرتے ہیں تو شہابِ ثاقب کے لگنے سے دوڑ جاتے ہیں اور اوپر تک نہیں جاسکتے، اگر وہ باتیں سننا بھی چاہیں تب بھی نہیں سن سکتے۔

جنتیوں کا رزق یقینی اور دائمی ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِيْ

جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٤٣﴾ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿٤٤﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن کا رزق مقرر کر دیا گیا ہے، میووں کے ذریعے ان کا اکرام کیا جائے گا، نعمتوں والے باغات میں، تخت لگا کر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

جنتیوں کو رزقِ معلوم ملے گا جو یقینی اور دائمی ہے، ﴿رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ اس لیے فرمایا کہ جنت کے رزق میں ہلکا سا بھی شبہ نہیں کہ شاید ملے یا نہ ملے بلکہ یقیناً اور دائماً ملے گا۔ دنیا کی طرح نہیں کہ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ کل مجھے کیا اور کتنا رزق ملنے والا ہے؟ اور فرمایا کہ اس میں "فَوَاكِهُ" ہوں گے۔ فواکہ یہ فاکہہ کی جمع ہے، یہ پھل لذت کے لیے ہوں گے خوراک کے لیے نہیں، جنت میں جتنی غذائیں دی جائیں گی وہ سب لذت کے لیے ہوں گی بھوک ختم کرنے کے لیے نہیں ہوں گی کیونکہ انسان کو جنت میں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہو گی۔ یہ نہیں ہو گا کہ کھانا نہیں کھائیں گے تو بھوک لگے گی، کھانا نہیں کھائیں گے تو کمزور ہو جائیں گے، کھانا کھائیں گے تو طاقت آ جائے گی، نہیں بلکہ وہاں صرف لذت اور مزے کے لیے کھائیں گے، اپنے شوق کے لیے جو چیز کھانا چاہیں گے وہ کھائیں گے۔

﴿عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ﴾ ... جنتی تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے اور گپ شپ لگائیں گے۔ اس کا ایک معنی تو بعضوں نے یہ کیا ہے کہ جن تختوں پر جنتی ہوں گے وہ تخت گھومیں گے، جس سے بات کرنی ہو گی اسی کی طرف گھوم کر اس کے سامنے آتے رہیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے سامنے اس طرح ہوں گے جس طرح مجلس والے حلقہ بنا کے بیٹھتے ہیں کسی کو دوسرے کی طرف پشت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، کوئی دور بھی بیٹھا ہو گا تو نگاہ اتنی تیز ہو گی کہ دور بیٹھنے والا بھی بہت قریب محسوس ہو گا، ایسا نہیں ہو گا کہ ایک شخص بہت دور بیٹھا ہو تو نظر نہ آئے۔

حورانِ بہشت کا تذکرہ:

﴿وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾﴾

اللہ جنت میں جو حوریں دیں گے ان کی ایک صفت یہ بیان کی کہ ان کی نگاہ نیچی ہو گی، اپنے شوہر کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھیں گی اور ان کو اپنا شوہر اتنا خوب صورت لگے گا کہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کی طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت بھی نہیں ہو گی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ﴿قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نگاہوں کو جھکا دیں گی یعنی ان کے شوہر ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھیں گے، اتنا پاک ماحول ہو گا۔

جنتی اور اس کے کافر ساتھی کا مکالمہ:

﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾

یہاں ایک جنتی کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کا دنیا میں ایک ساتھی تھا جو کافر تھا اور آخرت کا منکر تھا۔ جب یہ جنتی جنت کی محفل میں بیٹھا ہو گا تو اپنے کافر ساتھی کو یاد کرے گا کہ فلاں بندہ کدھر ہے جو مجھے طعنے دیتا تھا کہ واقعی تم آخرت کی زندگی کو سچ مانتے ہو؟ وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ ہم جب مٹی ہو جائیں گے ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہمیں اپنے اعمال کا بدلہ ملے گا؟! اللہ تعالیٰ اس جنتی بندے سے فرمائیں گے کہ تم دیکھنا چاہو تو دیکھ لو! یہ پھر جنت سے جہنم کی طرف دیکھے گا تو وہاں اسے وہ شخص نظر آ جائے گا، یہ جنتی اس کافر سے کہے گا خدا کی قسم! تو مجھے بھی گمراہ کر دیتا لیکن اللہ کا کرم تھا کہ اللہ نے مجھے محفوظ رکھا اور میں بچ گیا۔ تو وہاں پر ایسے سلسلے چلیں گے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

قرآن کریم میں صرف ان دو بندوں کا ذکر ہے لیکن یہ تعیین نہیں کہ یہ کون تھے اور ان کے نام کیا تھے؟ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ دو بندے تھے، ان میں سے مؤمن کا نام یہوداتھا اور کافر کا نام مطروس تھا۔

اور علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہاہے کہ یہ دو بندے اور تھے جو دوست تھے، مل کر کاروبار کیا، آٹھ ہزار دینار کا منافع ہوا، چار ہزار ایک نے لیے اور چار دوسرے نے، ان میں سے ایک آدمی نے ایک ہزار دینار سے زمین خریدی اور دوسرے نے ایک ہزار صدقہ کیا اور اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ! اس ایک ہزار دینار کے بدلے میں میں جنت میں زمین خریدتا ہوں۔ ایک نے ایک ہزار دینار سے اس زمین پر مکان بنایا اور دوسرے نے ایک ہزار پھر صدقہ کیا اور دعا کی کہ یا اللہ! اس ہزار دینار کے بدلے میں جنت میں ایک گھر خریدتا ہوں، ایک نے پھر ایک ہزار دینار سے شادی کی اور دوسرے نے ایک ہزار پھر صدقہ کر دیا اور دعا کی کہ یا اللہ! میں ایک ہزار کے بدلے میں جنت کی کسی عورت کو پیغام دیتا ہوں۔ پہلے نے ایک ہزار دینار پھر لگایا اور اس سے اپنا سامان خریدا اور ایک غلام خریدا اور دوسرے نے پھر ایک ہزار دینار اور صدقہ کر دیا، دعا کی کہ یا اللہ! اس کے بدلے میں جنت میں ایک غلام اور جنت کا سامان خریدتا ہوں۔

اتفاقاً ایسا ہو گیا کہ جس نے چار ہزار دینار صدقہ کیا تھا اس کو ضرورت پڑ گئی تو وہ اپنے اس دوست کے پاس کچھ پیسے مانگنے کے لیے گیا۔ اس نے کہا کہ تیرے پیسے کدھر ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو خرچ کر دیے اللہ قیامت کو صلہ دیں گے۔ اس نے کہا کہ کیا تم اس بات کو سچا سمجھتے ہو کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے اور ہمیں ایک اور زندگی ملے گی اور اس میں اعمال کا بدلہ بھی ملے گا؟ کہا کہ بالکل۔ اس نے کہا: اچھا! پھر جا میں تجھے پیسے نہیں دیتا۔ جب ان دونوں پر موت آئی۔ تو جس نے

پیسے اللہ کی راہ میں خرچ کیے اس کو تو جنت ملے گی اور دوسرا جہنم میں ہو گا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے اور ہم سب کو آخرت کی فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

زقوم؛ جہنمیوں کی خوراک

﴿اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ہمیشہ رہنے والے جنت کے انعامات بہتر ہیں یا زقوم کا درخت؟ زقوم کا درخت نہایت بدبو دار، کڑوا اور کریہہ المنظر ہے۔ تعیین میں بہت سارے علماء نے اختلاف کیا ہے کہ زقوم کسے کہتے ہیں؟ کسی نے کہا کہ "تھوہر" کے درخت کو کہتے ہیں، کسی نے کہا کہ "ناگن پھل" ایک درخت ہے اس کو کہتے ہیں۔ اس سے غرض نہیں کہ کون سا درخت ہے، بس اتنا کافی ہے کہ جہنم میں زقوم کا درخت ہو گا۔ ابوجہل اس کا مذاق اڑاتا تھا کیونکہ اس وقت عربوں میں تو نہیں البتہ اور علاقوں میں زقوم کا اطلاق کھجور اور مکھن پر ہوتا تھا، ابوجہل کہتا کہ یہ ہے زقوم؛ کھجور اور مکھن، آؤ اس کو کھالو! - اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو آزمائش بنایا ہے ظالمین کے لیے - آزمائش اس طرح کہ کون ہے جو اس کا ذکر سن کر ڈر جائے اور کون ہے جو اس کا ذکر سنے اور پھر سرکشی میں مزید جرات کرے! مکہ والے کافر کہتے تھے کہ زقوم درخت ہو گا اور آگ میں ہو گا۔ بھلا آگ میں کوئی درخت رہ سکتا ہے؟! فرمایا کہ یہ درخت جہنم کے بالکل نچلے حصے سے پیدا ہو گا۔ یہ اشکال اس درخت پر ہوتا ہے جو باہر پیدا ہو کہ یہ آگ میں کیسے رہے گا؟ جس درخت کی پیدائش ہی آگ میں ہو اس پر یہ اشکال نہیں ہوتا۔ اس کے لیے آگ میں رہنا کیا مشکل ہے؟!

﴿طَلۡعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوۡسُ الشَّيٰطِيۡنِ﴾... اس کے خوشے ایسے ہوں گے جیسے شیطان کا سر ہے۔ شیطان؛ سانپ کو بھی کہتے ہیں تو سانپ کے پھن کی طرح اس کے خوشے ہوں گے کریہہ المنظر۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ تخییلی ہے، تخییلی کا معنی کہ بعض چیزیں دیکھی نہیں ہوتیں لیکن عرف میں مشہور ہوتی ہیں اور اس سے مشابہت ہوتی ہے۔ اب دیکھو! کسی بندے نے دیو نہیں دیکھا لیکن کہتے ہیں کہ فلاں شخص دیو کی طرح بدصورت ہے۔ کسی نے پری نہیں دیکھی لیکن کہتے ہیں کہ فلاں پری کی طرح خوب صورت ہے۔ تو یہ تشبیہ تخییلی ہوتی ہے، بعض چیزیں عرف میں چل رہی ہوتی ہیں لیکن فی الواقع نہیں ہوتیں، اسی تخیل سے اس کو تشبیہ دیتے ہیں، اسی طرح اسے اس تخیل سے تشبیہ دی ہے کہ وہ پھل ایسا ہوگا جیسے شیطان کا سر ہوتا ہے، کوئی آدمی بھی شیطان کو خوب صورت نہیں کہتا، ہمیشہ شیطان کو بدصورت ہی سمجھا جاتا ہے۔

تذکرہ ہائے انبیاء علیہم السلام:

﴿وَلَقَدۡ نَادٰىنَا نُوۡحٌ فَلَنِعۡمَ الۡمُجِيۡبُوۡنَ ﴿۷۵﴾﴾

اللہ رب العزت نے یہاں سے چھ انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام۔

حضرت نوح علیہ السلام:

یہاں نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ فرمایا کہ نوح علیہ السلام نے ہم سے دعا مانگی اور ہم سے کوئی دعا مانگے تو ہم اس کی دعا کو قبول کرنے والے ہیں۔ ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو دردناک عذاب سے بچالیا تھا، ان کی اولاد باقی رہ گئی

باقی سب ختم ہو گئے اور نوح علیہ السلام کے جانے کے بعد ہم نے بعد والے عام لوگوں کی زبان پر یہ کلمات جاری کیے ﴿سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٩﴾﴾ جب بھی نام لیں گے تو کہیں گے نوح علیہ السلام... نوح علیہ السلام... نوح علیہ السلام کا اچھا تذکرہ جاری کر دیا۔ نوح علیہ السلام کی قوم جو رہ گئی تھی وہ بھی فوت ہو گئی۔ طوفان کے بعد زمین پر جو نسل چلی ہے وہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سے چلی ہے؛ ایک کا نام سام تھا، ایک کا نام حام تھا، ایک کا نام یافث تھا۔

اور ترمذی کی حدیث ہے کہ سام کی اولاد اہلِ عرب ہیں اور حام کی اولاد اہلِ حبشہ ہیں اور یافث کی اولاد اہلِ روم ہیں۔[28]

تو ان کے تین بیٹوں سے دنیا میں اولاد چلی، اور اقوال بھی ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میرا تفسیر میں ذوق یہ ہے کہ میں بہت اقوال ذکر نہیں کرتا، بس ایک بات کرو جو زیادہ مناسب ہو، جو دل کو لگتی ہو اور اس کو پھر آگے عوام کو سمجھانا شروع کر دو اور آپ بھی جب عوام میں درس دیں تو اقوال زیادہ نہ بیان کریں کہ جی بعض یہ کہتے ہیں... بعض یہ کہتے ہیں... اس سے سامعین الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے سیدھی سیدھی ایک بات کہہ دیں جو بندوں کے دماغ میں اتر جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

﴿وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿٨٣﴾﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام؛ حضرت نوح علیہ السلام کے گروہ کے آدمی تھے، یعنی عقائد ایک تھے۔ ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ﴾ یہ واقعہ کئی جگہ پر آیا ہے، میں نے صرف موٹی موٹی باتیں کہنی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

28۔ سنن الترمذی، رقم: 3231

قوم سالانہ میلے میں جانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ آپ بھی چلیں! ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھا اور فرمایا: ﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴾ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں نہیں جاسکتا۔ نہیں گئے۔ ان کے جانے کے بعد ابراہیم علیہ السلام بت خانے میں گئے اور آپ نے بتوں سے کہا کہ تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ یہ کھانا پڑا ہے تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟ پھر ابراہیم علیہ السلام نے دایاں ہاتھ چلایا اور آپ نے ان بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ جو بڑا بت تھا اس کو چھوڑ دیا۔ واپسی پر قوم نے بتوں کا یہ حال دیکھا تو انہوں نے پوچھا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ ﴿قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴾[29] کہا کہ ایک نوجوان ہمارے بتوں کا تذکرہ کرتا تھا، اسے ابراہیم کہتے ہیں، اسی نے کیا ہو گا۔ اس کو پکڑ کر لاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام کو لایا گیا، پوچھا: یہ تو نے کیا ہے؟ فرمایا: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴾[30]

نہیں، یہ حرکت ان کے اس بڑے سردار نے کی ہے، انہی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں تو! بڑے سے پوچھو جو کندھے پر کلہاڑا لے کر کھڑا ہوا ہے۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تمہیں پتا نہیں ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔ فرمایا:

﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ۗ اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾[31]

کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کر رہے ہو جو تمہیں نہ نفع پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان۔ تف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی جن کی تم اللہ کو

29۔ الانبیاء 60:21

30۔ الانبیاء 63:21

31۔ الانبیاء 67:21، 68

چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، کیا تم میں اتنی بھی سمجھ نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام حجت تام کرنا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے ایسا طریقہ اختیار فرمایا تھا۔

﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ کا پہلا معنی:

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿۸۹﴾﴾

ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو قوم تھی وہ ستاروں کی پوجا کرتی تھی اور ستاروں کو مؤثر بھی سمجھتی تھی کہ ستارے یہ کام کرتے ہیں۔ آپ علیہ السلام نے ایسے اوپر دیکھا تو انہوں نے سمجھا کہ ابراہیم علیہ السلام بھی ہمارا ہم عقیدہ ہے، ستاروں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ کیونکہ یہ لوگ بھی پیشین گوئیاں کرتے تھے، ستارہ دیکھ کر کہتے تھے کہ بارش ہوگی، ستارہ دیکھ کر کہتے کہ فلاں بیمار ہوگا، فلاں کو اولاد ہوگی جبکہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد قطعاً یہ نہیں تھا، مطلب یہ تھا ﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ کہ میں بیزار ہوں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بسا اوقات طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا مطلب مریض اور بیمار ہونا نہیں ہوتا بلکہ بعض حوادث سے بندے کو تکلیف ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

کوئی آدمی اپنے مخاطب کی حالت دیکھتا ہے تو اسے دکھ اتنا ہوتا ہے کہ بندے کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے، کہہ اٹھتا ہے کہ اوئے یار! دفع ہو جا تو میرے سامنے نہ آ، تجھے دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔

ایک اشکال کا جواب:

ابراہیم علیہ السلام نے جو ستاروں کو دیکھا تو اس پر کسی کو اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ تو یہ نہیں تھا لیکن ابراہیم علیہ السلام نے ان کے

دیکھنے کی طرح دیکھا اور وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام بھی ہماری طرح ستاروں کو مؤثر سمجھتے ہیں اس سے تو ان کے عقیدے کی تائید ہوتی ہے اور غلط عقیدے والے کی تائید کرنا تو ٹھیک نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنا کہ تائید تب ہوتی جب ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد خاموش رہتے اور ان کے نظریے کی تردید نہ کرتے، آپ نے تو کھل کر تردید کی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿٧٦﴾﴾[32]

جب ابراہیم علیہ السلام پر رات چھاگئی اور انہوں نے ایک ستارا دیکھا تو فرمایا: یہ میر رب ہے؟ پھر جب وہ ڈوب گیا تو فرمایا کہ میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا! تو تائید کیسے ہو سکتی ہے؟! یہ تردید ہے... تائید ہرگز نہیں ہے۔

﴿اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾ کا دوسرا معنی:

﴿اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾... اس کا ایک معنی تو وہ ہے جو میں نے عرض کیا کہ ”میں تم سے بیزار ہوں، تمہاری حرکتوں سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے“ سقیم کا ایک معنی اور بھی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾[33]، یہاں ”اِنَّكَ مَيِّتٌ“ کا معنی ہے کہ آپ پر موت آنی ہے، اسی طرح ﴿اِنِّيْ سَقِيْمٌ﴾ کا معنی یہ نہیں کہ میں بیمار ہوں بلکہ اس کا معنی ہے کہ میں نے بیمار ہونا ہے اور یہ طے شدہ ہے کہ ہر

32۔ الانعام 76:6

33۔ الزمر 30:39

بندے نے موت سے پہلے بیمار ہونا ہے۔ اگر کسی کو ظاہری بیماری نہ ہو تب بھی موت سے پہلے انسان کے مزاج میں خلل کا آنا لازمی بات ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ بندے کو خلافِ مزاج کبھی کوئی چیز پیش نہ آئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت:

﴿وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٩٩﴾﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں۔

پہلے تو آپ علیہ السلام عراق کے کچھ مقامات اور شہروں میں گئے، پھر وہاں سے ہوتے ہوئے شام کے علاقے میں گئے۔ وہاں سے مصر پھر مکہ مکرمہ پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ کا نام سارہ تھا اور آپ کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ ابراہیم علیہ السلام جب مصر سے گزرے تو اس دوران ایک واقعہ ہوا۔

فرعونِ مصر- فرعون کوئی خاص بندہ نہیں ہے، مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کہتے ہیں جس طرح ہمارے سربراہِ مملکت کو صدر کہتے ہیں تو وہاں ہر بادشاہ کو فرعون کہتے تھے- اس ظالم کی عادت تھی کہ کسی بھی خوبصورت خاتون کو دیکھ کر اس کی عزت پر حملہ کرتا تھا۔ اگر اس کے ساتھ اس کا شوہر ہوتا تو اسے قتل کر دیتا تھا اور شوہر کے علاوہ کوئی اور عزیز ہمراہ ہوتا تو اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام مصر سے گزرے تو انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: تم کہنا کہ میں ان کی بہن ہوں۔ حقیقت میں تو بہن نہیں تھی بلکہ بیوی تھی، ابراہیم علیہ السلام نے ظاہری طور پر کہا ہے کیونکہ دنیا بھر کے سارے مسلمان اسلامی بہن بھائی ہیں۔ خیر اس ظالم نے جب ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ پھر اس نے حضرت سارہ سے کہا کہ اپنے خدا سے دعا کرو کہ میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا لیکن اس نے پھر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو پھر ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے کہا کہ دعا

کرو کہ میں ٹھیک ہو جاؤں اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ دعا سے ٹھیک ہوا تو پھر تیسری بار اس نے یہ حرکت کی تو اب بھی ہاتھ شل ہو گیا۔ اب بھی کہا کہ تم دعا کرو تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ دعا مانگی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ اب اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جن ہے یہ انسان نہیں ہے، اس کو مجھ سے دور لے جاؤ! اس نے حضرت سارہ کی خدمت کے لیے ایک لڑکی بھی ساتھ دے دی جس کا نام ہاجرہ تھا اور یہ فرعون کی اپنی بیٹی تھی۔ حضرت سارہ نے یہ سمجھ کر کہ میرے ہاں تو اولاد نہیں ہے حضرت ابرہیم علیہ السلام سے کہا کہ آپ اس سے بھی نکاح کریں، شاید اللہ اس سے اولاد دیں۔ حضرت ہاجرہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام حضرت اسماعیل علیہ السلام تھا۔

حضرت سارہ کو دیکھو! اپنا بچہ نہیں تھا، فرمایا آپ ہاجرہ سے نکاح کر لیں اللہ اس سے اولاد دے گا، اللہ نے پھر ان سے اسماعیل بیٹا پیدا فرمایا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جب جوان ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اپنے بیٹے سے فرمایا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ بیٹے نے کہا:

خواب میں بیٹے کو ذبح کرنا:

﴿قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾

اے ابو جان! جو آپ کو حکم ہوا ہے آپ اس پر عمل کیجیے، ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ''اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا'' نہیں کہا کہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، بلکہ ﴿اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ کہا کہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ یہ بتانے کے لیے کہ تنہا میں ہی نہیں ہوں صبر کرنے والا اور بھی ہیں۔ کتنی تواضع ہے کہ اللہ کرم فرمائیں گے آپ بسم اللہ پڑھیں۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے خود فرمایا: ابو جی! مجھے باندھ دیں، ہو سکتا ہے کہ میں درد

برداشت نہ کر سکوں! روایت میں ہے کہ جب چھری چلائی تو اللہ نے چھری اور گردن کے درمیان پیتل حائل کر دیا جس کی وجہ سے گلا نہیں کٹا تو کچھ دیر بعد اسماعیل علیہ السلام نے خود فرمایا: ابا جی! مجھے الٹا لِٹا دیں۔ ایک تو چھری دیکھنے سے مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے اور دوسرا چھری چل نہیں رہی، شاید آپ محبتِ پدری کی وجہ سے صحیح چلا نہیں رہے لہذا الٹا لِٹا دیں۔ پھر چھری چلائی لیکن پھر بھی نہیں چلی تو اللہ نے مقدر میں ذبح لکھا ہی نہیں تھا وہ تو صرف امتحان تھا جو خدا نے ابراہیم علیہ السلام سے لینا تھا۔

یہ بات یاد رکھنا! جب اللہ امتحان لیتے ہیں تو اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ اللہ کو معلوم نہیں ہوتا بلکہ امتحان اس وجہ سے ہوتا ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ بلا وجہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے خلیل اللہ بنا لیا۔ تو خلیل بنانے کی یہ وجوہات ہیں۔ دیکھو! ہر امتحان میں کیسے کامیاب ہوئے؟

﴿فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿١٠٣﴾﴾ .... دونوں نے خود کو خدا کے حوالے کر دیا۔ اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لِٹا دیا، اس کا ایک مطلب تو میں نے بیان کر دیا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے سامنے والا حصہ اس کو کہتے ہیں "وَجْهَةٌ" اور ایک ہے پیشانی کے دونوں کونے، اس کو "جبین" کہتے ہیں۔ تو ان کو کروٹ کے بل لٹایا، پیشانی کا ایک کونہ نیچے زمین سے لگ گیا پھر یوں گردن کو ذبح کیا۔ اب کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔

﴿وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ﴾ ... اللہ فرماتے ہیں: ہم نے کہا ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا،

﴿اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ یہ تو امتحان تھا۔ اس کے بدلے میں ابراہیم علیہ السلام کو جنت کا دنبہ دیا۔ اسماعیل علیہ السلام بچ گئے۔ دنبہ ذبح ہو گیا۔ ابراہیم علیہ السلام کامیاب ہو

گئے۔

ایک لفظ کا اضافہ پورے معنی کی تبدیلی:

﴿وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾﴾

ہم نے ایک عظیم قربانی فدیے میں دی اور اس بچے کو بچالیا۔

میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت نے یہاں صرف "بِذِبْحٍ" نہیں فرمایا بلکہ "بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ" فرمایا۔ اگر دنیا والا دنبہ ہوتا تو "بِذِبْحٍ" کافی تھا، چونکہ دنبہ جنت سے آیا تھا تو اس وجہ سے "بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ" فرمایا۔ اب ایک لفظ کا اضافہ ہوتا ہے تو اس سے پورا معنی بدل جاتا ہے۔

انبیاء کو بشر نہ ماننے والوں کے شبہ کا جواب:

میں اس کو سمجھانے کے لیے کئی مثالیں دیا کرتا ہوں۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہونے والی زلیخا کو دیگر عورتوں نے طعن و تشنیع کی کہ تو غلام پر عاشق ہو گئی ہے۔ تو زلیخا نے کہا: تم نے غلام دیکھا نہیں ہے، چلو تمہیں دکھا دیتی ہوں۔ یوسف علیہ السلام سے کہا کہ باہر آئیں۔ دستر خوان پر پھل اور چھریاں رکھ دیں۔ عورتوں نے جب اچانک یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو انہوں نے کہا:

﴿مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾﴾[34]

یہ تو بشر نہیں ہے، یہ تو فرشتہ ہے۔

زلیخا نے کہا کہ یہی ہے وہ غلام جس پر تم مجھے طعنے دیتیں تھیں۔

اب دیکھو! ہم نبی کو بشر سمجھتے ہیں، جو بشریت نبی کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں

34۔ یوسف 31:12

کہ نبی بشر نہیں ہوتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عورتوں نے کہا: ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾ کہ یہ بشر نہیں، اور قرآن نے تردید بھی نہیں کی۔ جب قرآن تردید نہ کرے تو مسئلہ وہی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی بشر نہیں ہے۔

میں نے کہا: اللہ نے سورۃ الشمس میں سات قسمیں کھا کر ارشاد فرمایا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ﴾[35] کہ ہم نے انسان کے مزاج میں بہیمیت اور ملکیت رکھی ہے۔ ملکیت کا معنیٰ؛ مان کے چلنا اور بہیمیت کا معنیٰ؛ من مانی کرنا... ملکیت کا معنیٰ؛ فرشتہ پن اور بہیمیت کا معنیٰ؛ ڈنگر پن۔ جب آدمی من مانی کرتا ہے تو اللہ فرماتے ہیں ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ﴾ کہ یہ جانور کی طرح ہے، وہ بھی من مانی کرتا ہے اور یہ بھی من مانی کرتا ہے لیکن جانور کے مزاج میں مان کر چلنے کی صلاحیت نہیں ہے جبکہ انسان کے مزاج میں ماننے کی صلاحیت ہے پھر بھی من مانی کرتا ہے تو فرمایا ﴿بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾[36] بلکہ جانور سے بھی بدتر ہے۔

توضیح بالمثال:

اس کی مثال سمجھیں! آپ نے یہاں سے اسلام آباد جانا ہے۔ ایک گاڑی اے سی ہے، ایک نان اے سی ہے، آپ اے سی والی کا ٹکٹ نان اے سی سے زیادہ ادا کر کے لیتے ہیں، راستے میں اے سی خراب ہو جائے تو یہ نہیں کہتے کہ ”یہ گاڑی نان اے سی کی طرح ہے“ بلکہ کہتے ہیں کہ ”یہ تو نان اے سی سے بھی بدتر ہے“ کیونکہ اُس میں تو اے سی تھا ہی نہیں، اس میں اے سی تو تھا مگر کام نہیں کرتا۔ تو جانور کے مزاج

35۔ الشمس 8:91

36۔ الاعراف 179:7

میں من مانی کرنا ہے، انسان کے مزاج میں مان کر چلنا ہے پھر بھی من مانی کرتا ہے تو "بَلْ هُمْ اَضَلُّ" ہے۔

تو ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾ اس میں بشریت کی نفی نہیں بلکہ بشریت کے ضمن میں من مانی کرنے کی نفی ہے، انہوں نے کہا تھا کہ یہ وہ بشر نہیں ہے جو من مانی کرے، ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ یہ تو وہ بشر ہے جو مان کر چلتا ہے اور جو مان کر چلے وہ فرشتہ ہوتا ہے۔ چونکہ فرشتہ مان کر چلتا ہے تو اس کو "مَلَكٌ" کہتے ہیں، فرشتے کے مزاج میں مان کر چلنا ہے اور انسان کے مزاج میں من مانی بھی ہے پھر بھی مان کر چلے تو اس کو صرف "مَلَكٌ" نہیں کہتے بلکہ ﴿مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ کہتے ہیں۔

اہلِ بدعت سے سوالات:

اب ہم نے تو آیت کا معنی کھول دیا لیکن آپ کہتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہے! دلیل کہ ان عورتوں نے کہا تھا: ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾

ہم آپ سے پوچھتے ہیں: اگر نبی بشر نہیں ہوتا تو کیا نبی فرشتہ ہوتا ہے؟ کہتے ہیں: نہیں! تو ہم نے کہا کہ وہ عورتیں تو دو باتیں کہتی تھیں:

1: ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾ یہ بشر نہیں ہے۔

2: ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ یہ فرشتہ ہے۔

یہ تمہاری دلیل تب بنے گی جب تم نبی کو بشر نہ مانو بلکہ فرشتہ مانو۔ ہم نے تمہارے اعتراض کا جواب دے دیا ہے اب تم ہمارے سوال کا جواب دو۔

ذبیح کون؟ حضرت اسماعیل یا حضرت اسحاق؟

﴿سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿١٠٩﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٠﴾ اِنَّهٗ مِنْ

﴿عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١١٢﴾﴾

ذبیح؛اسماعیل علیہ السلام تھے یا اسحاق علیہ السلام تھے؟ بعض کی رائے یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام تھے، بعض کی رائے یہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام تھے اور ترجیح اس کو ہے کہ ذبیح اللہ؛ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔اس کی چند دلیلیں ہیں:

نمبر1: اللہ نے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

ہم نے انہیں اسحاق کی بشارت دی تھی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسحاق علیہ السلام اس کے بعد پیدا ہوئے۔

نمبر2: ﴿وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا﴾

خوشخبری دی کہ اسحاق علیہ السلام پیدا ہوں گے جو نبی ہوں گے۔

اگر یہ بتادیا جائے کہ بعد میں نبی ہوں گے تو پھر امتحان کیسے ہوا؟ کیونکہ نبی تو تب ہوں گے جب زندہ بھی رہیں گے۔

نمبر3: اسی طرح قرآن میں ہے:

﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾﴾[37]

ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو خوشخبری دی کہ تمہیں اسحاق دیں گے اور اسحاق کا بیٹا یعقوب بھی دیں گے!

تو پہلے خوشخبری مل جائے کہ ان کی اولاد بھی ہوگی تو پھر ذبح کرنا کیسے امتحان بنے گا؟

نمبر4: پھر اہم بات یہ ہے کہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ایسے بیٹے کو ذبح کیا جو

37۔ھود 11:71

پہلا تھا اور پہلے اسماعیل علیہ السلام تھے۔ جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال تھی اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو عمر سو سال تھی۔

نمبر5: ذبح کا یہ واقعہ منیٰ کے قریب عرب میں پیش آیا ہے اور عرب میں حضرت اسحاق نہیں تھے عرب میں حضرت اسماعیل تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل ہیں، حضرت اسحاق نہیں۔

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝١١٤﴾

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا واقعہ تفصیل سے پہلے گزر چکا ہے۔

حضرت الیاس علیہ السلام:

﴿وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝١٢٣﴾

حضرت الیاس علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ الیاس اور اِلْ یاسین بھی انہی کا نام ہے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد اور حضرت الیسع علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ اسرائیل کے بادشاہ کی بیوی ایک بت کی پوجا کرتی تھی جس کا نام "بعل" تھا اور ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ہمارے اس بت کے آگے ساڑھے چار سو نبی ہیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور جن کو تم نے نبی مانا ہوا ہے تم ان کو بلاؤ، ادھر میں بھی آتا ہوں، وہ اپنے خدا "بعل" کے نام پر قربانی کریں اور میں اپنے اللہ کے نام پر قربانی کرتا ہوں، ان کی قربانی کو آسمانی آگ نے کھالیا تو ان کا دین سچا اور میری قربانی کو آگ کھالے تو میرا دین سچا۔ بعل بت کے ان جھوٹے چار سو نبیوں نے قربانیاں کیں لیکن کسی ایک کے لیے بھی آگ نہیں آئی کیونکہ وہ جھوٹے تھے، حضرت الیاس علیہ السلام نے جب جانور ذبح کیا تو آسمان سے

آگ آئی اور کھا کر چلی گئی لیکن پھر بھی ان لوگوں نے نہ مانا، ضدی تھے بالآخر اس قوم کو خدا نے تباہ و برباد کر دیا۔

پہلے قربانی کی قبولیت کا یہ ضابطہ تھا کہ آسمان سے آگ آتی اور قربانی کو کھا لیتی تھی تو یہ علامت تھی کہ قربانی قبول ہو گئی ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام:

﴿وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٣٣﴾﴾

حضرت لوط علیہ السلام؛ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں سے سوائے لوط علیہ السلام کے کوئی ایمان نہیں لایا۔ یہ ان کے کلمہ گو تھے۔ پھر اللہ نے ان کو بستی سدوم میں نبی بنا کر بھیجا۔ ان کی قوم نے گندے افعال کیے تو اللہ نے ان کو سخت عذاب دیا اور تباہ و برباد کر دیا۔

حضرت یونس علیہ السلام:

﴿وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٣٩﴾﴾

یونس علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ ایک قوم کی طرف بھیجے گئے۔ آپ کی قوم نافرمان تھی۔ آپ کے بار بار سمجھانے کے باوجود راہِ راست پر نہیں آئی تو آپ نے انہیں کہا کہ تم پر خدا کا عذاب تین دن میں آ جائے گا۔ اس کے بعد آپ علیہ السلام بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ ابھی عذاب کے آثار آئے تو قوم کو حضرت یونس علیہ السلام کی پیشگوئی کی سچائی معلوم ہوئی تو وہ گڑ گڑا کر اللہ کے حضور روئی تو خدا نے ان سے عذاب کو ٹال دیا۔ ابھی عذاب کی کیفیت وہ نہیں تھی کہ جس میں توبہ قبول نہ ہو۔ حضرت یونس سمجھے کہ وہ کیفیت آ گئی ہے۔ اجتہادی غلطی ہو گئی۔ آپ بستی سے چلے گئے۔ جب آگے کشتی میں جا کر بیٹھے تو کشتی تھوڑا سا آگے چلی تو ڈوبنے لگی۔ کشتی کے ملاح نے کہا کہ

ہماری کشتی میں کوئی دوڑا ہوا غلام ہے، جب تک وہ باہر نہیں پھینکو گے کشتی نہیں چلے گی، اس کو پانی میں پھینکنا پڑے گا۔ جب قرعہ نکالا تو حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہی ہوں۔

آپ نے وہاں چھلانگ لگادی۔ اس کو خودکشی نہ سمجھنا! کیوں کہ وہ بظاہر ابھی کنارے کے اتنے قریب تھے کہ ان کے ذہن میں تھا کہ میں تیر کر وہاں پر پہنچ جاؤں گا، اس لیے یہ خودکشی نہیں ہے۔ جونہی پانی میں گرے تو آگے مچھلی منہ کھولے بیٹھی ہوئی تھی، اس نے نگل لیا۔ حضرت یونس علیہ السلام پھر دعا فرمانے لگے:

﴿لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾﴾ [38]

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دعا نہ مانگتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے یعنی مچھلی کھا جاتی مچھلی کا پیٹ ان کی قبر بن جاتا۔

اللہ نے چالیس دن کے بعد مچھلی کو حکم دیا۔ اس نے باہر نکالا۔ چالیس دن چونکہ مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے تو مسلسل مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے ان کے بدن کے سارے بال ختم ہو گئے۔ اللہ نے فوراً کدو کی بیل وہاں پر لگادی:

﴿وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ﴿۱۴۶﴾﴾

"یقطین" عربی زبان میں اس درخت کو کہتے ہیں کہ جس کا تنا نہ ہو جسے ہم اردو میں بیل کہتے ہیں۔ اصل میں "شجرۃ" کہتے ہیں تنادار درخت کو اور یہ بیل تھی جس کا تنا نہیں ہوتا لیکن پھر قرآن نے اسے شجرۃ کہا ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ معجزہ تھا کہ اللہ نے اس بیل کو تنا بنا دیا تا کہ حضرت یونس علیہ السلام اس کے نیچے آرام کریں یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں درخت تھا

38۔ الانبیاء 87:21

تو ساتھ اس کے بیل لگ گئی جو درخت پر چڑھ گئی تا کہ اس کے نیچے آرام فرماسکیں۔

اور ایک ہرنی کو حکم دیا گیا کہ جا کر ان کو دودھ پلایا کرے۔ آپ وہ دودھ پیتے رہے۔ جب ترو تازہ ہو گئے تو اللہ نے حکم فرمایا کہ اپنی قوم کی طرف پھر واپس جاؤ! پھر یہ اپنی قوم کی طرف گئے۔

فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنے والوں سے سوال:

﴿فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾﴾

مشرکینِ مکہ میں سے بعض وہ تھے کہ جن کا دعویٰ یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بعض ان کی پوجا بھی کرتے تھے۔ اب ان کو سمجھایا جارہا ہے۔ فرمایا: اے پیغمبر! آپ ان سے پوچھیں کہ کیا تمہارے رب کے حصے میں بیٹیاں آئی ہیں اور خود تمہارے حصے میں بیٹے آئے ہیں؟! یعنی تم اپنے ماحول میں بیٹیوں کو اپنے لیے باعث عار سمجھتے ہو تو خدا کے لیے کیسے ثابت کرتے ہو؟ یہ تو تمہارے ماحول کے اعتبار سے بھی غلط ہے۔

دلیل کی تین اقسام:

کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے تین قسموں میں سے کسی ایک قسم کی دلیل دی جاسکتی ہے؛ ایک ہوتی ہے دلیلِ مشاہدہ جسے عرف کہتے ہیں، ایک ہوتی ہے دلیل عقلی اور ایک ہوتی ہے دلیلِ نقلی۔ اب تمہارے دعوے پر ان تین دلیلوں میں سے کون سی دلیل ہے؟ یہ جو تم نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں تو کیا تمہارا مشاہدہ ہے؟ ﴿اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾﴾ کیا خدا نے جب فرشتوں کو بیٹیاں بنایا تھا تو تم موجود تھے؟ نہیں تم موجود نہیں تھے تو پھر یہ تمہارا جھوٹ ہوا۔

پھر ہوتی ہے دلیل نقلی کہ کسی ایسے بندے کی بات نقل کریں جو بندہ سچا ہو

اور جو بندہ جھوٹا ہو اس کی بات دلیل نقلی کیسی بنے گی؟ تم لوگ جو اس عقیدے کے قائل ہو تم جھوٹے ہو تو تمہاری بات دلیل کیسے بنے گی؟ فرمایا: ﴿اَلَاۤ اِنَّهُمۡ مِّنۡ اِفۡكِهِمۡ لَيَقُوۡلُوۡنَ ۝۱۵۱ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمۡ لَـكٰذِبُوۡنَ ۝۱۵۲﴾ یہ لوگ بہتان تراشی کی بنا پر کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے، یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی دلیل نہیں بن سکتی۔

یا پھر تمہارے پاس دلیل عقلی ہونی چاہیے دلیل عقلی بھی نہیں ہے کیونکہ تم خود لڑکیوں کو کم تر سمجھتے ہو اور لڑکوں کو افضل سمجھتے ہو، بیٹیوں کو تم عار سمجھتے ہو اور ان کو قتل کر دیتے ہو تو جو خود تمہاری عقل میں بھی کم تر ہے تو کیا اللہ اس کم تر کو اپنے لیے منتخب کرے گا اور اعلیٰ تمہیں دے گا؟ فرمایا: ﴿اَصۡطَفَى الۡبَنَاتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ ۝۱۵۳ مَا لَـكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ۝۱۵۴﴾ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیوں کو ترجیح دی ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کس طرح کے فیصلے کرتے ہو؟ تو عقلی دلیل بھی ان کا ساتھ نہیں دیتی۔

تو تمہاری بات بھی نہ مانیں، مشاہدہ بھی نہیں ہے، عقل کے بھی خلاف ہے، ایک صورت بچتی ہے کہ چلو کسی آسمانی کتاب میں ہو تو وہ لے آؤ ﴿فَاۡتُوۡا بِكِتٰبِكُمۡ﴾ کوئی کتاب ہے تو وہ لے آؤ! تمہارے پاس تو اس دعویٰ پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ فرشتے عورتیں اور اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

دلیل الزامی کا ثبوت:

یہاں ایک بات یاد رکھنا! جب ہم مناظرہ میں گفتگو کرتے ہیں تو ایک ہے جوابِ تحقیقی اور ایک ہے جوابِ الزامی۔ یہ الزامی جواب دینا خود قرآن کا طرز اور قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اَصۡطَفَی الۡبَنَاتِ عَلَی الۡبَنِیۡنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ

تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمۡ لَکُمۡ سُلۡطٰنٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاۡتُوۡا

بِکِتٰبِکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۵۷﴾﴾

بیٹی تمہارے ہاں کمتر ہے تو کیا اللہ کمتر کو اپنی بیٹی بنائے گا؟ اگر بنانا ہوتا تو افضل کو اپنے پاس رکھتے اور غیر افضل تمہیں دیتے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو کمتر ہو اللہ اس کو اپنے لیے منتخب فرمالیں؟ یہ الزامی جواب ہے کہ جس کو تم عار سمجھتے ہو، جس کو تم ذلت سمجھتے ہو تو خدا اس کو بیٹی بنائے گا؟ اگر تمہارے ہاں بیٹی افضلیت کی علامت ہوتی تو تم کہتے کہ خدا کی بیٹیاں ہیں! جس کو اپنی غیرت کے خلاف سمجھتے ہو اللہ کے لیے کیسے ثابت کرتے ہو؟ یہ دلیلِ الزامی ہے۔

اور یہ بات یاد رکھنا! الزامی جواب کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ مخالف کی بات کو ہم صحیح سمجھتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ مخالف جس بات کو صحیح سمجھتا ہے اس کی بات کو اس پر پھینکا جائے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں تاکہ آپ سمجھ جائیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ابھی المہند علی المفند کے سبق میں میں نے ایک مسئلہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی وہ مٹی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر سے لگی ہوئی ہے کعبہ سے بھی اعلیٰ ہے۔ غیر مقلدین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے ہاں جب قبر کے ذرے جو وجودِ اطہر سے ملے ہیں کعبہ سے اعلیٰ ہیں تو جب نماز پڑھتے ہو تو منہ کعبہ کی طرف کیوں کرتے ہو؟ اُس طرف کیوں نہیں کرتے؟

اب ہم نے الزامی جواب دیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو افضل ہو منہ ادھر کرنا چاہیے تو تم منہ کعبہ کی طرف کرتے ہو عرش کی طرف کیوں نہیں کرتے؟ اب ہم نے اس اصول کو مانا نہیں ہے کہ نماز میں منہ افضل کی طرف ہو، ہم نے کہا کہ تمہارے

اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ نماز میں منہ افضل کی طرف ہونا چاہیے یہ جو تمہاری بنیاد ہے کہ افضل کی طرف ہونا چاہیے تو تم منہ کعبہ کے بجائے عرش کی طرف کرو۔ ہم نے بنیاد کو تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ جس کو بنیاد بناتے ہیں ہم اس کو بنیاد بنا کر ان پر الزام لگاتے ہیں، اسے الزامی جواب کہتے ہیں اور یہ قرآن سے ثابت ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ مخالف کو الزامی جواب سے خاموش کرنا یہ قرآنی طرز ہے اور یہ بات مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں لکھی ہے۔ میں اکثر احباب سے کہتا ہوں کہ پہلے ہم سے سمجھیں پھر معارف القرآن پڑھیں، آپ کو معارف القرآن پڑھنے کا مزا آئے گا۔ ہم سے پوچھے بغیر معارف القرآن پڑھیں گے تو آپ پڑھتے بھی رہیں گے اور الزامی جواب اور مناظرہ کا رد بھی کرتے رہیں گے۔ ہم سے سمجھ لیں پھر پڑھیں۔ آپ اعتراض نہیں کریں گے بلکہ آپ کو بات کرنے کا لطف آئے گا۔

متکلمِ اسلام اور مقصد میں انہماک:

کل ہم رائیونڈ میں تھے، مولانا طارق جمیل صاحب سے ملا تو ہماری بات شروع ہو گئی، یہ جو اعتراضات ہیں اکابرین علمائے دیوبند کی عبارات پر اس پر بات ہوئی، میرا خیال یہ ہے کہ پانچ منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ میں نے ایک عبارت پڑھی، دوسری پڑھی، تیسری پڑھی، چوتھی پڑھی۔ اتنے میں عرب کے کچھ مہمان آ گئے تو میں مصافحہ کر کے واپس آ گیا۔ اسلام آباد کے ایک ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر خالد رانجھا صاحب یہ میڈیکل کے کسی شعبہ کے ڈائریکٹر ہیں۔ میں واپس گھر سرگودھا آ رہا تھا تو مجھے ان کا رات کو میسیج آیا کہ آپ مولانا طارق جمیل صاحب کے پاس بیٹھے تھے تو مناظرانہ گفتگو اور عبارات کی تنقیح پر مزا آ رہا تھا، بس اچانک عرب مہمان آ گئے گفتگو رک گئی، آپ نے ہمیں نہیں دیکھا، فوراً چلے گئے، میں مصافحہ سے محروم رہ گیا۔ اگلا جملہ

سنو! کہا: اپنے موضوع میں اتنا انہماک اور دائیں بائیں نہ دیکھنا آپ کا یہ طرز مجھے بہت اچھا لگا۔ کیونکہ میں سیدھا گیا مولانا کے کمرے میں، کرسی پر بیٹھ گیا بات شروع ہو گئی، جب مہمان آ گئے تو میں فوراً نکل گیا، میں نے نہیں دیکھا کہ کمرے میں اور کون ہے۔ میں واپس آیا، گاڑی میں بیٹھا اور نکل گیا۔ انہوں نے کہا کہ اپنے مقصد میں یہ انہماک مجھے بہت اچھا لگا۔ دوبارہ پھر میسج کیا کہ "نہ دائیں دیکھنا نہ بائیں نظر کا اٹھنا سبحان اللہ!" یہ کون ہیں؟ پرانے تبلیغ کے ساتھی ہیں اور بہت بڑے منصب پر بیٹھے ہیں۔

جہدِ مسلسل کا نتیجہ:

آپ یقین فرمائیں! میں جب مرکز رائیونڈ گیا تو ساتھی دوڑ دوڑ کر ملتے تھے، میں امریکہ سے آیا ہوں آپ کے بیانات سے بہت فائدہ ہوا، میں کینیڈا سے ہوں بہت فائدہ ہو رہا ہے، میں افریقہ کا ساتھی ہوں ماشاء اللہ بہت فائدہ ہو رہا ہے، ہم انگلینڈ میں رہتے ہیں بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ وہاں مرکز کے ایک بزرگ ہیں، مجھے فرمانے لگے: مولانا! آپ کے کلپ سنتے ہیں ماشاء اللہ آپ نے نوجوانوں کو سنبھالا ہے اور جو آپ جواب دیتے ہیں مزا آ جاتا ہے۔ یہ مسلسل محنت کا نتیجہ ہے کہ اب ایک ایک بندہ آ رہا ہے۔

میں گاڑی پر تھا تو سندھ کے ایک مہمان آ رہے تھے، میں نے تھوڑا سا شیشہ نیچے کیا کہ چلو ان سے بھی مصافحہ کر لیں۔ ڈاڑھی منڈا آدمی تھا پتا نہیں ملازم تھا یا مزدور تھا، مجھے انہوں نے جو جملہ فرمایا سن کر بہت مزا آیا، مجھے کہتا ہے: او گھمن صاحب! ڈٹ جاؤ، گھمن صاحب! ڈٹ کے رہنا... مجھے لطف آ رہا تھا ان کی بات سے کہ ایک عام بندہ بھی اتنا متاثر ہے اور اتنا خوش ہو رہا ہے۔

اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ بس کام سے کام رکھیں، اللہ نے آپ سے کام لینا ہے، ایک وقت آئے گا اللہ آپ کے کام کو دنیا میں منوا دے گا، اگر منوانے کی فکر

سے کام کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اللہ ہم سب سے کام لیں۔ میں اس لیے کہتا ہوں اس مرکز اھل السنۃ والجماعۃ کا فیض دنیا میں کتنا ہے آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے، کس قدر لوگ اس سے مستفید ہو رہے ہیں اور الحمدللہ مناسب، مہذب، اعتدال اور دلیل کے ساتھ بات ہو رہی ہے۔

وہاں رائیونڈ ہم بیٹھے تھے، مولانا شاہد صاحب حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ کے نواسے ہیں وہ تشریف لائے، پھر مولانا عزیر صاحب آئے، مجھے نہیں یاد کہ کسی کو میرے آنے کا پتا چلا ہو اور وہ نہ آیا ہو۔ ہاں اگر کسی کو پتا نہ چلا ہو تو وہ الگ بات ہے، ہر کسی کا جی چاہتا تھا ملنے کو، کہ ہمارے دستر خوان پر کھائے، ہمارے ساتھ ناشتہ کرے، ہمارے پاس چائے پی لے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں تو کھانا اپنے گھر سے پکوا کر ساتھ لے جاتا ہوں جب رائیونڈ جاتا ہوں۔ میں یہ بات کیوں سمجھا رہا ہوں اس لیے کہ جب ہمارے پاس آئیں تو ہمارے مرکز کی بھی رعایت کریں، جب ہم آپ کے پاس جاتے ہیں تو ہم آپ کی رعایت کرتے ہیں، آپ کے اصولوں کا خیال کرتے ہیں، اپنا کھانا میں ساتھ لے کر جاتا ہوں، روٹیاں ساتھ پکوا کر لے جاتا ہوں تاکہ وہاں کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔

”حق غالب رہے گا“ کا معنیٰ:

﴿وَ لَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہمارا فیصلہ ہے ہمارے بندوں کے بارے میں کہ ہمیشہ ان کی مدد ہو گی، ہمارا لشکر غالب ہو کر رہے گا۔

یہاں بظاہر اشکال ہوتا ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر غالب ہوں گے لیکن کتنے پیغمبر ہیں جو بظاہر غالب نہیں ہوئے، قتل کر دیے گئے، قید کر دیے گئے، شہید

کر دیے گئے، جِلاوطن کر دیے گئے تو پھر اس آیت کا معنی کیا ہوا؟

اس کا سب سے جو آسان مفہوم ہے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

اِنْ لَّمْ یُنْصَرُوْا فِی الدُّنْیَا نُصِرُوْا فِی الْاٰخِرَۃِ.[39]

کہ اگر دنیا میں بظاہر ناکام ہوئے بھی تو آخرت میں پھر کامیاب ہوں گے۔ دنیا میں مغلوب ہوئے بھی نا تو آخرت میں غالب ہی ہوں گے۔

اور حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کی مثال ایسی ہے جیسے حاکم جا رہا ہو اور راستے میں گاڑی رکے اور ڈاکو اس کو لوٹیں تو بظاہر حاکم مغلوب ہے اور ڈاکو غالب ہیں لیکن حاکم نے دیکھ لیا کہ ڈاکو کون ہیں؟ تو جب کچھ دن بعد اسی حاکم کی عدالت میں آئیں گے۔ اب یہ ڈاکو غالب ہو کر بھی مغلوب ہیں اور حاکم مغلوب ہو کر بھی غالب ہے۔

اسی طرح اللہ کے نمائندے پکڑے جاتے ہیں، ماریں کھاتے ہیں، جیل میں جاتے ہیں، بظاہر بہت مغلوب ہوتے ہیں لیکن مغلوب ہو کر بھی وہ غالب ہیں کیوں؟ فرمایا: ﴿وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾﴾ کچھ دیر ٹھہرو، ان کو حسرت ہو گی کہ اے کاش! ہم ان کو نہ پکڑتے۔ ظلم کرنے والے کو حسرت ہو گی کہ کاش! ہم ظلم نہ کرتے لیکن ہمیں حسرت نہیں ہو گی کہ اے کاش یہ ہمیں نہ پکڑتے۔

میں بڑے درد سے یہ بات سمجھاتا ہوں کہ ان بک بک کرنے والوں کو، الزامات لگانے والوں کو، رکاوٹیں ڈالنے والوں کو حسرت ہو گی کہ اے کاش! ہم الزامات نہ لگاتے۔ اس لیے عزم کرو کہ ہم نے الزام لگانا نہیں ہے الزام سہنا ہے، گالی

39۔ تفسیر روح المعانی: ج23 ص156

دینی نہیں ہے گالی سہنی ہے، ظلم کرنا نہیں ہے ظلم سہنا ہے، کسی کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنی نہیں ہیں رکاوٹیں برداشت کرنی ہیں، جب یہ عزم کر لیں گے تو پھر اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہو گی۔ ہم اللہ کے لیے کام کرتے ہیں، بندوں کے لیے تھوڑا ہی کرتے ہیں!

﴿فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمۡ فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

یہ جو فرمایا کہ جب ان کے صحن میں عذاب اترتا ہے تو پھر دیکھو کس قدر برا انجام ہوتا ہے ڈرائے جانے والے کفار کی صبح کا۔

یہ عرب کا ایک محاورہ ہے۔ محاوراتِ عرب میں ایسے لفظ استعمال کیے جاتے تھے اور عرب کا معمول تھا کہ جب بھی حملہ کرنا ہوتا تو رات کو انتظار کرتے اور اچانک صبح حملہ کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی معمول تھا کہ اگر کسی دشمن کے خطے میں رات کے وقت پہنچتے تو حملہ کے لیے صبح تک کا انتظار فرماتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر پر حملہ کیا تو فرمایا:

اَللّٰهُ أَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ ﴿فَسَآءَ صَبَاحُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ﴾ [40]

یہ جملے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مبارک زبان سے خود پڑھ رہے تھے۔

تنزیہ باری تعالیٰ:

﴿سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۸۲﴾﴾

تمہارا رب جو عزت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو مشرکین بیان کرتے

40۔ صحیح البخاری، رقم:371

تھے، اور سلامتی ہو تمام رسولوں پر اور تمام تعریفیں رب العالمین کے لیے ہیں۔

مشرکین نے الزامات لگائے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں تو فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ اللہ پاک ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا کہ لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کو نہیں مانا تو فرمایا: ﴿وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ﴾ سلامتی ہے انبیاء علیہم السلام پر۔ مشرک لوگ شرک کا ارتکاب کرتے تھے، فرمایا: ﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اللہ شرک کو پسند نہیں فرماتا اللہ توحید کو پسند فرماتا ہے۔

اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر قرطبی میں صحابی رسول حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی بار سنا کہ آپ نماز ختم ہونے کے بعد یہ آیات تلاوت فرماتے تھے:

﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ فرماتے یا اونچی آواز سے؟! سنا تب ہی ہو گا جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آیاتِ مذکورہ کی تلاوت جہراً فرمائی ہو گی۔ اس لیے جہر کا رد نہ کرو، آپ کا ذوق نہیں تو آپ جہراً دعائیں نہ کریں لیکن دوسروں کا رد نہ کریں اور میں یہ بات اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ اپنے ذوق کو شریعت بنا کر مسلط نہ کریں! اپنے مزاج کو شریعت بنا کر دوسروں کی تردید نہ کریں، تھوڑی سی ہمت اور حوصلے سے کام لے لیا کریں۔ اللہ ہم سب کو قبول فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ صٓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿صٓ وَ الۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ؕ﴿۱﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّ شِقَاقٍ ﴿۲﴾﴾

ابتدائی آیات کا شانِ نزول:

﴿اَجَعَلَ الۡاٰلِہَۃَ اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ ہٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ ﴿۵﴾﴾

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ میں مشرکین کو دین کی دعوت دی تو ایک بار وہ تنگ ہو کر ابو طالب کے پاس آئے مرض الوفات میں، انہوں نے مشورہ کیا کہ اگر ابو طالب کے بعد محمد -صلی اللہ علیہ وسلم- پر ہاتھ اٹھائیں گے تو لوگ کہیں گے کہ جب ابو طالب زندہ تھے اس وقت تک ہمت نہیں ہوئی اور ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے کے ساتھ یہ سلوک کیا، لہذا ابو طالب کی زندگی میں جا کر فیصلہ کریں۔ انہوں نے ابو طالب سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو سمجھاؤ کہ یہ اپنی عبادت کریں اور ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہا کریں۔

ابو طالب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مجلس میں بلا کر کہا کہ بھتیجے! یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم ان کے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہو، ان کو برا بھلا نہ کہا کرو بلکہ تم اپنی عبادت کرو اور یہ اپنے معبودوں کی عبادت کریں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چچا! میں ان کو ایسا کلمہ سکھا رہا ہوں کہ اگر یہ کلمہ پڑھ لیں تو عرب پر ان

کی حکومت ہو اور عجم ان کی غلامی کریں۔ انہوں نے کہا بتاؤ وہ کیا کلمہ ہے؟: فرمایا: ”لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ“ تو انہوں نے کہا کہ تعجب ہے کہ ہم سارے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کریں، یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اس پر وہ سارے لوگ چلے گئے۔ اس موقع پر سورۃ ص کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾... انہوں نے کہا تعجب ہے یہ کہتا ہے کہ کئی خداؤں کے بجائے ایک خدا کی عبادت کرو۔

تین طلاق کے متعلق حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہ (صحیح مسلم):

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہاں لکھتے ہیں کہ ”اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔“[41] یہ ترجمہ میں اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ صحیح مسلم میں ایک حدیث موجود ہے، غیر مقلدین اسے اپنے مسلک پر سب سے مضبوط دلیل سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاق اکٹھی دے تو غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ایک ہوتی ہے۔ ان کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے:

كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً.[42]

جو ترجمہ یہ لوگ کرتے ہیں پہلے میں وہ ترجمہ کر رہا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک شمار ہوتی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جب دور آیا تو انہوں نے فرمایا: لوگوں کے لیے اللہ نے گنجائش دی تھی لیکن لوگوں نے گنجائش کو ختم

41۔ بیان القرآن: ج3 ص267

42۔ صحیح مسلم، رقم: 1472

کر دیا ہے، لہذا جب انہوں نے خود ختم کر دیا تو ہم بھی ختم کر دیتے ہیں، آئندہ کوئی تین طلاق دے گا تو وہ تین ہوں گی۔

اب وہ کہتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہوتی تھیں۔ حضرت عمر نے تین کے تین ہونے کا فیصلہ کیا تو ہم نے کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھا ہے، حضرت عمر کا تو نہیں پڑھا، اور اگر خلیفہ کا فیصلہ ماننا ہے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تو تین کو ایک کہنے کا تھا، حضرت عمر بھی دو سال تک تین کو ایک کہتے رہے، یہ تو بعد میں آپ نے فیصلہ کیا۔

اب بظاہر ان کی دلیل کتنی مضبوط ہے؟ اور ہمارے اپنے لوگ بھی بہت پریشان ہوتے ہیں اس دلیل کو سن کر۔

حدیث ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا پہلا جواب:

اس حدیث مبارک کے کئی ایک جوابات ہیں، میں وہ سارے جوابات پیش نہیں کرتا، مثلاً ایک جواب یہ ہے کہ اس روایت کے راوی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں اور اصولِ حدیث کا قاعدہ ہے کہ جب صحابی روایت پیش کرے اور فتویٰ اپنی روایت کے خلاف دے تو پھر روایت کا اعتبار نہیں ہوتا صحابی کے فتویٰ کا اعتبار ہوتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تقریباً ستائیس مرتبہ کے فتاویٰ موجود ہیں کہ تین طلاق دیں تو تین ہوتی ہیں اور اور تمہارے بقول وہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ تین طلاق ایک ہے، اور فتویٰ تین طلاق کے تین ہونے کا ہے۔ جب صحابی کا فتویٰ اپنی روایت کے خلاف ہو جائے تو اعتبار فتویٰ کا ہوتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روایتیں دو ہیں، ایک روایت یہی جو صحابی نے نقل کی ہے، ایک روایت اور بھی ہے جو ہمارے علم میں نہیں ہے لیکن صحابی کے علم میں تو ہے، اس لیے

اس نے فتویٰ اس پہلی کے خلاف دیا ہے ورنہ وہ اس کے خلاف فتویٰ کیسے دے سکتے تھے؟

کتے کے جوٹھے کو کتنی مرتبہ دھوئیں؟

کچھ دن پہلے مجھے ایک شخص نے فون کیا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو سات مرتبہ دھونا چاہیے، اور فقہ حنفی میں ہے کہ تین مرتبہ دھونا چاہیے تو تمہارا فتویٰ حدیث کے خلاف ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ کتا اگر برتن میں منہ ڈال دے تو برتن سات مرتبہ دھو لو، یہ تو حدیث ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا فتویٰ کیا ہے؟ مجھے کہتا ہے کہ جی تین مرتبہ۔ تو میں نے کہا کہ پھر اعتراض فقہ حنفی پر کیوں کرتے ہو، اعتراض حضرت ابوہریرہ پر کرو کہ حدیث بیان کرتے ہیں سات مرتبہ دھونے کی اور فتویٰ دیتے ہیں تین مرتبہ دھونے کا! تو اعتراض امام اعظم ابوحنیفہ پر ہوگا یا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر؟ اس پر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سات مرتبہ دھونے والی حدیث نقل کرتے ہیں، فتویٰ تین کا دیتے ہیں کیوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین مرتبہ دھونا فرض ہے اور سات مرتبہ دھونا مستحب ہے۔ اب دیکھو حدیث اور فتوی میں تعارض ختم ہو گیا تو فقہائے احناف جو کہتے ہیں کہ تین مرتبہ دھونا چاہیے وہ فرض کے درجے میں اور سات مرتبہ دھونا چاہیے مستحب کے درجے میں ہے۔

حدیث ابنِ عباس کا دوسرا جواب:

دوسرا جواب یہ ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے آگے ایک

شاگرد ہے طاؤس اور یہ شیعہ ہے۔[43]

اور ہمارا اصول یہ ہے کہ بدعتی راوی اگر کوئی روایت نقل کرے اور وہ روایت اہلِ بدعت کے مسئلے کے موافق ہو تو وہ ہمارے ہاں حجت نہیں ہوتی۔[44]

تین طلاق کو ایک کہنا یہ شیعہ کا مذہب ہے اور راوی کون ہے؟ شیعہ۔ جب شیعہ راوی ہے وہ روایت اپنے مسلک کے مطابق لائے گا تو وہ روایت ہمارے ہاں حجت نہیں ہو گی۔

حدیث ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا تیسرا جواب:

اور بھی جوابات ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ ایک ہوتی ہے تاکید اور ایک ہے استیناف تاکید کا مطلب کہ لفظ کو بار بار ذکر کریں اور معنی ایک ہو، اور استیناف کا مطلب کہ لفظ کو تو بار بار ذکر کریں اور ہر بار معنی الگ ہو۔ خاوند کہے: تجھے طلاق.. تجھے طلاق.. تجھے طلاق... اگر تاکید ہو تو معنی ہو گا کہ طلاق ایک ہے اور اگر استیناف ہو تو معنی ہو گا کہ طلاق تین ہیں۔ تو جب انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کہے تو اس سے مراد استیناف ہو گا یا تاکید؟

اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ پہلے کوئی شخص اپنی بیوی کو انت طالق، انت طالق، انت طالق کہہ کر طلاق دیتا تو چونکہ دوسری اور تیسری طلاق سے عام طور پر لوگ نئی طلاق کا ارادہ نہیں کرتے تھے اس لیے لوگوں کی غالب اور عام عادت کو دیکھتے ہوئے ان الفاظ سے محض تاکید مراد لی جاتی تھی اور اس بندے کی نیت

43۔ سیر اعلام النبلاء ج5 ص27،26، المعارف لابن قتیبہ ص268،267

44۔ شرح نخبۃ الفکر: ص117، مقدمہ فی اصول الحدیث لعبد الحق الدہلوی: ص67

کا اعتبار کر لیا جاتا تھا کہ اس نے دوسری اور تیسری طلاق سے محض تاکید مراد لی ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور لوگوں نے تین طلاقیں پے در پے دینا شروع کر دیں اور ان لوگوں کی نیت بھی عموماً طلاق کے دوسرے اور تیسرے لفظ سے استیناف یعنی نئی طلاق دینے ہی کی ہوتی تھی اس لیے جب کوئی شخص تین طلاقوں والا جملہ بولتا تو اس دور کے عرف کی بناء پر تین طلاقوں کا حکم لگایا جاتا تھا۔[45]

یہ بات اس وقت ہے جب "اَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا" نہ کہے بلکہ انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کہے تو اب دو احتمال تھے؛ تاکید یا استیناف لیکن جب "اَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا" کہے تو اس سے تین ہی واقع ہوتی تھیں۔

دو احتمالات میں سے ایک کا تعین مجتہد ہی کر سکتا ہے:

اب دوسری بات سمجھو! جب لفظ ایک ہو اور اس میں دو احتمال ہوں تو ان میں سے ایک احتمال کا تعین مجتہد ہی کر سکتا ہے۔ جیسے انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. میں دو احتمال ہیں ایک تاکید کا اور ایک استیناف کا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانے کے تغیر اور فساد کو دیکھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آئندہ اس سے مراد تاکید نہیں ہو گی بلکہ استیناف ہی ہو گا۔

اور محتملۃ المعانی الفاظ میں اگر فقیہ ایک معنی کا احتمال متعین کریں تو مقلد کے ذمہ اس کی تقلید ہوتی ہے۔ جیسے ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾[46] یہاں قروء؛ قرء کی جمع ہے، قرء کا معنی حیض بھی ہے اور طہر بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرء کا معنی حیض ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

45۔ شرح مسلم للنووی: ج1 ص478 کتاب الطلاق باب طلاق الثلاث

46۔ البقرۃ 2:228

قرء کا معنی طہر ہے۔ تو جس طرح قرء کے دو معنی ہیں امام نے ایک معنی متعین کیا ہے ایسے ہی انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کے بھی دو معنی تھے اور ایک معنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے متعین کر دیا۔ لیکن یہ کب ہے؟ جب یہ انت طالق.. انت طالق.. انت طالق.. کہے، انت طالق ثلاثاً نہ کہے، اور غیر مقلدین کے ہاں ''تجھے طلاق.. تجھے طلاق.. تجھے طلاق..'' کہے تب بھی ایک ہے اور ''تجھے تین طلاق ہیں'' کہے تب بھی ایک ہے، ان کی دلیل تو پھر بھی نہیں بنتی۔

حدیث ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا چوتھا جواب:

میں جو سب سے بہترین جواب ہے وہ دینے لگا ہوں، وہ سمجھیں۔ یہ جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ:

كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً.

اس کا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں لوگ تین کے بجائے ایک طلاق دیتے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں تین کے بجائے ایک دیتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں تین کے بجائے ایک دیتے، بعد میں لوگوں نے تین کے بجائے ایک نہیں بلکہ تین ہی دینا شروع کر دیں۔

جب ایک دیں گے تو ایک ہو گی اور جب تین دیں گے تو تین ہوں گی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِيْ أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ أَنَاةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ.

لوگوں نے اس معاملے میں جلد بازی شروع کر دی جس میں ان کے لیے

گنجائش موجود تھی- کہ ایک دے دیتے، جب انہوں نے تین دے کر گنجائش ختم کر دی تو میں عمر کیا کر سکتا ہوں؟! لہذا یہ تین ہی ہوں گی۔

اب دیکھیں "كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً"

اس کا ترجمہ اگر یہ کریں کہ "حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہوتی"... تو اب اس کے جوابات دینے پڑیں گے لیکن اگر ترجمہ یوں کریں کہ "حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین کے بجائے ایک طلاق دی جاتی تھی" تو بتاؤ کتنی ہوئی؟ ایک ہی ہو گی... اب جواب کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

اس معنی پر استشہاد یہ آیت دیکھو:

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾

مشرکین یہ نہیں کہتے تھے کہ محمد -صلی اللہ علیہ وسلم- نے کئی خداؤں کو ایک خدا بنا لیا ہے بلکہ وہ کہتے تھے: کئی خداؤں کی جگہ پر ایک خدا رکھا ہے۔ میں نے اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ نقل کیا ہے، حضرت تھانوی فرماتے ہیں: "اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا"

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کئی خداؤں کو ایک خدا بنا لیا، ایسا تو تھا ہی نہیں بلکہ وہ کہتے تھے کہ انہوں نے کئی خداؤں کی جگہ پر ایک ہی خدا رکھا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ جو حدیث ہے "طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً" اس کا معنی بھی یہی ہے کہ تین کی جگہ پہ ایک ہوتی، تو جب ایک ہوتی تو طلاقیں نافذ کتنی ہوئی تھیں؟ ایک!

اسی طرح حدیث پاک میں ہے:

مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللهُ هَمَّ دُنْيَاهُ.[47]

جو شخص اپنے تمام غموں کو ایک غم یعنی آخرت کا غم بنالے تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیاوی پریشانیوں اور فکروں سے اس کی کفایت فرماتے ہیں۔

اب اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ جس آدمی نے کئی غموں کو ایک غم بنالیا، کئی غم تو ایک غم ہو ہی نہیں سکتے، اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے کئی غموں کے بجائے ایک غم کو اختیار کرلیا اور وہ غمِ آخرت ہے۔ رزق کا غم ہے، بیماری کا غم ہے، کبھی گناہ کو جی چاہتا ہے، بندہ کنٹرول کرتا ہے تو کئی غم ہیں لیکن اس بندے نے سارے غموں کے بجائے ایک غم کو اختیار کیا تو اللہ اس کے دنیا کے غموں کے معاملے میں اس کو کافی ہو جائے گا یعنی ان غموں میں اس کی مدد کرے گا۔

اب ان دونوں کو دیکھو: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ کہ کیا اس محمد -صلی اللہ علیہ وسلم- نے کئی معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رکھ لیا، اور "مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا" کہ جس شخص نے کئی غموں کے بجائے ایک ہی غم کو اختیار کر لیا۔ ان دونوں معانی کو دیکھو تو بالکل اسی طرح معنی ہے اس حدیث کا "طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةٌ" کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق کے بجائے ایک دی جاتی تھی، جب دیتے ایک تھے تو شمار بھی ایک ہی ہوتی تھی۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ معنی ایسا بیان کرو جس سے شکوک وشبہات ختم ہو جائیں۔

47۔ سنن ابن ماجۃ، رقم: 257

بڑوں کا حوالہ دینے کی وجہ:

سندھ میں ''دَوڑ'' ایک جگہ ہے وہاں مدرسہ ہے رائے ونڈ کی شاخ، وہاں صرف اساتذہ بیٹھے تھے تو جب میں نے وہاں صحیح مسلم کی اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو صحیح مسلم پڑھاتے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے، یہ عجیب توجیہ ہے۔ میں نے کہا: یہ توجیہ ہماری نہیں یہ علامہ انور شاہ کشمیری کی ہے۔ جب میں نے علامہ صاحب کا نام لیا تو اب مطمئن ہو گئے۔

میں اپنی توجیہ بیان کرتا ہوں تو لوگوں کو الجھن ہوتی ہے، اس لیے پہلے میں توجیہ بیان کرتا ہوں حوالہ نہیں دیتا، وہ توجیہ ان کے دل کو لگتی ہے لیکن قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کے ہاں میری حیثیت نہیں ہے، میں پھر کسی بڑے کا حوالہ دیتا ہوں تو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو یہ بات سمجھاتا رہتا ہوں کہ بھائی! ہماری باتیں آج نہیں لیکن آئندہ نسلوں میں حجت ہوں گی، لوگ حوالہ پوچھیں گے کہ کس نے کہا؟ جواب ہو گا مولانا گھمن صاحب نے کہا، اب حوالہ آ جائے گا، اس وقت ان کے لیے جواب دینا بہت آسان ہو جائے گا، الجھن نہیں ہو گی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا اعزاز:

﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾﴾

ہم نے پہاڑ ان کے ساتھ مسخر کر دیے تھے، وہ صبح وشام ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے- ''عَشِيِّ'' کہتے ہیں ظہر سے لے کر آئندہ دن کے طلوعِ صبح تک کو اور ''اِشْرَاقِ'' کہتے ہیں جب سورج نکل کر روشنی پھیل جائے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ''وَالْاِشْرَاقِ'' سے صلوٰۃ الضحیٰ:

چاشت کے نوافل پر استدلال کیا ہے۔ اشراق کے نوافل الگ ہیں، چاشت کے نوافل الگ ہیں۔ سورج نکلنے کے پندرہ منٹ بعد یہ دو نوافل اشراق کے ہوتے ہیں اور تقریباً دو گھنٹے بعد یہ صلوٰۃ الضحیٰ یعنی چاشت کے نوافل ہوتے ہیں، یہ دو سے لے کر بارہ تک ہیں لیکن سب سے مناسب یہ ہے کہ آدمی چار رکعات پڑھے۔

میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ جب کوئی حدیث یا کوئی مسئلہ پڑھ لیں تو زندگی بھر عمل کی نیت کریں اور ایک دفعہ ضرور پڑھ لیا کریں۔ سبق سے فارغ ہوں تو ایک بار چار رکعات صلوٰۃ الضحیٰ کی نیت سے پڑھ لیں اور اللہ سے دعا مانگیں کہ اے اللہ! مجھے مستقل معمول بنانے کی توفیق عطا فرما۔ یہ احادیث صرف بیان کے لیے نہیں ہوتیں، عمل کے لیے ہوتی ہیں۔

فصل الخطاب کا معنیٰ:

﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿٢٠﴾﴾

ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت کو مضبوط کر دیا تھا، انہیں حکمت بھی دی تھی اور "فصل الخطاب" بھی دیا تھا۔

﴿فَصْلَ الْخِطَابِ﴾ یعنی الخطاب الفاصل۔ یہ اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کی قبیل سے ہے۔ خطاب فاصل ایسا خطاب جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے۔ اللہ نے یہ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔ یہ جو ہم تقریر میں خطبہ پڑھنے کے بعد کہتے ہیں: "أَمَّا بَعْدُ!" اس کی ابتدا حضرت داؤد علیہ السلام نے کی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان:

﴿وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿٢١﴾﴾

حضرت داؤد علیہ السلام عبادت میں مشغول تھے۔ دو آدمی اچانک دیوار

پھلانگ کر آئے اور کہا کہ ہمیں ایک مسئلہ بتائیں اور ساتھ ہی یہ کہا کہ زیادتی نہ کرنا، مسئلہ ٹھیک بتانا! اب دیکھو! یہ ان کا کتنی بے ادبی کا طرز ہے۔ مسئلہ کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ میرے بھائی کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہے، یہ کہتا ہے کہ یہ ایک بھی مجھے دے دو۔ تو جس کی ننانوے ہیں وہ مدعی ہے اور جس کے پاس ایک ہے وہ مدعیٰ علیہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا کہ اس نے بہت بڑی زیاتی کی ہے جو تیرے پاس ایک دنبی ہے وہ بھی مانگی ہے، اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا- اور اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے حق کو چھینتے رہتے ہیں- اتنی بات کی تو حضرت داؤد علیہ السلام کو اچانک خیال آیا کہ میرا تو امتحان ہو گیا، اللہ سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گئے۔ یہ ہے پورا واقعہ۔

واقعہ کی پہلی توجیہ:

اب یہ جو دو بندے آئے تھے یہ کون تھے؟ یہ انسان تھے یا فرشتے تھے جو انسانی شکل میں آئے تھے؟ اگر تو یہ انسان تھے تو اب اس کا مطلب ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے گھر کا ماحول ایسا بنایا ہوا تھا کہ اوقات تقسیم کیے ہوئے تھے، چوبیس گھنٹے گھر میں کوئی نہ کوئی عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اللہ رب العزت سے عرض کیا: یا اللہ! چوبیس گھنٹے ہمارے گھر میں آپ کی عبادت ہوتی ہے۔ داؤد علیہ السلام کا یہ جملہ ٹھیک تھا لیکن اس کا طرز مناسب نہیں تھا یعنی بظاہر طرز سے یوں لگتا تھا کہ جیسے بندہ جتلا رہا ہو کہ ہم آپ کی بہت عبادت کر رہے ہیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: یہ ہماری توفیق سے ہے، ایک دن ہم آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیں گے تو پھر دیکھیں گے کہ چوبیس گھنٹے عبادت ہوتی کیسے ہے۔

اب ایک دن داؤد علیہ السلام کی عبادت کا وقت تھا کہ اچانک دو بندے آئے۔ آپ سے مسئلہ پوچھا اور مسئلہ پوچھ کر چلے گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام سوچنے

لگے اوہو! یہ جو میں نے کہا تھا کہ ہر وقت آپ کی عبادت ہوتی ہے، اب اس وقت تو عبادت ختم ہوگئی، یہ میں کس جھگڑے میں پڑ گیا ہوں۔ پھر فوراً داؤد علیہ السلام سجدے میں گر گئے کہ اللہ! تو مجھے معاف فرمادے، آپ کی توفیق کے بغیر کوئی عبادت نہیں کر سکتا۔

واقعہ کی دوسری توجیہ:

کوئی سائل کسی بڑے آدمی سے مسئلہ پوچھے تو اب اس بندے کا امتحان ہوتا ہے کہ یہ تحمل سے جواب دیتا ہے یا غصہ ہوتا ہے؟ جب ان دو سائلوں نے ایسا بے جا طرز اختیار کیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے تحمل سے جواب دیا غصہ نہیں ہوئے۔ گویا اس امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن اگلا مسئلہ یہ تھا کہ داؤد علیہ السلام نے فرمایا:

﴿لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ﴾

کہ اس شخص نے تیری دنبی کو اپنی دنبیوں کے ساتھ ملانے کا مطالبہ کر کے تجھ پر ظلم کیا ہے! دیکھیں مظلوم کو خطاب کیا اس بندے نے تیرے اوپر ظلم کیا ہے جو تیری ایک دنبی تھی وہ بھی لے رہا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خطاب مظلوم کو نہیں بلکہ ظالم کو کرنا چاہیے تھا کہ تو نے غلط کیا جو اس کی ایک دنبی بھی لے لی۔ اس طرز کو داؤد علیہ السلام سمجھے کہ یہ تو مجھ سے لغزش ہوگئی ہے، فوراً سجدے میں گر گئے کہ یا اللہ! مجھے معاف فرما!

واقعہ کی تیسری توجیہ:

بعض مفسرین نے اس واقعہ کا ایک مطلب یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں کسی شخص نے ایک جگہ پیغامِ نکاح بھجوایا اور داؤد علیہ السلام نے بھی وہاں پیغامِ نکاح بھجوا دیا تو اس کو بڑی تکلیف ہوئی کہ پیغامِ نکاح پر پیغامِ نکاح کیوں

بھیجا؟ حالانکہ یہ جائز تھا، ناجائز نہیں تھا لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جو بڑوں کی شان کے لائق نہیں ہوتیں۔ تو اس پر پھر دو فرشتے آئے فرضی قضیہ لے کر بندوں کی شکل میں کہ یہ بتاؤ کہ اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہے، یہ کہتا ہے کہ یہ بھی مجھے دے دو! حضرت داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ تو مجھے سمجھانا مقصود ہے۔ یا اللہ! تو مجھے معاف فرما دے یعنی میرے پاس تو بیویاں پہلے سے ہیں، اس کے پاس نہیں ہے اور جہاں یہ کرنا چاہتا ہے وہاں میں نے پیغامِ نکاح بھجوایا! تو سجدے میں گر گئے، حالانکہ یہ کوئی ناجائز کام تو نہیں تھا بالکل جائز تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا رجوع الی اللہ:

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۩﴾

حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ اس واقعے سے ہم نے ان کو آزمایا ہے تو انہوں نے اپنے رب سے مغفرت مانگی اور سجدے میں گر گئے اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔

یہاں یہ بات سمجھیں۔ ﴿وَخَرَّ رَاكِعًا﴾ حضرت داؤد علیہ السلام سجدے میں گر گئے۔ یہاں اللہ لفظ "رَاكِعًا" لائے ہیں حالانکہ "سَاجِدًا" ہونا چاہیے تھا تو یہاں سجدے پر رکوع کا اطلاق ہوا ہے۔ اس سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلے کا استنباط فرمایا ہے کہ اگر آدمی دورانِ نماز آیت سجدہ پڑھ لے اور اس کے بعد رکوع میں چلا جائے اور رکوع میں سجدے کی نیت کرے تو سجدہ ادا ہو جائے گا، کیونکہ اللہ نے سجدے پر رکوع کا لفظ استعمال کیا ہے۔

رکوع سے سجدہ تلاوت کی ادائیگی کی شرائط:

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ لیں۔ اگر کوئی شخص دورانِ نماز آیت سجدہ تلاوت

کرے تو اس کو سجدے میں جانا چاہیے، نماز کے دوران سجدہ کرے، پھر کھڑا ہو کر اگلی تلاوت کرے، مستحب تو یہی ہے لیکن اگر آیتِ سجدہ پڑھنے کے بعد سجدہ میں نہ گیا بلکہ رکوع میں چلا گیا تو سجدہ تلاوت رکوع میں ادا ہو جائے گا لیکن اس کے لیے کچھ شرطیں ہیں:

پہلی شرط... یہ ہے کہ آیتِ سجدہ کے فوراً بعد یا تین آیات کی تلاوت کرنے سے پہلے رکوع کرے۔ اگر تین آیات کے بعد رکوع کیا اور اس میں سجدے کی نیت کی تو سجدہ ادا نہیں ہو گا۔

دوسری شرط... اگر آیت سجدہ تلاوت کی اور سجدہ میں چلا گیا تو سجدہ ادا ہو جائے گا اگرچہ سجدے کی نیت نہ کی ہو لیکن اگر رکوع میں چلا گیا تو رکوع میں سجدہ تب ادا ہو گا جب رکوع میں اس نے سجدے کی نیت کی ہو کیونکہ سجدے میں نیت کرے نہ کرے سجدہ ہو گیا ہے لیکن رکوع میں تب ہو گا جب نیت کی ہو۔

اب اس پر میں بطورِ استشہاد کے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ اسے کہتے ہیں "النظائر" جیسے "الاشباہ والنظائر" مستقل ایک کتاب ہے۔ جس طرح آدمی وضو کرے اور طہارت کی نیت نہ کرے تو وضو تب بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر مٹی سے تیمم کرے اور طہارت کی نیت نہ کرے تو طہارت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ کہ مٹی پاکیزگی کے لیے نہیں ہے اور پانی ہے ہی طہارت کے لیے۔ تو یہاں بھی سجدہ ہے ہی سجدے کے لیے، نیت نہ کرے تب بھی ہو جائے گا لیکن رکوع؛ رکوع ہوتا ہے سجدہ نہیں ہوتا، نیت کرے گا تو ہو گا نیت نہیں کرے گا تو نہیں ہو گا۔

اس کو بطورِ نظیر کے کسی نے پیش کیا یا نہیں کیا لیکن ہم نے پیش کر دیا ہے اور میں آپ کے سامنے اس کی اس لیے وضاحت کرتا ہوں تاکہ آپ اس پر دل چھوٹا نہ کیا کریں کہ اس سے کسی اور نے تو استدلال نہیں کیا تو آپ کیوں کہتے ہیں؟ اگر کسی اور نے

نہیں کیا تو بھائی ہم نے تو استدلال کر لیا ہے۔ اب بعد والے اس کو پڑھیں گے تو وہ تو کہیں گے کہ مولانا نے استدلال کیا ہے!

میں اس لیے سمجھاتا ہوں کہ مسئلہ کبھی تبدیل نہ کرنا! مسئلہ وہی بتانا جو ہمارے مشائخ نے لکھا ہو۔ اس مسئلہ پر اگر مشائخ نے دس دلائل دیے ہیں اور ہم نے بارہ دے دیے ہیں تو اس میں الجھن کی کون سی بات ہے؟! مزید دلیل کا پیش کرنا تو کوئی الجھن کی بات نہیں ہے، ہاں البتہ مسئلے کو تبدیل کرنا یہ غلط بات ہے۔

قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ رکھنا:

﴿وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ﴾... اس آیت کو میں بطورِ استشہاد کے ایک اور مسئلہ پر پیش کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی کے جانور میں عقیقہ کا حصہ ڈالنا چاہے تو یہ جائز ہے، اس پر ہمارا استدلال یہ ہے کہ ایک روایت ہے عقیقہ کے بارے میں اور ایک روایت ہے قربانی کے بارے میں۔ جو روایت قربانی کے بارے میں ہے اس میں ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَنَسَكَ نُسُكَنَا فَقَدْ أَصَابَ النُّسُكَ.

کہ جس نے نماز پڑھی اور پھر جانور ذبح کیا تو اس نے قربانی کی ہے۔

وَمَنْ نَسَكَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَتِلْكَ شَاةُ لَحْمٍ.

اور جس نے قربانی نماز سے پہلے کر دی تو اس نے گوشت تو کھا لیا لیکن اس کی قربانی نہیں ہوئی۔[48]

تو یہاں قربانی پر لفظ ”نسک“ استعمال ہوا ہے۔ عقیقے کے بارے میں فرمایا: ”مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ“ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو، ”فَأَحَبَّ أَنْ يَنْسُكَ عَنْهُ“ اور

48۔ صحیح البخاری، رقم:983

وہ اس کا عقیقہ کرنا چاہے، "فَلْيَنْسُكْ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ" تو اگر لڑکا ہو تو دو بکریاں کرلے اور اگر لڑکی ہو تو ایک بکری کرلے۔[49]

اب دیکھو! یہاں عقیقے کے بارے میں لفظ "نسک" آیا ہے جس طرح قربانی کے لیے لفظ "نسک" ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر عقیقہ کا حصہ قربانی کے جانور میں ڈالنا چاہیں تو ڈال سکتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ جو لفظ قربانی کے لیے ہے وہی لفظ عقیقہ کے لیے ہے۔ یہ تو ہمارے فقہاء نے دلائل دیے ہیں جو ہمارے متخصصین قربانی کے مسائل والی فائل میں پڑھ چکے ہیں۔

میں اس آیت کو بطورِ استشہاد کے اس مسئلہ پر پیش کر رہا ہوں کہ قربانی کے جانور میں عقیقے کا حصہ ڈالنا جائز ہے، کیونکہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اگر نماز میں آدمی آیتِ سجدہ تلاوت کرے اور رکوع میں نیت سجدے کی کرے تو سجدہ ادا ہو جائے گا۔ دلیل "رَاكِعاً" ہے کہ سجدہ پر لفظ رکوع کا استعمال ہوا ہے۔ اب اس آیت کو بطورِ استشہاد اس مسئلے پر کسی نے پیش کیا ہے یا نہیں یہ میرے علم میں نہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اس آیت کو بطورِ مثال کے اس مسئلے پر پیش کر سکتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر:

﴿وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝۳۰ۭ﴾

حضرت داؤد علیہ السلام کو ہم نے سلیمان بیٹا دیا، وہ بہت اچھے آدمی تھے، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام جہاد فرماتے تھے۔ آپ نے گھوڑے منگوائے دیکھنے کے لیے، بہت خوش ہوئے، فرمایا: ﴿رُدُّوْهَا عَلَيَّ﴾ دوبارہ پھر لاؤ! پھر لائے گئے

49۔ سنن ابی داؤد، رقم: 2842

تو ان گھوڑوں کو چیک کرتے کرتے سورج غروب ہو گیا اور عصر کی نماز فوت ہو گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بہت روئے، اللہ سے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ اب یہ گناہ نہیں ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا گھوڑوں کو چیک کرنا بھی عبادت تھی، مشغول اتنے ہوئے کہ خیال نہیں رہا کہ میں نے نماز پڑھنی ہے۔

﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾[50] حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے وہ بھی گناہ نہیں ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھول گئے تو بھی گناہ نہیں ہے لیکن پیغمبر کی شان ایسی ہے کہ نبی اس پر بھی استغفار کر لیتا ہے۔

دینی مشغولیت کی وجہ سے نماز قضا ہونا:

اب غزوہ خندق کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصر کی نماز چلی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں قضا کی اور پھر آپ نے کفار کے لیے بد دعا کی۔ فرمایا:

"مَلَأَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا كَمَا شَغَلُوْنَا عَنْ صَلَاةِ الْوُسْطٰى." [51]

یہاں دیکھیں! نماز قضا ہوئی نہیں قضا کروائی ہے تاکہ امت کو مسئلہ سمجھ آئے کہ بسا اوقات دین کی مشغولیت میں نماز قضا ہو سکتی ہے جیسے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے قضا ہوئی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سوتے ہیں تو آپ کا دل جاگتا ہے لیکن اس کے باوجود لیلۃ التعریس میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اور سارے صحابہ کی نماز چلی گئی۔ رات کا آخری پہر تھا، سب سونے لگے۔ کچھ وقت کے بعد صبح صادق ہونی تھی اور پھر

50۔ طٰہٰ:115:20

51۔ صحیح البخاری، رقم:4111

آگے سورج نکلنا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں نماز کے لیے کون اٹھائے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں! سارے سو گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جدھر سے سورج نے نکلنا تھا اس طرف منہ کیا اور کجاوے کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھے، ان پر بھی نیند غالب آ گئی اور آپ سو گئے۔ جب سورج نکلا سب بیدار ہوئے تو حضور نے پوچھا: بلال! کیا ہوا؟ کہا کہ جس اللہ نے آپ کو سلایا اس نے مجھے بھی سلا دیا۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نماز کیوں قضاء ہوئی تو یہ تکویناً ہوا ہے تاکہ آئندہ کبھی دینی مشغولیت کی وجہ سے استاد شاگردوں سمیت ایسا واقعہ ہو جائے تو اس پر طنز نہیں کرنا! ہاں تمہاری سستی کو دخل نہ ہو لیکن اگر پھر بھی ایسا ہو جائے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایسے ہو گیا تھا تاکہ کل ایسا معاملہ پیش آئے تو امت کو مسئلہ سمجھ آ جائے۔ ایک ہے کہ زبان سے فرماتے کہ یوں قضا کرو اور ایک ہے کہ عمل سے بتایا کہ یوں اذان دو، یوں تکبیر پڑھو! تو مسئلہ سمجھ آ گیا۔

گھوڑوں کی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے کی توجیہات:

﴿فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿٣٣﴾﴾

جب نماز قضا ہو گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ گھوڑوں کو دوبارہ لاؤ! دوبارہ لائے تو آپ علیہ السلام نے گھوڑے ذبح کر دیے کہ ان کی وجہ سے میری نماز قضا ہو گئی ہے۔ اب اس پر اشکال یہ ہے کہ نماز تو قضا ہو گئی ہے اس میں گھوڑوں کا کیا قصور تھا، ان کو کیوں ذبح کیا؟

ہم کہتے ہیں کہ اس میں اشکال کی بات ہی نہیں ہے کیونکہ گھوڑے ان کی ملکیت تھے، اپنے گھوڑے ذبح کرنا کون سی حرج کی بات ہے؟ پھر اس دور میں جیسے گائے اور بھینس کا کھانا جائز تھا گھوڑے کا کھانا بھی جائز تھا۔ اور بعض حضرات نے اس کا معنی بہت اچھا کیا ہے کہ ﴿رُدُّوْهَا عَلَيَّ﴾ سلیمان بہت خوش ہوئے، فرمایا: ان کو واپس

لاؤ، واپس؛لایا گیا﴿فَطَفِقَ مَسۡحًۢا بِالسُّوۡقِ وَ الۡاَعۡنَاقِ﴾ آپ نے ان کی گردنیں نہیں کاٹی تھیں بلکہ محبت کی وجہ سے خوش ہو کر ان کی گردن اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرتے رہے اور یہ خوشی اس وجہ سے نہیں تھی کہ میرے پاس مال ہے بلکہ اس وجہ سے تھی کہ میں ان سے جہاد کروں گا، یہ دین کے کام آئیں گے۔ تو دینی امور کی وجہ سے بندے کا خوش ہونا یہ پیغمبر کی شان ہے۔

خود پر سزا مقرر کرنا:

اب یہ مستقل مسئلہ ہے کہ اگر کسی آدمی سے کسی معاملہ میں سستی یا کوتاہی ہو اور وہ اپنے نفس کے لیے سزا متعین کر لے تو جائز ہے یا نہیں؟ صوفیاء کے نزدیک جائز ہے اور ان کی اصطلاح میں اس کو "غیرت" کہتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک صحابی حضرت ابو جہم رضی اللہ عنہ نے ایک شامی چادر پیش کی جس پر کچھ پھول بنے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی۔ بعد میں کہا کہ عائشہ! چادر ابو جہم کو واپس دے دو، نماز کے دوران پھولوں پر میری نظر پڑی تو مجھے کھٹکا لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے میری نماز میں غفلت آنا شروع ہو جائے۔

صحابی رسول ہیں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ، اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے ہیں اور باغ میں پرندے کو دیکھا تو اسی کی طرف دیکھنے لگ گئے۔ نماز کے بعد کہا کہ میرا باغ صدقہ ہے، اس کی وجہ سے نماز کی طرف میرا دھیان نہ رہا! تو اپنے نفس کو ایسی سزائیں دینا جائز ہے گناہ نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش:

﴿وَ لَقَدۡ فَتَنَّا سُلَیۡمٰنَ وَ اَلۡقَیۡنَا عَلٰی کُرۡسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾﴾

اس آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک اور آزمائش کا ذکر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سوچا کہ میں آج رات اپنی تمام بیویوں کے پاس جاؤں گا، ان سے بیٹے پیدا ہوں گے جو اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے۔ اس وقت آپ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے۔ اللہ رب العزت کو اپنے نبی کی یہ بات پسند نہ آئی۔ تمام ازواج میں سے صرف ایک بیوی سے بچہ پیدا ہوا اور وہ بھی مردہ اور آدھا دھڑ نہیں تھا۔ تو کسی خادمہ نے لا کر حضرت کے سامنے کرسی پر ڈال دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس پر تنبہ ہوا کہ میں نے ان شاء اللہ نہیں کہا یہ اس کا نتیجہ ہے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی طرف رجوع فرمایا اور استغفار کیا۔

امارت طلب کرنا کب جائز کب ناجائز؟

سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی:

﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾﴾

اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی حکومت دے کہ میرے بعد کسی کو ایسی حکومت نہ ملے۔ اور واقعتاً سلیمان علیہ السلام کے بعد کسی کو ایسی حکومت نہیں ملی کہ جس کی حکومت جنات پر بھی ہو، پرندوں پر بھی ہو، چرندوں پر بھی ہو، ہوائیں بھی اس کے تابع ہوں، ایسی حکومت اللہ نے ان کو دی۔

اس پر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ سے حکومت مانگی ہے جبکہ حدیث مبارک میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ”لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا“ کہ کوئی امارت طلب نہ کرنا، کیونکہ اگر مانگنے سے تمہیں کوئی عہدہ کوئی امارت ملی تو تم جانو اور امارت جانے، اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہیں

آئے گی، "وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا" اور اگر مانگے بغیر کوئی امارت ملی تو اللہ کی طرف سے تمہیں مدد ضرور ملے گی۔[52]

اس سے پتا چلا عہدہ اور امارت طلب نہیں کرنی چاہیے۔

اس کا جواب سمجھ لیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ آدمی کو صرف عہدہ کا طالب نہیں ہونا چاہیے، باقی سلیمان علیہ السلام کا مانگنا اس لیے تھا تاکہ اس کے ذریعے دین کا نفاذ ہو، تو اگر مقصد دین کا نفاذ ہو تو پھر اللہ سے حکومت مانگنا جائز ہے اور جب مقصد دین کا نفاذ نہ ہو پھر حکومت مانگنا جائز نہیں ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام:

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ۝۴۱﴾

حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ستر سال صحت کی زندگی دی۔ پھر امتحاناً اللہ تعالی نے سات سال بیماری دی۔ بیماری اتنی سخت تھی کہ سارے خاندان والے چھوڑ گئے۔ سات بیٹے تھے اور سات بیٹیاں تھیں وہ بھی انتقال کر گئے، تنہا بیوی رہ گئی، وہ مزدوری کر کے حضرت ایوب علیہ السلام کو کھلایا کرتی تھیں، ان کی بیوی کا نام لیّاہ تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کی پوتی یا بیٹی تھیں۔ ایوب علیہ السلام کی بیوی نے ان کی بہت خدمت کی، اور عجیب بات یہ ہے کہ سات سال کی بیماری میں حضرت ایوب علیہ السلام نے کبھی صحت کی دعا نہیں مانگی، صبر کی انتہا ہے، کبھی بیوی کہتیں کہ آپ اللہ سے دعا مانگیں اللہ آپ کو صحت دے دیں۔ فرماتے: ستر سال اس نے صحت دی ہے، سات سال بیماری دی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ مجھے اللہ سے دعا مانگتے بھی حیا آتی ہے

52۔ صحیح مسلم، رقم:1652

حالانکہ دعامانگنی چاہیے غلط نہیں ہے۔

ایک دن شیطان انسانی شکل میں طبیب کے روپ میں ان کی بیوی سے ملا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی نے کہا کہ میرے شوہر کے لیے کوئی دوائی دو، ان کو صحت مل جائے۔ اس نے کہا کہ میں علاج کرتا ہوں، یہ ٹھیک ہو جائیں گے لیکن میری ایک شرط ہے، اگر یہ ٹھیک ہو جائیں تو تُونے کہنا ہے کہ تو نے ان کو شفا دی ہے، میں اس کے علاوہ کوئی اجرت نہیں لوں گا۔ انہوں نے جا کر ایوب علیہ السلام کو بتایا کہ مجھے ایک بندہ ملا اور اس نے یوں کہا۔ ایوب علیہ السلام نے کہا: بھلی مانس! وہ تو شیطان تھا تو اس کی باتوں میں آگئی ہے۔ اس پر آپ کو بہت دکھ ہوا کہ دیکھو میری بیماری کی وجہ سے شیطان اتنا جری ہو گیا ہے کہ اب وہ میری بیوی سے یہ کفریہ کلمات کہلوانا چاہتا ہے۔ تو حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھا کر فرمایا کہ اگر اللہ نے مجھے شفا عطا فرمائی تو میں تجھے سو چھڑیاں ماروں گا۔

آپ بہت پریشان ہوئے اور پریشانی میں اللہ سے دعا کی کہ اللہ مجھے صحت دے دیں، اب خدشہ ہے کہ ہمارے گھر میں کہیں ایسی چیزیں نہ آجائیں جن سے دین کا نقصان ہو۔

اللہ پاک کی طرف سے وحی آگئی کہ زمین پر ایڑی ماریں، پانی کا ایک چشمہ نکلے گا، اس پانی سے غسل بھی کریں اور اس کو پئیں بھی! آپ نے غسل بھی کیا اور پانی کو پیا بھی تو ٹھیک ہو گئے۔ اللہ نے جنت سے ایک لباس عطا فرمایا۔ آپ وہ پہن کر اسی جگہ کے قریب بیٹھ گئے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی اہلیہ آئیں تو حضرت ایوب علیہ السلام جنتی لباس پہن کر حالت صحت میں بیٹھے تھے، انہوں نے آکر پوچھا: یہاں میرے بیمار شوہر بیٹھے تھے، اب وہ کدھر گئے؟ وہ بہت پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو میں ہی

ہوں۔ کہا کہ کیوں مذاق کرتے ہو؟ کہا کہ ذرا پہچانو مجھے! انہوں نے پھر کچھ باتیں کیں تو پہچان گئیں۔

اب اللہ رب العزت نے قسم پوری کرنے کا طریقہ بتا دیا کہ ان کو سو چھڑیوں کا ایک گٹھا بنا کر ماریں۔ بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ قمچیاں کیا ہے اور بعض نے سینکیاں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ تو فرمایا کہ گٹھا بنا کر اس کو مار دو تو تمہاری قسم بھی پوری ہو جائے گی اور اس کو زیادہ تکلیف بھی نہیں ہو گی۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ﴾ [53]

ہم نے ان کی دعا کو قبول کیا، ان کی بیماری کو بھی دور کر دیا، ان کو ان کے گھر والے بھی دے دیے اور اتنے لوگ اور بھی دیے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ سات بیٹے اور سات بیٹیاں اللہ نے اور بھی دیں اور جو فوت شدہ تھے خدا نے ان کو بھی زندہ کر دیا۔ اللہ نے کچھ عرصہ امتحان لیا پھر اللہ نے کامیابیاں عطا کیں۔ اس لیے مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ بہتر تفسیر یہی ہے کہ جو بچے ان کے فوت ہو چکے تھے وہ بھی زندہ ہو گئے اور اللہ نے مزید بھی دیے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو حیلہ کی تعلیم:

﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ﴾

آج بھی مسئلہ یہی ہے کہ اگر کوئی شخص سو چھڑیاں مارنے کی قسم کھائے تو سو باریک شاخیں اکٹھی کرے اور گٹھا بنا کر مار دے، لیکن دو شرطیں ہیں:

- پہلی کہ وہ سو کی سو طولاً یا عرضاً اس شخص کے بدن کو لگیں۔

53۔ الانبیاء 84:21

❖ دوسری کہ اس سے بندے کو کچھ نہ کچھ تکلیف بھی ہو۔

توجو حکم اس وقت تھا وہ حکم آج بھی ہے، یوں اس کی قسم پوری ہو جائے گی۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھیں۔ وہ یہ کہ انہوں نے فرمایا تھا کہ میں سو چھڑیاں ماروں گا اللہ رب العزت نے ایک حیلہ بتا دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں حیلہ کا جواز ہے، لہذا حیلے کا انکار نہ کرو لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اگر حیلہ سے مقصود نرمی ہو... آسانی ہو... شریعت پر عمل ہو... تو پھر جائز ہے اور اگر حیلہ سے مقصود حکمِ شرعی کا ابطال ہو پھر جائز نہیں ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں قسم کا اصلی تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی زوجہ مطہرہ کو پوری سو قمچیاں ماریں لیکن چونکہ ان کی زوجہ مطہرہ بے گناہ تھیں اور انہوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بے مثال خدمت کی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک حیلہ کی تلقین فرمائی اور یہ تصریح کر دی کہ اس طرح ان کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اس لیے یہ واقعہ حیلہ کے جواز کی دلیل ہے۔

جیسا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا قصہ مشہور ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ السلام کی خدمت میں گوشت پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ گوشت ہے جو حضرت بریرہ کو صدقہ میں دیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ان کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔ اب ٹھیک ہے کوئی حرج نہیں ہے۔[54]

جائز اور ناجائز حیلوں کی تفصیل:

اور ایسا حیلہ جس سے حکمِ شرعی کو باطل کرنا مقصود ہو تو وہ جائز نہیں ہے۔

54۔ سنن ابی داؤد، رقم: 1655

مثلاً ایک آدمی کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں، اس پر زکوٰۃ فرض ہے، یہ پیسے اس کو یکم شوال کو ملے تھے۔ وہ آئندہ بیس رمضان کو وہ پانچ لاکھ روپے بیوی کو ہدیہ دے دے اور دس شوال کو بیوی اس کو ہدیہ دے دے تو زکوٰۃ تو فرض نہیں ہوگی کیونکہ مال پر ایک سال گزرنا فرض ہے، ایک سال تو گزرا نہیں ہے تو زکوٰۃ کیسے فرض ہوگی؟ لیکن یہ جو حیلہ کیا گیا ہے حکمِ شرعی کو باطل یعنی زکوٰۃ کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا ہے اس لیے یہ حیلہ جائز نہیں ہے۔

قیامت بہت بڑی خبر ہے:

﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰۤى اِلَيَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾﴾

آپ فرما دیجیے کہ یہ قیامت تو بہت بڑی خبر ہے جس سے تم منہ پھیر رہے ہو- اس کو ماننے سے انکار کر رہے ہو- مجھے تو عالمِ بالا کی کچھ خبر نہیں جس وقت وہاں گفتگو کر رہے تھے- اللہ رب العزت نے سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ کیا آپ ایسے بندے کو خلیفہ بنائیں گے کہ جو خون ریزی کرے گا اور فساد مچائے گا۔ یہ ہے ﴿اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ﴾ کہ ملائکہ کا اختصام اور گفتگو ہو رہی تھی اس کے متعلق حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ آپ فرمائیں کہ میں تو وہاں موجود ہی نہیں تھا اس کے باوجود میں تمھیں بتا رہا ہوں، اس سے ثابت ہوا کہ یہ وحی ہے۔

تخلیقِ آدم اور فرشتوں کو سجدہ کا حکم:

﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿٧١﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ

﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۷۲﴾﴾

جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ نبی بشر ہوتا ہے اور یہ سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کی بات ہو رہی ہے۔ جب آدم علیہ السلام کا بدن ٹھیک کر لوں اور اس میں اپنی روح ڈال دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا! اس سے معلوم ہوا کہ نبی وہ جسم ہے جس میں روح ہو، وحی آنا تو شرط ہے وہ تو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

چونکہ آج نئی بحث چل پڑی ہے کہ نبی جسم کو کہتے ہیں یا روح کو؟ ہم کہتے ہیں کہ نبی اس جسم کو کہتے ہیں جس میں روح ہو۔

وفات کے بعد نبی؛ نبی ہوتا ہے کیونکہ نبی اس جسم کو کہتے ہیں جس میں روح ہو! اب دیکھیں کتنا مسئلہ حل ہو گیا۔ نبی وفات کے بعد بھی نبی ہوتا ہے اس کا معنی کہ وفات کے بعد بھی نبی کی روح کا جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تبھی تو نبی ہو گا! اگر روح اور جسم کا تعلق بالکل ختم ہو جائے تو نبی آپ کسے کہیں گے؟ کیونکہ تنہا جسم بھی نبی نہیں تنہا روح بھی نبی نہیں ان دونوں کا مجموعہ نبی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر تک روح اور جسم کا تعلق برقرار رہے گا، یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

کائنات کا سب سے پہلا اجماع:

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾﴾

تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا، اس نے تکبر کیا وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

اس کائنات میں سب سے پہلا اجماع ملائکہ کا ہے اور اجماع کا سب سے پہلا

منکر ابلیس ہے۔ اب جو اجماع کے قائل ہیں وہ ملائکہ کے راستے پر ہیں اور جو اجماع کے منکر ہیں وہ ابلیس کے راستے پر ہیں۔

اور یہ بات اچھی طرح ذہن میں رکھنا! اجماعِ امت معصوم ہوتا ہے، اجماعِ امت میں خطا نہیں ہوتی۔ تو جس طرح فرشتہ معصوم ہوتا ہے اور جس طرح نبی معصوم ہوتا ہے اسی طرح امت کا اجماع بھی معصوم ہے اور معصوم کی جگہ جنت ہوتی ہے جہنم نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ بھی جنتی اور اس کے راستے پر چلنے والے بھی جنتی اور اجماع کا جو مخالف ہے اس کے مخالف ہونے کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: ﴿اِسۡتَكۡبَرَ﴾ اس کی وجہ تکبر ہے۔

﴿وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾... تکبر کیا اور کافر ہو گیا۔ کَانَ؛ صَارَ کے معنی میں ہے یا مطلب یہ ہے کہ "كَانَ فِيۡ عِلۡمِ اللهِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ" اللہ کو پہلے سے علم تھا کہ یہ کافر ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابلیس اتنا بڑا عابد تھا کہ فرشتہ نہ ہو کر بھی فرشتوں میں شمار ہوتا تھا، اور اتنا بڑا عالم تھا کہ اللہ سے بھی دلیل سے بات کرتا، اللہ نے پوچھا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّ﴾ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ ابلیس نے جواب دیا: ﴿اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ؕ خَلَقۡتَنِيۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ﴾ کہ میں آدم -علیہ السلام- سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے بنایا۔ یہ اللہ سے مناظرہ کر رہا ہے اگرچہ دلیل اس کی غلط تھی، آگے یہ بات آئے گی، اور عارف اتنا تھا کہ اللہ نے فرمایا: ﴿فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ﴾ کہ دفع ہو جا تو مردود ہے۔ ابلیس نے کہا: ﴿فَاَنۡظِرۡنِيۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ﴾ مجھے مہلت دے دیں اٹھنے کے دن تک۔ اللہ نے فرمایا: ﴿فَاِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ﴾ جا تجھے مہلت

ہے۔ خدا کے مزاج کو اتنا سمجھتا تھا کہ اللہ حالت غضب میں ہیں اور یہ اس حالت میں اللہ سے مہلت مانگ رہا ہے لیکن اس میں ایک کمی یہ تھی کہ یہ عاشق نہیں تھا، یہ یہاں پھنس گیا تھا۔ جو عاشق ہوتا ہے وہ دلائل نہیں مانگتا، وہ بغیر دلائل کے بات مانتا ہے۔

اس لیے آدمی کو عالم بھی ہونا چاہیے، عارف بھی ہونا چاہیے، عابد بھی ہونا چاہیے اور عاشق بھی ہونا چاہیے۔ عاشق وہ نہیں جسے آپ لوگ عاشق کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [55] جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ پورے قرآن میں اللہ نے لفظ عشق کو استعمال نہیں کیا کیونکہ عرف میں عشق کا استعمال غلط ہوتا ہے بلکہ اللہ نے اس کو "اشد حب" سے تعبیر کیا ہے، بس یہی عشق ہے۔

اللہ نے جب اس سے پوچھا: ﴿اَسْتَكْبَرْتَ﴾ کیا تو نے تکبر کیا ہے؟ ﴿اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ﴾ یا تو ہے ہی بڑا؟ یعنی تو چھوٹا ہو کر خود کو بڑا سمجھتا ہے یا واقعتاً تو بڑا ہے؟ اس نے کہا: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ کہ میں ہوں ہی بڑا، ﴿خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ کیونکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔

اب ایک بات سمجھیں! اس نے کہا کہ میں بڑا ہوں اور دلیل پیش کی کہ میں آگ سے بنا ہوں۔ حافظ ابن قیم نے بدائع الفوائد میں پندرہ دلائل اس پر پیش کیے ہیں کہ مٹی آگ سے بہتر ہے۔ اللہ کو پتا ہے کہ مٹی افضل ہے لیکن خدا نے دلیل کا جواب نہیں دیا، فرمایا: ﴿فَاخْرُجْ﴾ دفع ہو جا! اس سے معلوم ہوا کہ ہر جگہ پر دلیل نہیں ہوتی کبھی بغیر دلیل کے بھی نکال دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں: اس کی ذہن سازی کرو، اس کی

55۔ البقرۃ 165:2

تشفی کراؤ، اس کو بات سمجھاؤ۔ میں نے کہا: بعض کوڑھ مغز ہوتے ہیں، ان کو دلیل نہیں دیتے بس ان کو فارغ کر دیتے ہیں۔

دینی امور پر اجرت کا جواز:

﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾

اللہ فرماتے ہیں: اے پیغمبر! ان سے کہو کہ میں تم سے کوئی پیسہ نہیں مانگتا۔

جو لوگ تعلیمِ دین پر اجرت کے مخالف ہیں وہ اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین بیان کرتے ہیں لیکن پیسے نہیں لیتے اور کہتے ہیں: ﴿مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾

اس آیت کو بطور دلیل پیش کرنا غلط ہے، کیونکہ ہم علماء تنخواہ اپنے مخالف سے نہیں بلکہ اپنے موافق سے لیتے ہیں اور پیغمبر؛ یہ خطاب اپنے موافق کو نہیں بلکہ اپنے مخالف کو کرتا ہے۔ یہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ﴿مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾ کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، یہ کفار سے کہتے تھے یا صحابہ سے کہتے تھے؟ کفار سے کہتے تھے اور ہم تنخواہ کن سے لیتے ہیں؟ مسلمانوں سے۔ یہ تو دلیل بنتی ہی نہیں، اس کا جواب تو بعد کا مسئلہ ہے۔

میں اس لیے آپ سے کہتا ہوں کہ پہلے مسئلہ کی تنقیح کرو، اس کے بعد دیکھو کہ جواب کی حاجت بھی ہے یا نہیں؟ اللہ کے نبی یہ بات صحابہ سے فرماتے تو اب جواب کی ضرورت پڑتی، یہ بات تو آپ نے اپنے مخالفین سے فرمائی ہے۔ لہذا یہ ان لوگوں کی دلیل ہے ہی نہیں، جب دلیل نہیں تو اس کا جواب دینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔

تکلفات کے بجائے سادگی کو رواج دیجیے:

﴿وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝٨٦﴾

فرمایا آپ یہ بھی فرما دیں کہ میں تکلف نہیں کرتا، یہ میرا مزاج نہیں ہے، میں سیدھی سیدھی بات کہتا ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابہ کے اوصاف کے بارے میں بہت پیارا جملہ فرماتے ہیں، میں کئی بار سنایا کرتا ہوں۔

كَانُوا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَبَرَّهَا قُلُوْبًا، وَأَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا.[56]

تین صفتیں عجیب بیان کی ہیں: "أَبَرَّهَا قُلُوْبًا" صحابہ دل کے صاف ہوتے تھے، دل میں میل نہیں تھا۔ "وَأَعْمَقَهَا عِلْمًا" علم بہت گہرا ہوتا تھا۔ "وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا" مزاج میں بے تکلفی ہوتی تھی۔

آج ہمارے دل میں بغض ہے، علم سے کورے ہیں اور مزاج میں تکلفات ہیں، بس اچھے کپڑے پہن کر ہم پیر بننے کی کوشش کرتے ہیں، تقریریں کر کے خطیب بننے کی کوشش کرتے ہیں اور اصلاح کے نام پر غیبت کرتے ہیں۔ اللہ ہم سب کی اصلاح فرمادیں۔ کل ہماری شوریٰ کا اجلاس تھا عشا کے بعد، میں اپنے اراکین شوریٰ سے کہہ رہا تھا کہ ایک بات یاد رکھو! کسی بندے کے بارے میں دل سے بغض ختم کرنا ہو تو اس کے لیے دعا کردو بغض ختم ہو جائے گا۔

ہمارے مخالف سے مخالف لوگ دنیا میں ہیں اور میں قسم کھاؤں تو حانث نہیں ہوں گا کہ میرے دل میں کسی کا بغض نہیں ہے، اس کی وجہ کہ جو میری مخالفت کرتا ہے خدا شاہد ہے میں اس کا نام لے کر دعائیں شروع کر دیتا ہوں اس طرح بغض ختم ہو جاتا ہے، دل میں نفرت نہیں رہتی۔ یہ کام تھوڑا سا مشکل ہوتا ہے لیکن جب آپ شروع کر دیں گے تو ان شاء اللہ طبیعت بن جائے گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

56۔ جامع الاصول فی احادیث الرسول: ج1 ص200 رقم الحدیث

سورة الزمر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿۲﴾﴾

لفظ دین کے معانی:

﴿الدِّیۡنَ﴾ ... یہاں دین کا معنی عبادت ہے۔ بسااوقات دین کا معنی قیامت بھی ہوتا ہے ﴿مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ﴾ اللہ قیامت کے دن کا مالک ہے، اور کبھی دین کا معنی شریعت ہوتا ہے۔ شریعت سے مراد منصوصات؛ وہ عقائد اور اعمال ہیں جو نص میں صراحت سے آئے ہیں، اسے بھی دین کہتے ہیں لیکن یہ تب ہے جب دین کا تقابل مذہب کے ساتھ ہو۔ جب دین کا تقابل دنیا کے ساتھ ہو تو دین سے مراد قیامت ہے، اور جب دین کا تقابل مذہب کے ساتھ ہو تو پھر دین کہتے ہیں منصوصات کو اور مذہب کہتے ہیں اجتہادیات کو۔ یہاں الدین سے مراد عبادت ہے۔

عبادت خالص مطلوب ہے:

﴿اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی﴾

اللہ کے لیے خالص عبادت ہے۔ ملاوٹ والی عبادت اللہ قبول نہیں فرماتے۔
وہ مشرکین جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور پھر ان کی عبادت کرتے، پھر فرشتے کی اپنے خیال کے مطابق ایک تصویر بنالیتے تھے، اس کا بت بناتے پھر اس بت کی پوجا کرتے اور وہ کہتے کہ جس فرشتے کی تصویر کی ہم بت بنا کر پوجا کرتے ہیں اس سے وہ خوش ہوتا ہے، جب خوش ہو گا تو اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرے گا۔ تو فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ﴾ جن لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے معبود بنائے ہوئے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت کرتے ہیں، کیوں؟ ﴿لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ تاکہ یہ ہم کو اللہ کے قریب کریں، اللہ کے ہاں سفارش کریں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ اللہ رب العزت ان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ﴾ اللہ اگر اولاد بنانا چاہتے تو جو اللہ کو مخلوقات میں سے پسند ہوتا وہ بناتے، اللہ رب العزت تو اولاد سے پاک ہیں۔
یہ جو دعوائے شفاعت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان بتوں کی شفاعت ہوگی تو یہ بات سمجھ لیں کہ شفاعت کے لیے دو شرطیں ہیں:

1: شفاعت کرنے والا اللہ کے ہاں مقبول ہو۔

2: جس کی شفاعت ہونی ہے وہ قابلِ مغفرت ہو۔

اگر تو یہ عبادت کرتے جنات شیاطین کی تو وہاں شفاعت کی ایک شرط ختم ہے کہ وہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہیں اور اگر یہ عبادت کریں ملائکہ کی تو ملائکہ اللہ کے ہاں مقبول تو ہیں لیکن یہ لوگ قابلِ مغفرت نہیں کیونکہ یہ مشرک ہیں۔ تو شفاعت میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے؛ جو سفارش کرے وہ مقبول ہو اور جس کی سفارش کی جارہی ہو وہ قابلِ مغفرت ہو۔ مشرک قابلِ مغفرت نہیں ہوتا۔

مویشیوں کے آٹھ جوڑے اتارنے کا معنیٰ:

﴿خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَاَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزۡوَاجٍ ؕ﴾

اللہ نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، انہی سے ان کی بیوی کو پیدا کیا اور اللہ نے مویشیوں میں سے آٹھ قسم کے جوڑے اتارے ہیں۔

یہاں بظاہر یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اللہ نے تم کو ایک جان حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، ان سے ان کی اہلیہ حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا کیا۔ آگے جو یہ فرمایا کہ ہم نے یہ آٹھ قسم کے جوڑے اتارے ہیں، حالانکہ اتارے تو نہیں ہیں۔ تو یہاں کہنا چاہیے تھا: "خَلَقَ" کہ پیدا فرمائے ہیں۔ "اَنۡزَلَ . . يُنۡزِلُ . . اِنۡزَالاً" تب استعمال ہوتا ہے جب چیز اوپر سے نیچے آئے، جانور تو اوپر سے نیچے نہیں آئے تو "اَنۡزَلَ" کیسے کہہ دیا ہے؟

- ♦ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پیدائش کا تعلق پانی سے ہے اور پانی آسمان سے برستا ہے اس لیے اللہ "اَنۡزَلَ" فرما رہے ہیں . . .
- ♦ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ لفظ "اَنۡزَلَ . . يُنۡزِلُ . . اِنۡزَالاً" لا کر اپنی کوئی خاص حکمت بیان کرتے ہیں۔ جیسے ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡمِيۡزَانَ﴾[57]

کہ ہم نے پیغمبروں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتابیں نازل

57۔ الحدید 25:57

فرمائیں اور میزان عدل نازل کیا... اور جب لوہے کی باری آئی تو فرمایا:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾

کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بہت سخت قوت ہے اور منافع بھی ہیں۔

حالانکہ یہاں کہنا چاہیے تھا "اَنْشَاْنَا الْحَدِيْدَ" کہ ہم نے لوہے کو پیدا کیا ہے، "اَنْشَاْنَا" کے بجائے "اَنْزَلْنَا" لفظ کیوں استعمال کیا، اسلوب بدلا ہے یہ بات سمجھانے کے لیے کہ جس طرح تم کتاب کو آسمانی کتاب کا درجہ دیتے ہو تو لوہے کو جہاد میں آسمانی لوہے کا درجہ دینا! پھر اس کی اہمیت تمہارے ذہنوں میں آئے گی اور تم اس کا صحیح استعمال کروگے۔

اور یہاں ﴿وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ﴾ فرما کر اللہ نے اپنی خاص قدرت بیان فرمائی۔ عام طور پر زمین سے پیدا ہونے والی چیز کی نسبت بسا اوقات انسان اپنی طرف کرتا ہے... یہ باغات میرے ہیں، یہ گندم میری ہے، یہ کام میں نے کیا ہے لیکن جب آسمان سے پانی برستا ہے تو کوئی نہیں کہتا کہ یہ میرا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے برسایا ہے۔ تو اپنی خاص قدرت بتانے کے لیے ﴿وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ﴾ فرمایا، گویا یہ ایسے ہے کہ ہم نے اتارا ہے، ان جانوروں کی پیدائش میں تمہیں رتی برابر دخل نہیں ہے۔

تین اندھیروں میں انسانی تخلیق:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾

اللہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تین قسم کے اندھیروں میں ایک سے دوسرے مرحلے میں سے گزارتا ہے۔

تین قسم کے اندھیروں میں پیدا کرتے ہیں یعنی ایک ماں کا پیٹ ہے، ایک

ماں کا رحم ہے اور ایک پھر مخصوص جھلی ہے جس میں بچہ لپٹا ہوتا ہے۔ تخلیق کے مرحلوں سے کیا مراد ہے؟ کہ پہلے پہل پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے، پھر اس سے خون بنتا ہے، اس کے بعد ایک جما ہوا لوتھڑا اور پھر گوشت ہوتا ہے، اس کے بعد پھر ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یوں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت سے بچہ گزرتا ہے۔

اللہ کی شانِ بے نیازی:

﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۚ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾

اگر تم کفر اختیار کرو تو بے شک اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ اللہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتے۔

یہاں دو باتیں سمجھ لیں: ایک ہوتا ہے ارادہ، ایک ہوتی ہے رضا۔ ارادہ اور چیز ہوتی ہے اور رضا اور چیز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ شر کی پیدائش کا ارادہ فرماتے ہیں تو شر پیدا ہوتا ہے، خیر کی پیدائش کا ارادہ فرماتے ہیں تو خیر پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کے ارادے کے بغیر دنیا میں کسی چیز کو وجود نہیں ملتا لیکن اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوش نہیں ہوتے۔ ایمان بھی اللہ کے ارادے سے پیدا ہوا ہے، کفر بھی اللہ کے ارادے سے پیدا ہوا ہے بندے کے امتحان کے لیے کہ بندہ کفر اختیار کرتا ہے یا ایمان اختیار کرتا ہے لیکن اللہ ایمان کو پسند فرماتے ہیں، کفر کو پسند نہیں فرماتے۔

ارادے اور پسندیدگی میں فرق ہے۔ بسا اوقات لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ پیدا نہ کرتے تو ہم کافر کیوں ہوتے؟ اللہ پیدا نہ کرتے تو ایسا کیوں ہوتا؟ تو کسی چیز کا ارادہ کرنا اور ہے اور کسی چیز کو پسند کرنا اور ہے۔ دونوں چیزوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی گفتگو ہوتی ہے، میں اس کے دوران درجہ کتب کے طلبہ کو اس لیے تخصص کے اسباق میں بٹھاتا ہوں کہ اگرچہ بعض باتیں آپ کو ابھی سمجھ میں نہیں آئیں گی لیکن ذہن میں بٹھائیں، بعد میں فائدہ ہوگا۔

بندہ کسی دوسرے کا بوجھ اٹھائے گا یا نہیں؟ (حلِ تعارض)

﴿وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ﴾

اگر تم اللہ کا شکر کرو گے تو وہ تمہارے لیے اس کو پسند کرتا ہے، کوئی شخص قیامت کے دن کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

اس پر میں پہلے بات کر چکا ہوں کہ یہ جو حدیث پاک میں آتا ہے:

"مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ." [58]

کہ اگر کوئی شخص کسی گناہ کے کام کا رواج ڈال دیتا ہے تو اس کا گناہ بھی اس شخص کو ملے گا اور اس بعد جو اس پر عمل کرے گا اس کا گناہ بھی اس شخص کو ملے گا۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بوجھ اٹھائیں گے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں اٹھائیں گے۔

اس کا جواب سمجھیں! دو چیزیں ہیں؛ ایک یہ ہے کہ انسان خود کفر کرتا ہے، یہ اس کا اپنا فعل ہے اور ایک بندہ کسی کے کہنے پر کفر کرتا ہے۔ تو گناہ دو قسم کے ہیں ایک ہے کفر کیا اور ایک ہے کسی کے کہنے پر کیا۔ تو جو کفر خود کیا اس کا بوجھ خود اٹھائے گا اور جس کے کہنے پر کیا ہے اس کو اس کہنے کا بوجھ بھی اٹھانا پڑے گا۔ ایک بندہ کسی کو اپنے ساتھ چوری پر تیار کرتا ہے۔ اب اس کی چوری کا بوجھ تو خود اٹھائے گا اور جس نے تیار کیا ہے وہ اس کی چوری کا بوجھ نہیں اٹھائے گا لیکن اس نے تیار کر کے گناہ تو کیا ہے تو اب یہ گناہ اس پر ضرور آئے گا۔ تو بعض گناہ ایسے جن جس کا بوجھ اٹھائیں گے اور بعض گناہ ایسے ہیں جن کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے۔

58۔ صحیح مسلم، رقم:1017

اسلام کے لیے شرح صدر:

﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾

اللہ جب کسی شخص کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں تو وہ شخص اللہ کی طرف سے خاص نور اور روشنی پر ہوتا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! شرح صدر کا معنی کیا ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس بندے کے قلب کو وسیع فرمادیتے ہیں۔ اس کا معنی ہے کہ احکامِ شریعت کو سمجھنا اور پھر ان پر عمل کرنا اس بندے کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور! شرح صدر کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا:

اَلْاِنَابَةُ إِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ... جنت کی طرف انسان کا رجوع ہوتا ہے۔

وَالتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ ... اور دنیا کے دھوکے سے بندہ بچتا ہے۔

وَالتَّأَهُّبُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ ... اور موت کے آنے سے پہلے انسان موت کی تیاری کرتا ہے۔[59]

یہ اس کی علامت ہے۔ اللہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

اور جس کا شرح صدر نہیں ہوتا وہ کون ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دل اللہ کے ذکر سے سخت ہو جاتے ہیں۔

اب میں اور آپ خود غور کریں کہ اللہ کا ذکر کرنے سے ہمارا دل خوش ہوتا

59۔ روح المعانی: ج23 ص257

ہے یا تنگ ہوتا ہے؟ اگر تنگ ہو تو استغفار کرنا چاہیے کہ کہیں ہم ﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ میں شامل تو نہیں؟ اس پر غور کریں۔

احسن الحدیث؛ کتاب اللہ

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾

اللہ نے بہترین کلام کو اتارا ہے جو ایسی کتاب ہے جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ اس کتاب سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

کتاب اللہ کی صفات:

اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے اس کی صفتیں ہیں:

پہلی صفت: "مُّتَشَابِهًا" ... اس کا ایک مضمون دوسرے سے ملتا ہے۔

دوسری صفت: "مَّثَانِيَ" .... ایک مضمون کو بار بار لاتے ہیں تاکہ بات دل میں اترے۔

تیسری صفت: "تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ" ... جو اللہ سے ڈرتے ہیں تو ان کے بدن کانپتے ہیں، خوف محسوس کرتے ہیں، ﴿ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾... اور پھر ان کے جسم نرم ہو جاتے ہیں، ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

بار بار اللہ کے ذکر کا تذکرہ آتا ہے اور ہم علماء اور طلبہ کو اس پر بہت غور کرنا

چاہیے۔ قرآن ذکر کی کتنی بات کرتا ہے اور ہم کتنا ذکر کرتے ہیں؟

خشیت اور خوف میں فرق:

ایک لفظ یاد رکھ لیں۔ یہاں ہے: ﴿يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾، خشیت اور خوف میں کیا فرق ہے؟ موذی کی تکلیف کے ڈر کو خوف کہتے ہیں اور عظمت والے کی عظمت کے ڈر کو خشیت کہتے ہیں۔ آدمی سانپ سے بھی ڈرتا ہے اس ڈر کا نام خوف ہے، آدمی کتے سے بھی ڈرتا ہے اس ڈر کا نام خوف ہے اور خشیت کا معنی ہے کسی کی عظمت کی وجہ سے اس سے ڈرنا۔

اب دیکھیں! خشیتِ الٰہیہ کہ ہم اللہ سے ڈرتے ہیں، کیوں؟ اللہ کی عظمت کی وجہ سے۔ درندے سے ڈرتے ہیں، کیوں؟ اس کی ایذاء کی وجہ سے اور اللہ والوں کا رعب یہ عظمت کا ہوتا ہے۔ خشیت اور خوف کے اصل معنی تو یہی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی اس کے خلاف بھی استعمال ہوتا ہے۔

توحید و شرک کی مثال سے وضاحت:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾

یہاں سے اللہ نے مشرک اور موحد کی مثال دی ہے۔ ایک غلام ہے جس میں کئی شریک ہیں اور سارے ضدی ہیں، یہ غلام سوچتا ہے کہ میں کس کی بات کو مانوں، کس کی نہ مانوں؟ اور جو موحد ہے اس کا مالک ایک ہی ہے، اس کو الجھن نہیں ہے۔ تو مشرک ٹینشن میں ہوتا ہے کہ یہ خدا ناراض نہ ہو جائے، وہ خدا ناراض نہ ہو جائے اور موحد کے سامنے ایک ہی خدا ہے، بس وہ راضی ہو جائے تو سب ٹھیک ہے۔ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں لیکن اکثر لوگوں کو اس کا

علم نہیں ہے۔

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ کی تشریح:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿٣٠﴾﴾

یہاں یہ بات یاد رکھ لیں "مَيِّتٌ" اسے نہیں کہتے جس پر موت آ چکی ہو، "مَيِّتٌ" اسے کہتے ہیں جس پر موت آنی ہو۔ اصل معنی "مَيِّتٌ" کا یہی ہے۔

تو یہاں بتایا یہ ہے اے پیغمبر! آپ پر بھی موت آنی ہے اور ان پر بھی موت آنی ہے۔ اب اس آیت کا تعلق پیغمبر کی وفات کے بعد والی حیات سے بالکل نہیں ہے۔ اس لیے بہت سارے مفسرین اس آیت کے تحت اس مسئلے کو چھیڑتے ہی نہیں ہیں لیکن ہمیں کیوں چھیڑنا پڑتا ہے؟ اس لیے کہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو منکر ہے وہ اس آیت سے استدلال کرتا ہے تو پھر ہمیں بھی اس آیت پر بات کرنی پڑتی ہے۔

یہ وضاحت میں کیوں کر رہا ہوں؟ کیونکہ ممکن ہے کہ ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ کے تحت آپ وفات کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا مسئلہ چھیڑیں اور کوئی آپ پر اعتراض کرے کہ کسی مفسر نے اس آیت کے تحت اس مسئلے کو نہیں چھیڑا تو تم کیوں چھیڑتے ہو؟ تو آپ کے پاس جواب ہونا چاہیے کہ پہلے ہمارے مخالف نے اس سے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر استدلال کیا ہے تو ہمیں جواب دینے کے لیے اس کو چھیڑنا پڑتا ہے۔ یہ الجھن کیوں پیش آ رہی ہے؟ اس لیے کہ ہمارے بعض حضرات اعتدال کے نام پر ہم سے ناراض ہوتے ہیں کہ آپ نے کس آیت کے تحت اس مسئلے کو چھیڑ دیا؟ بھائی! یہ ہم لے کر نہیں بیٹھے بلکہ فریق مخالف نے پہل کی ہے۔

جب ایک آدمی اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے خلاف اس آیت کو پیش

کرے گا تو پھر ہم جواب نہیں دیں گے؟! ہاں گزشتہ مفسرین کے دور میں کوئی شخص اس آیت کو اسی مسئلے کے بارے میں پیش کرتا اور وہ جواب نہ دیتے تو پھر آپ کا اعتراض بجا تھا۔ جس دور میں آیت سے غلط استدلال ہو گا تو اسی دور میں جواب دیا جائے گا نا!

اللہ رب العزت اپنے پیغمبر کے لیے ”مَیِّتٌ“ کا لفظ الگ لائے ہیں اور امت کے لیے ”مَیِّتُوْنَ“ کا لفظ الگ لائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی موت الگ ہے اور امتی کی موت الگ ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ اس لیے لفظ الگ الگ لائے ہیں۔

خروجِ روح اور حبسِ روح:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ یہی بات فرماتے ہیں کہ امت کی موت بصورت خروجِ روح ہے اور نبی کی موت بصورت حبسِ روح ہے۔ ہمارا ایک مخالف مناظر تقریر کے دوران میرا نام لے کر گالیاں بھی دے رہا تھا اور ساتھ کہہ بھی رہا تھا کہ اس کو یہ بھی پتا نہیں کہ ”حبس“ کیا ہوتا ہے! یہ ”حبس“ گرمی والی سمجھتا ہے۔ میں نے کہا کہ یار تم کبھی ہمارا بیان ہی سن لیتے، کبھی مثالیں ہی سن لیتے۔ ”خروجِ روح“ کا معنی ہے کہ روح جسم سے نکل جائے اور ”حبسِ روح“ کا معنی ہے کہ روح جسم میں قلبِ اطہر میں سمٹ جائے اور ”بسط“ کا معنی ہے کہ پھر روح دوبارہ پھیل جائے۔

فرمایا چونکہ نبی کی موت الگ ہے، امتی کی موت الگ ہے اس لیے اللہ نبی کے لیے ”مَیِّتٌ“ کا لفظ الگ لائے ہیں اور امت کے لیے ”مَیِّتُوْنَ“ الگ لائے ہیں، اور اس پر پھر قرائن ہیں کہ ان دونوں کی موت میں فرق ہے۔ موت کو نیند اور نیند کو موت کی بہن کہتے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں موت پر نیند کا لفظ استعمال ہوا ہے

جیسے ﴿يٰوَيۡلَنَا مَنۢ بَعَثَنَا مِن مَّرۡقَدِنَا﴾[60]، اسی طرح نیند پر موت کا لفظ استعمال ہوا ہے "اَللّٰهُمَّ بِاسۡمِكَ أَمُوۡتُ وَأَحۡيىٰ" تو موت اور نیند آپس میں بہنیں ہیں۔

نبی و امتی کی نیند اور موت میں فرق:

جب نبی اور امتی کی نیند میں فرق ہے تو نبی اور امتی کی موت میں بھی فرق ہو گا۔ نبی کی نیند یہ ہے کہ ظاہر پر آتی ہے اور قلبِ اطہر بیدار ہوتا ہے۔ نبی کی موت بھی یہ ہے کہ ظاہر پر موت آتی ہے اور قلبِ اطہر میں حیات ہوتی ہے۔ تو دونوں میں فرق ہے۔

نبی اور امتی کی موت میں فرق ہے۔ نبی کی موت کے بعد اس کا مال رشتہ داروں میں بطورِ وراثت تقسیم نہیں ہوتا اور امتی کی موت کے بعد مال وراثت میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مال وراثت میں تقسیم ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ مال مُورِث کی ملک سے نکلے اور ملک سے تب نکلے گا جب روح اور جسم کا تعلق ختم ہو گا۔ امتی کا تعلق ختم ہو جاتا ہے اس لیے مال ملک سے نکل جاتا ہے اور نبی کا تعلق ختم نہیں ہوتا تو مال ملک سے نہیں نکلتا۔ اس لیے امتی کی موت الگ ہے اور نبی کی موت الگ ہے۔

امتی کی وفات کے بعد بیوی کا تعلق شوہر سے ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ بیوی کا تعلق تب ہوتا ہے جب روح اور جسم کا تعلق ہو اور جب روح اور جسم کا تعلق ختم ہو گا تو زوجیت کا تعلق بھی ختم ہو گا اور پیغمبر کی بیوی کا تعلق وفات کے بعد بھی باقی رہتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ ان کی روح اور جسم کا تعلق باقی ہے۔ تو نبی کی موت الگ ہے اور امتی کی موت الگ ہے۔

میں اس کو سمجھانے کے لیے مثال دیتا ہوں کہ جس طرح جلسے کا میزبان جلسے

60۔ یٰسین 52:36

کے بعد اعلان کرے کہ تمام حضرات تشریف رکھیں، آپ کے لیے کھانے کا انتظام ہے۔ اب جو جلسے میں آنے والا خطیب ہے وہ بھی وہیں کھانے کے لیے بیٹھ جائے تو جلسے والے کہیں گے: مولانا صاحب! آپ کا کھانا یہاں نہیں، وہاں لگا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کھانوں میں فرق ہے، سامعین کا کھانا الگ ہے اور خطیب کا کھانا الگ ہے، تبھی تو کہا کہ ان کا کھانا ادھر ہے اور آپ کا کھانا ادھر ہے۔

تو ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ میں نبی کے لیے میت کا لفظ الگ لائے اور امت کے لیے الگ لائے۔ اس کا معنی کہ دونوں میں فرق ہے۔

ایک لفظ دو بار بولیں اور معنی ایک ہو تو اس کو "تاکید" کہتے ہیں اور ایک لفظ دو بار بولیں اور معنی الگ ہو تو اس کو "استیناف" کہتے ہیں اور بلاغت کا ضابطہ ہے کہ استیناف؛ تاکید سے اَولیٰ ہوتا ہے۔ اگر جو معنی "مَيِّتٌ" کا ہے وہی معنی "مَيِّتُوْنَ" کا ہو تو یہ تاکید ہے۔ اگر دونوں کا معنی الگ ہو تو یہ استیناف ہے۔ تو بلاغت کا بھی تقاضا ہے کہ نبی کی موت الگ ہو اور امتی کی موت الگ ہو، الگ الگ ہونی چاہیے۔

یہاں ایک بات اچھی طرح سے سمجھ لیں! بسا اوقات انسان اپنا عقیدہ سمجھ لیتا ہے لیکن دوسرے کو مطمئن نہیں کر پاتا، اپنا عقیدہ دلائل سے شرح صدر کے ساتھ سمجھ آجاتا ہے لیکن دوسرے کو جواب نہیں دے پاتا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اپنا عقیدہ سمجھ جائیں، صحیح عقیدہ اختیار کر لیں تو نجات اس پر ہے۔ دوسرے کو جواب نہ دے سکیں تو نجات پھر بھی ہو جائے گی۔ بس نجات کے لیے ضروری ہے کہ اپنا عقیدہ ٹھیک ہو، اس لیے اپنا عقیدہ دلائل سے سمجھ لیں۔ کسی کو آپ جواب دے سکیں تو بہت اچھی بات ہے، اگر نہ دے سکیں تو کم از کم آپ کو یہ تو شرحِ صدر ہو گا کہ ہمارے عقیدے پر دلائل بہت ہیں، الجھن نہیں ہے، قرآن ہمارا ساتھ دیتا ہے، قرآن ہمارا مخالف نہیں ہے۔

منکرینِ حیات سے گفتگو کا طریقہ:

اور یہ بات بڑی اچھی طرح ذہن میں رکھ لیں! بسا اوقات آپ کا مخالف آپ سے کہے گا کہ آپ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی آیت پیش کریں۔ تو آپ ان سے کہیں کہ پہلے موت ہے اور پھر حیات ہے، آپ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت مانتے ہیں؟ کہے گا: مانتا ہوں۔ آپ کہیں: موت پر آیت پیش کریں۔ وہ کہے گا: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ آپ پوچھیں کہ جب یہ آیت اتری تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وفات پا چکے تھے؟ کہے گا: نہیں۔ تو یہ آیت وفات پر دلیل کیسے ہو گی؟ اس سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آچکی ہے، اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ پر موت آنی ہے۔ ایک ہے وقوعِ موت اور ایک ہے خبرِ موت۔ ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ میں موت کی خبر ہے، موت کا وقوع نہیں ہے۔

کبھی وہ آیت پڑھتے ہیں: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ [61] میں نے کہا: میں بھی نفس ہوں میں تو نہیں مرا، ﴿كُلُّ نَفْسٍ﴾ میں ہر نفس کی موت کا وقوع بیان نہیں کیا جا رہا بلکہ ہر نفس کی موت کی خبر دی جا رہی ہے۔ ہمارا سوال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے، اس پر آیت پڑھو!

کبھی پڑھتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ [62] میں نے کہا: ہم تو سوتے ہیں ہمارے اوپر تو موت نہیں آتی، تو اس میں

61۔ العنکبوت 57:29

62۔ الزمر 42:39

بھی خبر ہے اس میں وقوع نہیں ہے کہ ہر شخص کا وقوع موت بتایا جارہا ہو۔

کبھی کہتے ہیں کہ اگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر موت نہیں آئی تو صحابہ نے دفن کیوں کیا؟ میں نے کہا کہ یہ آیت پڑھی ہے آپ نے؟ آیت پڑھو آیت! یہ جو تم کہتے پھرتے ہو کہ ہمارے پاس 70 آیتیں اور 1800 حدیثیں ہیں، ہم آپ کو 69 آیتیں معاف کرتے ہیں آپ صرف ایک آیت بتائیں اور 1799 حدیثیں معاف ہیں صرف ایک حدیث پڑھ دیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر قرآن کریم سے 70 آیات ہیں!

اب دیکھو! منکرین حیات اگر آپ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات فی القبر پر آیت پوچھیں تو آپ نے ان سے موت فی الدنیا پر آیت مانگنی ہے کہ آپ لوگ کیسے ثابت کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر صرف ایک دلیل ہے؛ اجماع امت۔ ہم کہتے ہیں کہ جس دلیل سے موت ثابت ہے اسی دلیل سے حیات ثابت ہو گی۔ جب موت؛ اجماع سے ثابت ہے تو حیات بھی اجماع سے ثابت ہو گی۔ آپ لوگ حیات پر اجماع نہیں مانتے بلکہ آپ کہتے ہیں کہ پہلے قرآن پیش کرو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ موت پر پہلے قرآن پیش کریں، جب موت پر آپ کے پاس قرآن نہیں ہے تو آپ حیات پر قرآن کیسے مانگتے ہیں؟

یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ تحمل سے بات کرو، جلد بازی نہ کیا کرو، ہمارے پاس تو قرآن ہے پھر کیوں ڈرتے پھرتے ہو؟ تو پیغمبر کی موت کس دلیل سے ثابت ہے؟ (اجماع سے۔ سامعین) تو حیات بھی اجماع سے ثابت ہو گی، تو جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر اجماع ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر

بھی اجماع ہے۔ بات تو ختم ہو گئی۔ اب اگر ہم قرآنی دلیل دیتے ہیں تو ہمارا احسان ہے، یہ اضافی بات ہے ہمارے ذمہ نہیں ہے۔

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ اپنے عقائد کو اچھی طرح سمجھیں تو پھر آپ کو کبھی الجھنیں اور پریشانیاں نہیں ہوں گی۔ آپ کیوں پریشان ہیں کہ مطالعہ کرنا پڑے گا، بات کیسے کریں گے؟ کیا اتنی سی بات بھی آپ نہیں کرسکتے؟ یہ بات کرنی کیا مشکل ہے؟ اس لیے آپ گھبرایا بالکل نہ کریں اور کھل کر بات کیا کریں۔

موت اور نیند میں روح کا قبض ہونا:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾

اللہ رب العزت روح کو قبض فرما لیتے ہیں جب موت کا وقت آتا ہے اور روح کو قبض فرما لیتے ہیں جب انسان پر نیند آتی ہے، ﴿فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ﴾ پھر جس پر موت کا فیصلہ ہو وہ اپنے پاس رکھ لیتے ہیں، ﴿وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ اور دوسری کو چھوڑ دیتے ہیں ایک وقت تک- وقت آنے پر اس پر بھی موت آجاتی ہے- ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ روح کو قبض کرنا پھر روح کو چھوڑنا؛ اس میں کس قدر دلائل ہیں اس قوم کے لیے جو سمجھتی ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب انسان پر نیند آتی ہے تو انسان کی روح نکلتی ہے لیکن روح کی ایک شعاع انسان کے بدن میں رہتی ہے، اس رابطہ شعاعی کی وجہ سے بندہ زندہ رہتا ہے اور جب موت آتی ہے تو رابطہ شعاعی بھی ختم ہو جاتا ہے، اس لیے انسان پر موت آجاتی ہے- دیکھو! سورج اوپر ہے اور زمین نیچے ہے۔

تو یہاں روشنی کیوں ہے؟ کیونکہ سورج کی شعاعیں یہاں زمین پر ہیں۔ یوں روح کی شعاع ہے اس سے جسم میں حیات رہتی ہے- اب جب انسان کی روح عالمِ مثال کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور خواب آتا ہے تو یہ خواب سچا ہوتا ہے اور جب یہ روح عالمِ دنیا کی طرف متوجہ ہوتی ہے پھر خواب آتا ہے تو یہ خواب جھوٹا ہوتا ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں۔

اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روح اور جسم کا تعلق ظاہراً بھی ہوتا ہے اور باطناً بھی ہوتا ہے۔ جب انسان پر نیند آتی ہے تو اس وقت باطنی تعلق تو رہتا ہے جس سے بندہ سانس لے رہا ہوتا ہے، تدبیر ہو رہی ہوتی ہے اور ظاہری تعلق ختم ہو جاتا ہے جس کو حرکتِ ارادیہ کہتے ہیں وہ ختم ہو جاتی ہے کہ بندہ اپنے ارادے سے چلے دوڑے پھرے، اور جب موت آتی ہے تو پھر یہ ظاہری تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے باطنی تعلق بھی ختم ہوتا ہے تو پھر عام انسان پر موت آجاتی ہے۔

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ سے استدلال کا جواب:

اب اس سے مماتی حضرات استدلال کرتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾

میں نے کہا کہ ذرا ترجمہ کرو جو تم کرتے ہو! اب وہ ترجمہ کرتے ہیں کہ "اللہ قبض کرتا ہے انفس کو یعنی روح کو جب اس پر موت آتی ہے"، تو میں نے کہا کہ کیا روح پر موت آتی ہے؟ کہتے ہیں: جی نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر آپ کیسے ترجمہ کرتے ہیں؟! آپ تو انفس کو مفعول بہ بناتے ہیں اور ﴿مَوْتِهَا﴾ میں "هَا" ضمیر کا مرجع انفس ہے۔ یہ میں مماتیت کی بات کر رہا ہوں۔ پھر یہ لوگ ﴿وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ کا معنی کرتے ہیں "اور اللہ قبض کرتے ہیں اس کو جو نہیں مرتی اپنی نیند میں"... تو میں

نے کہا کہ نیند جسم پر آتی ہے یا روح پر آتی ہے؟ روح تو نہیں مرتی تو آپ اس کا ترجمہ کیسے کرتے ہیں کہ اللہ روح کو قبض کر لیتے ہیں؟

وہ لوگ تقریر یوں کرتے ہیں: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ﴾ انفس جمع ہے "نَفْسٌ" کی اور ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾[63]، ہم نے کہا کہ آپ کہتے ہیں: انفس جمع ہے نفس کی اور ہر نفس نے موت کا مزا چکھنا ہے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا روح موت کا مزا چکھتی ہے؟ کیا روح مرتی ہے؟ مرتا تو جسم ہے تو پھر ﴿كُلُّ نَفْسٍ﴾ سے مراد جسم ہو گا نا! نفس وہی ہو گا جس نے موت کا مزا چکھنا ہے اور موت آتی ہے جسم پر تو نفس سے مراد کیا ہو گا؟ (جسم ہو گا۔ سامعین) اور یہ انفس اُس نفس کی جمع ہے تو پھر اس انفس سے مراد کیا ہو گا؟ (جسم ہو گا۔ سامعین) تو آپ کیسے کہتے ہیں کہ روح نکل جاتی ہے؟

مماتی مجھے کہنے لگا کہ جی پھر آپ اس آیت کا مطلب سمجھا دیں! میں نے کہا کہ تم نے جو سبق پڑھا ہے پہلے وہ تو سناؤ، اپنی تفسیر ہمیں سمجھاؤ، ہم تو بعد میں بات کریں گے اور ہمارا مطلب سمجھنا تو بڑا آسان ہوتا ہے۔

یہ جو میں نے بات کی ہے یہ ان کے موقف پر اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ﴾ اللہ روح کو قبض کر لیتے ہیں ﴿حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ جب موت آتی ہے، ﴿وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ اور اس کی روح قبض کر لیتے ہیں جس کی موت نہیں آئی ہوتی بلکہ اس کی نیند ہوتی ہے، ﴿فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ﴾ اور جس پر موت کا فیصلہ ہو چکا ہو تو اس کی روح کو روک لیتے ہیں۔

63۔ العنکبوت 57:29

میں نے کہا کہ جو تقریر تم نے کی ہے تمہاری اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک آدمی پر نیند آتی ہے اللہ اس کی روح کو قبض کر لیتے ہیں، اگر اس کی زندگی کے دن باقی ہوں تو روح کو واپس بھیج دیتے ہیں اور اگر زندگی کے دن باقی نہ ہوں تو روح کو روک لیتے ہیں۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا؟ میں نے کہا کہ مجھے سمجھاؤ! اگر یہی معنی ہے تو جب نیند میں روح نکل جاتی ہے اگر اس کے لیے فیصلہ زندگی کا ہے تو روح واپس آتی ہے اور اگر فیصلہ موت کا ہے تو روح کو روک لیتے ہیں۔ تو جو روح نکالی تھی اسی کو روکا ہے نا! جب رکی ہے تو بندہ تو سانس لے رہا ہے تو پھر روکنے روکنے میں فرق کیا ہوا؟ جب روح نکل گئی تو بندہ سانس بھی لے رہا ہے، آوازیں بھی نکال رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ موت کے ساتھ روح رک گئی ہے تو یہ روح اتنی رکی ہے جتنی نکالی تھی تو پھر یہ فرق کیوں پڑا؟

روح اور جسم کے تین تعلقات:

فرق کیا ہے اچھی طرح سمجھو! ایک کیفیت انسان کی موت کی ہے اور ایک کیفیت انسان کی نیند کی ہے۔ نیند اور موت دونوں میں اللہ تعالیٰ بندے کی روح الگ کر لیتے ہیں۔ اس روح کا جسم کے ساتھ کئی قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ ایک تعلق نیند میں ختم ہوتا ہے یہ "توفِّی" الگ ہے اور ایک تعلق موت میں ختم ہوتا ہے یہ "توفِّی" الگ ہے۔

- روح کا جسم سے ایک تعلق ہے اس کو کہتے ہیں "تعلقِ حیات"
- ایک تعلق ہے اسے کہتے ہیں "تعلقِ تصرف"
- ایک ہوتا ہے "تعلقِ تدبیر"

یہ تین تعلقات ہو گئے۔ ایک تعلق سے جسم کو صرف حیات ملتی ہے، نہ ہی تدبیر نہ ہی تصرف، یہ تعلقِ حیات ہے، اور ایک تعلق ایسا ہے کہ جس سے آدمی کے جسم میں تدبیر ہوتی ہے، تدبیر کا معنی کہ آدمی کا کھانا خود بخود ہضم ہو رہا ہے، خون چل

رہا ہے، سانس لے رہا ہے یہ تعلقِ تدبیر ہے، اور ایک تعلقِ تصرف ہے کہ آدمی کھا رہا ہے، پی رہا ہے، دوڑ رہا ہے۔ تو تعلق کی یہ تین قسمیں ہو گئیں۔

ان تین تعلقات کے دائرہ ہائے کار:

جب آدمی جاگ رہا ہوتا ہے اور زندہ ہوتا ہے تو روح اور جسم کا تعلقِ حیات بھی ہوتا ہے، تعلقِ تصرف بھی ہوتا ہے اور تعلقِ تدبیر بھی ہوتا ہے۔ تعلقِ تصرف بھی ہے کہ کھاتا پیتا ہے، دوڑتا ہے۔ تعلقِ تدبیر بھی ہے کہ سانس آ رہا ہے، جا رہا ہے، ہمیں سانس کے لیے کوئی زور نہیں لگانا پڑتا؟ خود بخود آ رہا ہے اور دل خود بخود دھڑک رہا ہے، خون خود بخود گردش کر رہا ہے، جگر کام کر رہا ہے، معدہ کام کر رہا ہے یہ تعلقِ تدبیر ہے اور ہم زندہ بھی ہیں یہ تعلقِ حیات ہے۔

اور جب انسان پر نیند آتی ہے تو تعلقِ حیات بھی رہتا ہے، تعلقِ تدبیر بھی رہتا ہے البتہ تصرف ختم ہو جاتا ہے۔ جب آدمی سوتا ہے تو آدمی کے سونے سے کھانا ہضم ہوتا رہتا ہے، سانس آتی جاتی ہے اور دل خون کو لیتا ہے باہر نکالتا ہے، نبض چل رہی ہوتی ہے۔ یہ تعلقِ تدبیر ہے۔ اور جب انسان پر موت آتی ہے تو تینوں تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔

تو ''توفّی'' دونوں کی الگ الگ ہے۔ بوقتِ نیند اللہ جو روح کو قبض کر لیتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ روح اور جسم کا ایسا تعلق نہیں رہتا کہ جس سے تعلقِ تصرف ہو۔ اس کو بعض مفسرین یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ روح کو معطل فرما دیتے ہیں۔ معطل کا معنی ہے کہ یہ جو تعلقِ تصرف تھا یہ اللہ ختم فرما دیتے ہیں۔ یہ نیند ہو گئی اور جب تعلقِ تدبیر بھی ختم ہو جائے تو پھر یہ موت ہو گئی۔ موت کے بعد پھر جب اللہ نے اعادۂ روح فرمانا ہے حساب کتاب کے لیے اب وہ نیند ہوتی ہے، تصرف ختم ہو جاتا ہے لیکن وہ نیند دنیا کی نہیں ہے وہ نیند موت کے بعد کی نیند ہے، وہاں تعلقِ تدبیر بھی ختم

ہو جاتا ہے، ایک ایسا تعلق رہتا ہے کہ جس سے بندے میں حیات ہوتی ہے لیکن وہ حیات شعور سے محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ حیات نبی کے فرمانے سے محسوس ہوتی ہے، اسے کہتے ہیں: ﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾[64] بات سمجھ میں آگئی؟

جب آدمی جاگ رہا ہے تو تعلقِ حیات بھی ہے، تعلقِ تصرف بھی ہے اور تعلقِ تدبیر بھی ہے اور جب سو جائے تو اب تعلقِ حیات بھی ہے، تعلقِ تدبیر بھی ہے البتہ تعلقِ تصرف ختم ہو جاتا ہے اور جب موت آتی ہے تو تعلقِ حیات بھی ختم، تعلقِ تدبیر بھی ختم اور تعلقِ تصرف بھی ختم اور جب اعادۂ روح ہوتا ہے سوال وجواب کے لیے تو اب تعلقِ تصرف بھی نہیں ہے، تعلقِ تدبیر بھی نہیں ہے بلکہ صرف تعلقِ حیات ہے۔ نہ مردہ دوڑتا ہے.. نہ مردہ کھیلتا ہے.. نہ مردہ کھاتا ہے.. نہ اس کا خون چل رہا ہوتا ہے.. نہ اس کی رگیں حرکت کر رہی ہوتی ہیں لیکن اس تعلق سے اس کو جو حیات ملتی ہے اب وہ حیات ایسی ہے کہ آنکھوں سے محسوس نہیں ہوتی، اس لیے فرمایا: ﴿وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾، "وَلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ" نہیں فرمایا۔ ادراک بالحواس کا نام شعور ہے اور ادراک بالوحی کا نام علم ہے۔ تو یہاں "وَلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ" نہیں فرمایا کہ اس کی حیات ایسی ہے کہ جو وحی سے بھی پتا نہیں چلے گی، حیات ہے لیکن شعور سے پتا نہیں چلے گا اس لیے ﴿وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ فرمایا۔ یہ بات سمجھ آرہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ

64۔ البقرۃ 154:2

مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰـكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾ ﴾[65]

یہاں ﴿وَلٰـكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ﴾ فرمایا کیونکہ فساد تو آنکھ سے نظر آتا ہے، لیکن یہ کفار اتنے بے شعور اور ضدی ہیں کہ انہیں اپنا فتنہ و فساد بھی نظر نہیں آرہا تو یہاں ان کفار کے شعور کی نفی کی ہے، اور آگے فرمایا:

﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ‌ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾ ﴾[66]

یہاں علم کی نفی ہو رہی ہے کیونکہ ایمان نظر نہیں آتا، ایمان کے آثار تو نظر آتے ہیں ایمان نظر نہیں آتا کیونکہ وہ تو قلبی چیز ہے نظر کیسے آئے گی؟ تو ادراک بالحواس کو شعور کہتے ہیں اور ادراک بالوحی کو علم کہتے ہے۔

یہ جو قبر کی حیات ہوتی ہے یہ تعلق اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اس میں تدبیر بھی نہیں، تصرف بھی نہیں، ہاں اتنا تعلق ہے کہ جس سے حیات ہو اور اتنا تعلق ہے کہ جس سے آدمی تلذذ اور تکلیف کو محسوس کرے۔ آپ عقائد کی کتب میں پڑھیں گے:

اِتَّفَقَ أَهْلُ الْحَقِّ عَلٰى أَنَّ اللّٰهَ يُعِيْدُ إِلَى الْمَيِّتِ فِي الْقَبْرِ نَوْعَ حَيَاةٍ قَدْرَ مَا يَتَأَلَّمُ وَيَتَلَذَّذُ.[67]

یعنی روح کا اتنا تعلق ہو گا کہ جس سے جسم تکلیف اور راحت محسوس کرے۔ وہ تدبیر اور تصرف والا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔

بات سمجھ میں آگئی؟

65۔ البقرۃ2:11، 12

66۔ البقرۃ2:13

67۔ شرح المقاصد فی علم الکلام: ج2ص222

شرک کی قباحت:

﴿وَ لَقَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۶۵﴾﴾

آپ کی طرف وحی آئی ہے اور پہلے انبیاء کی طرف بھی وحی آئی ہے کہ اگر تم شرک کروگے تو تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہوگے!

یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ شرک کروگے تو اعمال ضائع ہو جائیں گے، یہ پیغمبر کو خطاب کر کے امت کو سمجھانا مقصود ہے۔ جس طرح فاطمہ مخزومیہ نے مدینہ میں چوری کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو! سفارش آئی کہ یہ بڑے خاندان کی عورت ہے اس کو کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا۔[68]

اگر یہ چوری کرنے والی فاطمہ بنت محمد ہوتی تو میں تب بھی اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ تو یہ امت کو سمجھانا مقصود ہے۔ اسی طرح ﴿لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ﴾ یہ امت کو سمجھانا مقصود ہے۔

باری تعالیٰ کی قدرت وطاقت کا بیان:

﴿وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ ٭ۖ وَ الۡاَرۡضُ جَمِیۡعًا قَبۡضَتُهٗ یَوۡمَ

68۔ سنن ابی داوٗد، رقم: 4373

﴿الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾

یہ جو کہا کہ قیامت کے دن زمین بھی اللہ کے قبضے میں ہو گی اور سارے آسمان اللہ کے یمین میں لپٹے ہوں گے، یہ میں پہلے سمجھا چکا ہوں کہ ﴿بِيَمِيْنِهٖ﴾ متشابہات میں سے ہے، اس کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بعض متأخرین اس کا معنی کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہو گا اور اختیار کو ﴿بِيَمِيْنِهٖ﴾ سے تعبیر کرتے ہیں۔

سورۃ البقرۃ میں ہے:

﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾[69]

اگر تم عورت کو طلاق دے دو اس سے ملاقات سے پہلے لیکن مہر تم نے مقرر کیا ہو تو اس صورت میں تمہیں نصف مہر دینا ہو گا، ہاں اگر عورت اپنا حق معاف کر دے تو اس کی مرضی ہے، ﴿اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کا اختیار ہے وہ درگزر سے کام لے لے یعنی شوہر آدھا مہر دینے کے بجائے پورا حق مہر دے دے۔

یہاں "بِيَدِهٖ" کا لفظ استعمال کیا ہے، نکاح حقیقتاً تو ہاتھ میں نہیں ہوتا، پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اختیار میں نکاح ہے کہ وہ چاہے تو بیوی کو نکاح میں رکھے اور چاہے تو اس کو طلاق دے دے۔ تو یہاں "ید" سے مراد اختیار ہے۔ تو ﴿بِيَمِيْنِهٖ﴾ سے مراد اختیار ہوتا ہے، متأخرین نے یہ معنی لیا ہے لیکن بہتر یہی ہے

69۔ البقرۃ 237:2

کہ اس کو متشابہات میں مانا جائے کہ اس کا معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

نفخِ صور کا ہولناک منظر:

﴿وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾

جب صور پھونکا جائے گا تو تمام آسمان والے اور زمین والے بے ہوش ہو جائیں گے، غش کھا کر گر جائیں گے سوائے اس کے جس کو اللہ چاہے۔

یعنی صور پھونکے جانے کی وجہ سے سب بے ہوش ہو جائیں گے پھر سب مر جائیں گے اور جو پہلے مر چکے ہیں ان کی روحیں بے ہوش ہو جائیں گی۔

﴿اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾... سوائے اس کے جس کو اللہ چاہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صور پھونکنے کے اثر سے جو موت واقع ہو گی اس سے جبرائیل، اسرافیل، میکائیل اور ملک الموت محفوظ رہیں گے۔ یعنی اس نفخہ سے تو ان کو موت نہیں آئے گی لیکن بعد میں ان کو بھی موت آجائے گی اور سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کوئی زندہ نہیں رہے گا۔

جنت مہمان خانہ اور جہنم قید خانہ:

﴿وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾

یہاں ایک بنیادی بات سمجھیں۔ اللہ رب العزت نے یہاں جہنم کا تذکرہ فرمایا کہ کفار کو جہنم کی طرف کھینچا جائے گا، جب جہنم کے پاس آئیں گے تو دروازے کھل جائیں گے۔ آگے جنت کی باری ہے، تو وہاں فرمایا:

﴿وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾

﴿وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ میں یہ واؤ حالیہ ہے۔ جب اہلِ جنت آئیں گے تو ان کے آنے سے پہلے جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے۔ قید خانے اور مہمان خانے میں فرق ہوتا ہے، جب قیدی کو جیل میں لے کے جاتے ہیں تو دروازہ بند ہوتا ہے، قیدی جاتا ہے تو دروازہ کھلتا ہے اور پھر دروازہ بند کر دیتے ہیں، اور مہمان خانے کا طرز یہ نہیں ہوتا، مہمان خانہ مہمان کی آمد سے پہلے کھلا رکھتے ہیں۔

اس لیے آپ نے کئی بار دیکھا کہ میں یہاں بیٹھا ہوں، مہمان قریب آجائیں تو میں کہتا ہوں کہ بھائی گیٹ کھول دو! جب مہمان آئیں گے تو دروازہ کھلا ہو گا اور گاڑی سیدھی اندر آجائے، یہ مہمان خانے کا طرز ہے۔

البتہ آپ کی سیکورٹی ہے، آپ نے گیٹ بند کیا ہوا ہے، مہمان اچانک آ گیا وہ گھنٹی بجائے گا تو دروازہ کھل جائے گا لیکن جب آپ کو مہمان اطلاع دے کر آئے تو اب استقبال کا طریقہ یہ ہے کہ گیٹ پہلے سے کھلا ہوا ہو، دستر خوان لگا ہوا ہو، اس سے مہمان کو راحت پہنچے گی۔ ان آداب کا بہت زیادہ خیال رکھا کریں۔

مہمان کا اکرام کیجیے!

آنے والا مہمان مسلمان ہے، کافر ہے، فاسق ہے، نیک ہے، اھل السنۃ ہے، اہلِ بدعت ہے، غریب ہے، امیر ہے جیسا بھی ہے مہمان مہمان ہی ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ." [70]

بس مہمان کا خیال رکھو۔ یہ نہ دیکھو کہ آنے والا کون ہے؟ حیثیت کا مسئلہ بعد کا ہے، اپنی حیثیت کے مطابق مہمان کا ہمیں اکرام ضرور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم

70۔ صحیح البخاری، رقم:6138

سب کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کی مہمان نوازی:

حضرت مولانا عبد الماجد دریا آبادی رحمہ اللہ حضرت مدنی رحمہ اللہ سے بیعت تھے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے صرف اصلاحی تعلق تھا۔ جو بات میں سنانا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مولانا عبد الماجد دریا آبادی دیوبند جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر اترتے، حضرت مدنی کو اطلاع ہوتی تو حضرت مدنی آتے اور ان کا سامان اٹھا لیتے۔ حضرت مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے حضرت تھانوی کو خط لکھا کہ حضرت مدنی آتے ہیں اور میرا سامان اٹھاتے ہیں تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے، آپ حضرت مدنی سے فرمائیں کہ میرا سامان نہ اٹھایا کریں۔ اب حضرت تھانوی کا جواب سنیں، فرمایا مشائخ کی طبیعت میں فرق ہوتا ہے، حضرت مدنی کا شوق ایسا ہے کہ مہمان کی خدمت سے ان کو خوشی ہوتی ہے اور خدمت نہ ہو تو ان کو تکلیف ہوتی ہے، اس لیے حضرت کو میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ ان کا سامان نہ اٹھایا کریں کیونکہ اس سے ان کو تکلیف ہو گی۔

یہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج تھا، مہمان کے آنے پر یوں خدمت کرتے تھے۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کے ہاں بسا اوقات مہمان آتے تو آپ ان کے ہاتھ خود دھلواتے پھر فرماتے کہ آپ میرے مہمان ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ" تو میزبان کو میزبانی کے فرائض ادا کرنے چاہییں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حضرت مدنی رحمہ اللہ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ المؤمن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَ
قَابِلِ التَّوۡبِ شَدِیۡدِ الۡعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوۡلِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۳﴾﴾

فضائل سورت:

سورۃ المؤمن، حٰم السجدۃ، الشوریٰ، الزخرف، الدخان، الجاثیۃ اور الاحقاف یہ سات سورتیں قرآن کریم کی وہ ہیں جو حٰم سے شروع ہو رہی ہیں، انہیں حوامیم اور آل حٰم بھی کہتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ سات سورتیں قرآن کریم کی زینت ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنا مکان بنانا چاہے اور پھر باہر جگہ تلاش کرے کہ میں مکان بناؤں، اس کو ایسا میدان ملے جو سرسبز ہو تو اس کا جی چاہتا ہے کہ میں یہاں مکان بنالوں۔ پھر وہ تھوڑا سا مزید آگے جائے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس سے بھی بہترین جگہ موجود ہے جنہیں روضات کہا جائے۔ تو وہ سوچتا ہے کہ وہ جو میدان تھا میں تو اس کے سبزے اور ہریالی کو دیکھ کر تعجب کر رہا تھا اور یہ میدان تو اس سے بھی زیادہ حسین اور سرسبز ہے۔ تو وہ اس جگہ کا انتخاب کرتا ہے جو پہلی سے بھی بہتر تھی۔ تو فرمایا کہ پورا قرآن کریم ایسے ہے

جیسے پہلے والا سرسبز میدان ہو اور حوامیم جو سات سورتیں ہیں یہ ایسے ہیں جیسے اس میدان سے آگے والا میدان ہو جنہیں روضات کہتے ہیں۔

اس سورت کی پہلی تین آیات مصیبت سے بچنے کے لیے پڑھنا ثابت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شروع دن میں آیۃ الکرسی اور سورۃ مؤمن کی پہلی تین آیات پڑھ لے - حٰم سے لے کر ﴿اِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ﴾ تک - تو وہ دن بھر کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہے گا۔

مشکل وقت اور بطورِ خاص جب مخالف دشمن حملہ کرے، آپ پر چھاپہ مارے تو اس وقت "حٰمٓ لَا يُنۡصَرُوۡنَ" پڑھیں۔ اللہ رب العزت مدد فرماتے ہیں۔

اللہ کی صفات کا بیان:

اس آیت میں اللہ رب العزت کی صفات بیان فرمائی ہیں: "الۡعَزِيۡزِ" عزیز ہیں، غالب ہیں، "الۡعَلِيۡمِ" صاحبِ علم ہیں، "غَافِرِ الذَّنۡۢبِ" گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں، "قَابِلِ التَّوۡبِ" توبہ قبول فرمانے والے ہیں، "شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ" سخت سزا دینے والے ہیں، "ذِي الطَّوۡلِ" طاقت والے ہیں۔

لفظ غافر یہ غُفۡرَان سے ہے، غفران کا اصل معنی ہے ڈھانپ لینا چونکہ جب انسان کے گناہ معاف ہو جائیں تو اس کا گناہ چھپ جاتا ہے، اس لیے گناہ کی معافی کو غفران سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اصل لغوی معنی ذہن میں ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات پر ایک اعتراض ہے وہ اس سے ختم ہو جائے گا۔ آگے ایک جگہ آئے گا تو میں وہاں پہنچ کر بات کروں گا ان شاء اللہ۔

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُنَادَوۡنَ لَمَقۡتُ اللّٰهِ اَكۡبَرُ مِنۡ مَّقۡتِكُمۡ

اَنۡفُسَکُمۡ اِذۡ تُدۡعَوۡنَ اِلَی الۡاِیۡمَانِ فَتَکۡفُرُوۡنَ ﴿۱۰﴾

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں پکار کر کہا جائے گا کہ آج تم جس قدر اپنے آپ سے بیزار ہو رہے ہو اللہ اس سے بھی کہیں زیادہ بیزار ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم انکار کر دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ بیزار ہونے کی صفت سے پاک ہے، اللہ میں صفتِ انفعال نہیں ہے لیکن یہ تعبیر صرف سمجھانے کے لیے ہے کہ جس طرح بندہ تکلیف محسوس کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ اللہ کو بھی یوں تکلیف محسوس ہوتی ہے جب بندہ کفر اختیار کرتا ہے۔

دو موتیں اور دو زندگیاں:

﴿قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ وَ اَحۡیَیۡتَنَا اثۡنَتَیۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۱۱﴾﴾

قیامت کے دن کفار کہیں گے: اے ہمارے رب! دو مرتبہ آپ نے ہمیں موت دی تھی اور دو مرتبہ آپ نے ہمیں زندگی دی تھی، ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، کیا اب واپس جانے کی کوئی صورت ہے؟ اللہ فرمائیں گے کہ واپسی کے دروازے بند ہیں، اب تم واپس نہیں جاسکتے۔

یہاں یہ بات سمجھیں کہ ماں کے پیٹ میں آنے سے پہلے انسان بے جان مادہ تھا اسے پہلی موت کہتے ہیں۔ روح پھونکی جاتی ہے تو بندے کو حیات مل جاتی ہے، پھر بندہ دنیا میں آتا ہے۔ پھر دنیا میں اس کو موت مل جاتی ہے۔ پھر یہ قبر کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، پھر اسے حیات مل جاتی ہے اور پھر اس پر موت آتی ہے اور پھر حشر کے دن زندہ ہو جاتا ہے۔ اب یوں دیکھیں تو تین موتیں اور تین حیاتیں بن جاتی ہیں:

1: ماں کے پیٹ والی موت، پھر ماں کے پیٹ والی حیات۔

2: پھر دنیاوالی موت اور برزخ والی حیات۔

3: پھر حشر والی موت اور اس کے بعد پھر حشر کی حیات۔

اور قرآن کریم سے بظاہر معلوم ہو رہاہے کہ موت بھی دو ہیں اور حیات بھی دو ہیں اور یہی آیت بطور استدلال کے ہمارے خلاف پیش کی جاتی ہے کہ قبر کی حیات، حیات نہیں ہے۔ اگر قبر کی حیات کو حیات مانو گے تو پھر حیاتیں تین ماننی پڑیں گی، کیوں؟ کہ اس کے بعد پھر حشر کی موت بھی ماننی پڑے گی تو تین ہو جائیں گی۔ تو قرآن کہتاہے کہ دو موتیں ہیں اور تم کہتے ہو کہ تین موتیں ہیں، قرآن کہتاہے کہ دو حیاتیں ہیں اور تم کہتے ہو کہ تین حیاتیں ہیں۔

اس کا جواب سمجھ لیں! ایک ہے ظاہری موت اور ایک ہے ظاہری حیات، اور ایک وہ حیات ہے جو ظاہری نہیں ہے بلکہ چھپی ہوئی ہے، یہ جو موت کے بعد سے لے کر حشر تک کی حیات ہے یہ حیات برزخ کی حیات ہے جو نظر نہیں آتی، یہ مخفی حیات ہے، اس لیے اس حیات کو یہاں ذکر نہیں کیا۔ یہاں ظاہری حیات کا ذکر ہے، ظاہری حیاتیں دو ہیں؛ ایک دنیامیں اور ایک حشر میں، یہ جو درمیان میں برزخ کی حیات ہے یہ پردے میں ہے، اس لیے یہ ظاہری حیات نہیں ہے ورنہ حیات اب بھی موجود ہے۔ اس حیات کا انکار اس لیے نہیں کر سکتے کہ اس پر نصوص موجود ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾[71]

71۔ ابراہیم 27:14

یہاں ﴿وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ سے مراد قبر ہے کہ اللہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھتے ہیں قبر میں۔ [72]

اگر قبر میں حیات ہے ہی نہیں تو ثابت قدم رکھنے کا کیا معنی؟ تو اس آیت کریمہ اور بہت سی احادیث سے ثابت ہے کہ قبر میں حیات ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حیات ظاہری ہے اور ایک حیات مخفی ہے۔ اس آیت میں حیات سے مراد وہ حیات ہے جو بالکل ظاہری ہے، جو ہر کسی کو نظر بھی آتی ہے۔ اب دنیا میں کافر کی بھی حیات ہے، مؤمن کی بھی حیات ہے اور دونوں کی حیات نظر بھی آرہی ہے، جب انسان مرتا ہے تو اس کی موت بھی نظر آرہی ہے۔ سورۃ الزمر کی اس آیت:

﴿وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ [73]

کی تشریح میں یہ بات کی جاچکی ہے کہ قیامت کے دن جو لوگ زندہ ہوں گے ان پر موت طاری ہو گی اور باقی پر غشی طاری ہو گی۔ اب ایک بندہ قبر کی حیات کے ساتھ زندہ تھا، اب وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو گا اس کو تو پہلے سے حیات ملی ہوئی ہے! اصل میں قبر کی یہ حیات مخفی ہے، اب اس کو حیات ظاہری ملنی ہے تو قبر کی اس مخفی حیات پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی اور بعد میں اس کی بے ہوشی ختم ہو گا اور وہ کھڑا ہو جائے گا۔

یہ بالکل ایسا ہے جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سے پہلا وہ بندہ جو بے ہوشی سے نکلے گا وہ میں ہوں گا۔ [74]

72۔ صحیح مسلم، رقم: 2871

73۔ الزمر 68:40

74۔ صحیح البخاری، رقم: 4813

اب اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہاں صرف بے ہوشی کی کیفیت ہوگی، یہ نہیں ہوگا کہ حیات کے بعد موت ہوگی۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے جملہ سے بعض الناس کے استدلال کا جواب:

بعض لوگ قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جس میں حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾﴾[75]

یہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے موت ہے اور پھر حیات ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرما لیں کہ یہاں پر ایک ہے "حال" اور ایک ہے "ذوالحال"۔ ذوالحال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے، ان دونوں کے زمانوں میں فرق نہیں ہوتا، الجھن یہاں سے ہوتی ہے کہ جب ہم ان دونوں کے زمانوں میں فرق کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾﴾

حضرت یحییٰ علیہ السلام پر سلام ہے جس دن وہ پیدا ہوئے، جس دن انہیں موت آئے گی اور جس دن زندہ ہوں گے۔

تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! یہاں پہلے موت ہے اور پھر جب بعثت ہوگی تو حیات ہوگی... حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اٹھیں گے اور پھر زندگی ملے گی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حال میں اٹھیں گے کہ زندہ ہوں گے۔ ﴿يُبْعَثُ﴾ میں "هُوَ" ضمیر ذوالحال ہے اور

75۔ مریم 15:19

﴿حَیًّا﴾ اس سے حال ہے، ذوالحال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں "جَاءَنِیْ زَیْدٌ رَاکِبًا" کہ زید میرے پاس سوار ہو کر آیا۔ تو اس کا کیا مطلب کہ وہ سوار ہونے کی حالت میں مدرسہ میں داخل ہوا یا پہلے پیدل تھا اور جب مدرسے میں داخل ہوا تو سوار ہوا؟ پہلے سے سوار تھا۔ اسی طرح ﴿یُبْعَثُ حَیًّا﴾ ہے کہ قیامت کے دن انہیں زندہ حالت میں اٹھایا جائے گا۔ یعنی پہلے سے زندہ ہیں اور اسی حالت میں اٹھیں گے۔ اس لیے یہاں تو صاف ان کی حیات سمجھ آ رہی ہے اور حیات بھی کون سی ہے؟ قبر والی ہے۔

﴿وَ سَلٰمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ﴾... جب پیدا ہوئے - یہ ماضی ہے - تب بھی سلامتی

﴿وَ یَوْمَ یَمُوْتُ﴾... جب موت آئے گی تب بھی سلامتی

﴿وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا﴾... جب انہیں زندہ حالت میں اٹھایا جائے گا تب بھی سلامتی

یہاں "وَ یَوْمَ یُحْیٰی" نہیں ہے بلکہ ﴿وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا﴾۔ اگر یہ فرمایا جاتا کہ "وَ سَلٰمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُحْیٰی" تو اب اس کا معنی ہوتا کہ ان پر سلامتی ہے جب یہ پیدا ہوئے، ان پر سلامتی ہے جب ان کو موت آئے گی اور ان پر سلامتی ہے جب یہ زندہ ہوں گے لیکن یہاں وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ہے اور "یُبْعَثُ" کی قید "حَیًّا" بنا دی، اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعثت اور حیات اکٹھی ہوں گی۔

تو قرآن کریم کی آیت سے صاف صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قبر کی حیات ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ حیات ایسی ہے جو عام بندے کو نظر نہیں آ رہی۔ اس لیے میں نے کہا کہ یہاں ظاہری دو موتیں اور ظاہری دو حیاتیں ہیں۔

فرعون کے مظالم:

﴿فَلَمَّا جَآءَھُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

جب فرعون کو اس بات کا اندیشہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو میری حکومت ختم کرے گا تو اس نے اپنے اراکین سے مشورہ کیا، اس کے اصحابِ شوریٰ نے کہا کہ جو بچہ بنی اسرائیل میں پیدا ہو آپ اس کو قتل کر دیں۔ بچے قتل ہوتے رہے۔ جب کچھ عرصہ ایسے گزرا تو پھر انہوں نے مشورہ کیا کہ اگر سارے بنی اسرائیلی مرد قتل ہو گئے تو مشکل ہو جائے گی، ہماری خدمت کون کرے گا؟ مشورہ یہ ہوا کہ بچوں کو ایک سال قتل کریں اور ایک سال زندہ رکھیں۔ تو جس سال بچوں کو زندہ رکھنا تھا اس سال حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور جس سال بچوں کو قتل کرنا تھا اس سال حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اللہ نے ان دونوں کو نبوت عطا فرمائی۔

جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بچے قتل کرو تو ساتھ یہ بھی تھا کہ بچیاں زندہ رکھو۔ اب یہاں جو فرمایا: ﴿اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ﴾ تو اس میں نساء یہ ابناء کے مقابلے میں ہے۔ اگر ابناء سے مراد بڑے لوگ ہیں جو بالغ ہیں تو نساء سے مراد بالغ عورتیں ہوں گی اور اگر ابناء سے مراد چھوٹے بچے ہیں تو نساء سے مراد بچیاں ہوں گی۔ اب فرعونی جو قتل کر رہے تھے تو وہ پیدا ہوتے ہی قتل کر رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نساء سے مراد وہی بچیاں ہیں جو نابالغ ہوتی تھیں، ان کو چھوڑ دیا جاتا اور ابناء کو قتل کر دیا جاتا۔ تو قرآن کریم کی اس آیت سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح نساء بالغ عورت کو کہتے ہیں اسی طرح نساء نابالغ بچی کو بھی کہتے ہیں۔

احمد سعید ملتانی کے اعتراض کا جواب:

یہ بات میں نے کیوں کہی ہے؟ آپ کے علم میں ہے کہ احمد سعید چتروڑی

نے کتاب لکھی ہے "قرآن مقدس اور بخاری محدث" اس کتاب میں اس نے صحیح بخاری کی 53 احادیث پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ یہ احادیث العیاذ باللہ قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ ان میں ایک حدیث یہ ہے کہ ام المؤمنین امی عائشہ صدیقہ کا جب نکاح ہوا تو آپ رضی اللہ عنہا کی عمر چھ یا سات سال تھی، جب رخصتی ہوئی تو عمر نو سال تھی۔ تو اس نے کہا کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾[76]

کہ شادی نساء سے کرو اور نساء کہتے ہیں بالغہ کو اور حضرت عائشہ نکاح اور رخصتی کے وقت نابالغ ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ بخاری کی روایت ٹھیک نہیں ہے، قرآن کے خلاف ہے۔

میں نے کہا: بخاری کی روایت قرآن کے خلاف تب ثابت ہو گی جب نساء کا معنی بالغ عورت ہو اور اگر قرآن بالغ کو بھی نساء کہہ دے اور نابالغ کو بھی نساء کہہ دے تو پھر بخاری کی یہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ قرآن کریم میں نساء بالغ کو بھی کہا گیا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾[77]

اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور ایمان والی عورتوں سے فرمائیں کہ پردہ کریں۔

تو قرآن بالغ عورت کو بھی نساء کہتا ہے اور یہاں اس سورت میں ہے:

76۔ النساء 3:3

77۔ الاحزاب 59:33

﴿قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ﴾

تو قرآن نابالغ کو بھی نساء کہتا ہے۔ جب قرآن کریم نابالغ کو نساء کہہ رہا ہے تو پھر بخاری شریف قرآن کے خلاف کیسے ہوئی؟ میں اس لیے کہتا ہوں کہ پورے قرآن پر نظر نہیں ہوتی تو لوگ بعض احادیث کو قرآن کے خلاف پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

رجل مؤمن کی تقریر:

﴿وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ﴾

فرعون؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو العیاذ باللہ قتل کرنا چاہتا تھا تو فرعون ہی کے خاندان کا ایک بندہ مؤمن اٹھا جس نے اپنا ایمان چھپایا ہوا تھا، اس نے فرعون اور آل فرعون کو سمجھایا۔ یہ شخص کون تھا؟ بہت سارے مفسرین فرماتے ہیں کہ ان کا نام شمعان تھا اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ان کا نام حزقیل تھا اور یہ فرعون کے چچا کا بیٹا تھا۔

اس رجل مؤمن نے کہا: کیا تم ایسے بندے کو قتل کرنا چاہتے ہو جو فرمارہے ہیں کہ میرا رب اللہ ہے! اور وہ اپنے رب کی طرف سے واضح دلائل لے کر بھی آئے ہیں۔ اگر یہ جھوٹ بولتے ہیں تو جھوٹ کا وبال خود انہی کو پہنچے گا اور اگر یہ سچ بولتے ہیں تو جس چیز سے یہ تمہیں ڈرا رہے ہیں اس کا وبال تمہیں ضرور پہنچے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کرو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدیقین دنیا میں بہت کم ہوئے

ہیں، ایک ان میں یہ تھا﴿رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ ۖ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ﴾ اور ایک﴿وَ جَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِیۡنَۃِ رَجُلٌ یَّسۡعٰی﴾[78] حبیب نجار تھا اور ایک حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدیق اکبر ان سب سے افضل ہیں۔

اس سے آپ کو شبہ ہو گا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیق بہت کم ہیں جبکہ قرآن کریم میں ہے:﴿اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ﴾[79] کہ صدیق تو بہت ہیں، اور خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ ستر صدیقین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پانی پینے سے نیند بہت آتی ہے۔ تو امام غزالی رحمہ اللہ تو ستر صدیقین کہہ رہے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ صدیق کا وہ مقام جہاں تک کوئی کوئی پہنچتا ہے یہ صدیق بہت کم ہوتے ہیں جو عکسِ نبوت کی طرح ہوتے ہیں، اور ایسے صدیق کہ جن کا قول؛ فعل کے مطابق ہو تو یہ امت میں بہت ہوتے ہیں۔

منکرین رسالت کی شرارت:

﴿وَ لَقَدۡ جَآءَکُمۡ یُوۡسُفُ مِنۡ قَبۡلُ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا زِلۡتُمۡ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمۡ بِہٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا ہَلَکَ قُلۡتُمۡ لَنۡ یَّبۡعَثَ اللّٰہُ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ رَسُوۡلًا﴾

اس سے پہلے یوسف علیہ السلام تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آئے لیکن تم ان کی لائی ہوئی تعلیمات میں شک کرتے رہے، جب یوسف علیہ السلام فوت ہو گئے تو تم نے کہا کہ ان کے بعد اللہ کسی نبی کو نہیں بھیجے گا!

78۔ یٰسین 20:36

79۔ النساء 69:4

یہ ان لوگوں نے بطورِ شرارت کہا تھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یوسف اللہ کے نبی نہیں تھے اور اگر بالفرض وہ نبی بھی تھے تو اللہ کو ان کے بعد نبی بھیجنے کی ضرورت کیا ہے؟! کیونکہ جب ان کی نہیں مانی تو کسی اور کی بھی نہیں مانیں گے اس لیے اللہ ان کے بعد کوئی اور نبی کیوں بھیجیں گے!

لغات کی تبدیلی سے معانی کی تبدیلی:

یہاں اس لفظ ﴿حَتّٰٓی اِذَا هَلَكَ﴾ کو سمجھیں۔ یوسف علیہ السلام فوت ہوئے، آپ کی وفات ہوئی لیکن قرآن کہتا ہے "هَلَكَ" کہ ہلاک ہوئے۔ یہاں بات صرف یہ سمجھنی ہے کہ ہر زبان کے اپنے الفاظ اور اپنے معانی ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک لفظ کا جو معنی ہمارے ہاں ہے وہی لفظ عربی میں ہو تو اس کا وہی معنی ہو گا بلکہ وہی لفظ اگر اہلِ عرب استعمال کریں گے تو اس کا معنی الگ ہو گا اور وہی لفظ ہم استعمال کریں گے تو اس کا معنی الگ ہو گا۔ ہمارے ہاں "ہلاک" کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ "فلاں شخص ہلاک ہو گیا" کہیں تو یہ اچھا لفظ شمار نہیں ہوتا اور عربی میں ہلاک دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں ہلاک کا معنی ہے ختم ہونا خواہ صحیح طریقے سے ہو خواہ غلط طریقے سے ہو، عزت کے ساتھ ہو یا ذلت کے ساتھ ہو، اور اردو میں ہلاک کا معنی عزت کے ساتھ نہیں بلکہ ذلت کے ساتھ ہوتا ہے، کہتے ہیں نا کہ فلاں ہلاک ہو گیا۔ تو اب یوسف علیہ السلام کے لیے قرآن کریم ﴿حَتّٰٓی اِذَا هَلَكَ﴾ لفظ استعمال کر رہا ہے لیکن ان کا دنیا سے جانا عزت کے ساتھ تھا۔ معلوم ہوا کہ ہلاک عربی میں ہو تو معنی اور ہوتا ہے اردو میں ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔ اب دیکھیں! قرآن مجید میں ہے:

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾[80]

اردو میں ضال کا معنی ٹھیک نہیں ہوتا، گمراہ کو اردو میں ضال کہتے ہیں اور عربی میں ضال کا معنی ہمیشہ گمراہ نہیں ہوتا۔ ایک چیز کسی کے سامنے نہ ہو اسے کہتے ہیں ضال اور اس کو چیز مل جائے تو اسے کہتے ہیں مہدی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ نبوت سے قبل غارِ حراء میں جاتے اور متفکر ہوتے کہ میں اس امت کو شرک سے کیسے بچاؤں؟ اس امت کو زنا سے کیسے بچاؤں؟ اس امت کو ناحق قتل سے کیسے بچاؤں؟ میں انسان کو انسانیت پر کیسے لاؤں؟ اس پر آپ بہت پریشان ہوتے لیکن راستہ نظر نہیں آتا تھا کہ میں کیسے کام کروں کہ یہ راہِ راست پر آجائیں۔ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا﴾ کہ آپ کے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا ﴿فَهَدٰى﴾ تو ہم نے آپ کو راہ دکھادی۔

میں اس لیے بار بار زور دیتا ہوں قرآن فہمی پر کہ جب یہ بات سمجھ میں آجائے کہ اللہ یہاں کیا فرمانا چاہتے ہیں تو پھر آگے بات سمجھانی آسان ہو جاتی ہے۔

جب یہ مفہوم ذہن میں ہو گا تو ضالاً کا ترجمہ کرنا بہت آسان ہے اور جب یہ مفہوم ذہن میں نہیں ہو گا تو پھر ضالاً کا ترجمہ کرنا بہت مشکل ہے۔ لفظوں کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ عربی میں اس لفظ کا مطلب کیا ہے اور ہمارے ہاں اس لفظ کا مطلب کیا ہے؟

”اَصۡغَرُ عُضۡوًا“ کا معنی:

شاید آپ کے سامنے عبارات پر بات آچکی ہے، میں کئی بار عبارات سمجھاتا رہتا ہوں اور اس میں فقہ کی عبارتیں بھی پیش کیا کرتا ہوں کہ کس طرح غیر مقلد ان عبارات کا غلط مطلب بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ فقہ حنفی میں لکھا ہوا ہے کہ امام

80۔ الضحیٰ 7:93

اس کو بناؤ ”اَصْغَرُ عُضْوًا “ کہ جس کا عضو چھوٹا ہو۔ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ امام بنائیں گے یا اس کو چیک کریں گے؟ پتا کیسے چلے گا کہ اس کا عضو چھوٹا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ان کو یہ غلط فہمی کہاں سے ہوئی؟ اصل میں ”اَصْغَرُ عُضْوًا “ یہ عربی محاورہ ہے جس کا اپنا ایک معنی ہے، اس کا معنی ہوتا ہے پاک دامن۔ تو ہم پاک دامن کہہ دیتے ہیں اور وہ ”اَصْغَرُ عُضْوًا “ کہہ دیتے ہیں۔ اب جو معنی عرب لیتے ہیں وہی معنی ہم بھی لیں گے تو مطلب ٹھیک نکلے گا۔ اب غیر مقلدین نے لفظ تو عربی کا لیا لیکن معنی اردو کے محاورے کا فٹ کیا تو مطلب غلط ہو گیا۔ اس لیے اگر جملہ عربی زبان کا ہو اور ترجمہ بھی عربی زبان کے محاورے کے مطابق ہو تو کبھی بھی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

عذابِ قبر کا ثبوت:

﴿فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾﴾

اللہ نے اس مرد مؤمن کو ان فرعونیوں کی بری چالوں سے بچا لیا اور فرعونیوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ آگ ہے جس کے سامنے فرعونیوں کو صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور جب قیامت قائم ہو گی تو اس دن حکم ہو گا کہ فرعونیوں کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔

یہاں فرعونیوں کے لیے اللہ نے تین قسم کے عذاب کا ذکر کیا؛ ایک عذاب دنیا کا، ایک عذاب قبر کا اور ایک عذاب آخرت کا، اور لفظ تینوں کے لیے الگ الگ لائے ہیں۔

[1]: ﴿وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ﴾

آلِ فرعون کو دردناک عذاب نے گھیر لیا۔

[2]: ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾

صبح وشام ان پر آگ پیش کی جاتی ہے، برزخ اور قبر میں۔

[3]: ﴿وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾

قیامت کا دن ہو گا تو حکم ہو گا کہ فرعونیوں کو سخت عذاب یعنی جہنم میں داخل کر دو۔

تین عذاب تھے تو لفظ تینوں کے لیے الگ الگ لائے۔ دنیا کے لیے الگ، برزخ کے لیے الگ اور آخرت کے لیے الگ۔ چونکہ تینوں عذابوں کی نوعیت الگ الگ ہے اس لیے لفظ الگ الگ لائے ہیں۔

دنیا کا عذاب کیا تھا؟ ﴿وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ﴾ کہ کبھی عذاب جوں کا ہے، کبھی عذاب مینڈکوں کا ہے، کبھی عذاب خون کا ہے، کبھی عذاب ٹڈیوں کا ہے اور آخری عذاب یہ تھا کہ جب فرعونی سمندر کے قریب گئے، بنی اسرائیل تو گزر گئے لیکن یہ راستے میں پھنس گئے اور پانی نے ان کو ختم کر دیا۔ یہ دنیا کا عذاب تھا، سب کو عذاب نے اپنے اندر لے لیا، کوئی اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکا۔

اور جب برزخ کے عذاب کی باری آئی فرمایا: ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾

آلِ فرعون کی روحیں کہاں ہیں؟

یہاں آپ دو روایتیں سمجھیں! ایک روایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے جو تفسیر عبد الرزاق میں بھی ہے اور تفسیر مظہری میں بھی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

آلِ فرعون کی جو روحیں ہیں یہ کالے رنگ کے پرندوں کے پیٹوں میں لا کر

صبح وشام جہنم پر پیش کی جاتی ہیں، ان کو جہنم پر لے آتے ہیں پھر ان کو دکھاتے ہیں یہ تمہارا ٹھکانا ہے۔[81]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کے بعد انسان کو صبح وشام وہ مقام دکھایا جاتا ہے جہاں اس نے قیامت کے حساب کتاب کے بعد پہنچنا ہے۔ جو شخص مؤمن ہے تو اس کو اس کا ٹھکانا جنت دکھایا جاتا ہے کہ حساب کے بعد تم نے یہاں جانا ہے اور اگر وہ شخص کافر ہو تو اسے اس کا ٹھکانا جہنم دکھایا جاتا ہے کہ حساب کے بعد تمہیں یہاں بھیجنا ہے۔[82]

اب بعض لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت لیتے ہیں اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما والی روایت کو چھوڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں عذاب روح کو ہوتا ہے کیونکہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عالم برزخ میں فرعونیوں کی روحیں جو کالے رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں ان کو جہنم دکھائی جاتی ہے۔

میں نے کہا کہ صرف ایک روایت کو نہ دیکھو بلکہ صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بھی دیکھو کہ مؤمنین کو ان کا ٹھکانا جنت اور کفار کو ان کا ٹھکانا جہنم دکھایا جاتا ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں روح کو عذاب دکھایا جاتا ہے اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جسم کو دکھایا جاتا ہے کہ یہ

81۔ تفسیر عبد الرزاق: ج3 ص147، التفسیر المظہری: ج8 ص261

82۔ صحیح البخاری، رقم: 3240

تمہارا اٹھکانا ہے۔

ہمارا اھل السنۃ والجماعۃ کا موقف یہ ہے کہ موت کے بعد اصلاً ثواب اور عذاب روح کو ہوتا ہے اور روح کے واسطہ سے جسم کو ہوتا ہے۔ اب یہ دونوں روایتیں جمع ہو جائیں گی کہ نہ ثواب وعذاب صرف روح کو ہے اور نہ صرف جسم کو ہے بلکہ روح اور جسم دونوں کو ہے۔ مؤمنین کی ارواح علیین میں چلی جاتی ہیں تو روح کا تعلق جسم کے ساتھ رہتا ہے، کفار کی ارواح سجین میں چلی جاتی ہیں تو بھی روح کا تعلق جسم کے ساتھ رہتا ہے۔ جسم قبر میں رہ کر جو اپنا ٹھکانا دیکھتا ہے یہ روح کے تعلق سے دیکھتا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ثواب وعذاب روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ حدیث پاک میں ہے کہ اگر قبر میں مؤمن ہو تو ایک فرشتہ آسمان سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ فرمارہے ہیں "أَنْ قَدْ صَدَقَ عَبْدِیْ" کہ میرے بندے نے سوالوں کا صحیح جواب دیا ہے، "فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ" اس کو جنت کا بچھونا دو! "وَأَلْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ" اس کو جنت کالباس دے دو!، "وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ" جنت کی طرف سے دروازہ کھول دو!، "فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيبِهَا" جنت اپنی جگہ پر رہتی ہے اور میت اپنی جگہ پر۔ جنت سے خوشبو اور ہوا آتی ہے۔

مؤمن جنت میں داخل نہیں ہو رہا بلکہ اپنی قبر میں ہے، اس پر جنت کھلتی ہے۔ اسے کہتے ہیں؛ عرضِ جنت۔

قبر میں اگر کافر ہے تو اعلان ہوتا ہے "أَنْ كَذَبَ فَأَفْرِشُوهُ مِنَ النَّارِ وَأَلْبِسُوهُ مِنَ النَّارِ" کہ اس بندے نے جھوٹ بولا ہے، اس کو جہنم کا بچھونا دو، جہنم کا لباس دو، "وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى النَّارِ" جہنم کی طرف والا دروازہ کھول دو، "فَيَأْتِيهِ مِنْ

حَرِّهَا وَسَمُومِهَا" پھر جہنم کی گرمی اور لو اس کی قبر میں آتی ہے۔[83]

تو کافر جہنم میں داخل نہیں ہو رہا بلکہ اپنی قبر میں ہے اور اس پر جہنم کھلتی ہے۔ اسے کہتے ہیں؛ عرضِ نار، اور ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا﴾ میں یہی عرضِ نار مراد ہے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ثواب و عذابِ قبر بھی ہے اور اس کی نوعیت عرضِ جنت اور عرضِ نار کی ہے اور ثوابِ جنت اور عذابِ جہنم بھی ہے اور اس کی نوعیت دخولِ جنت اور دخولِ جہنم کی ہے۔ بس یہ ہے اصل معاملہ، اس کو سمجھنا ضروری ہے۔

انبیاء و مؤمنین کی مدد:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾﴾

ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فاتحِ مکہ بنے، موسیٰ علیہ السلام بچ گئے اور فرعون ہلاک ہو گیا لیکن کتنے انبیاء ایسے ہیں کہ جو شہید ہو گئے تو سوال یہ ہے کہ ان کی مدد کیسے ہے؟ کتنے مؤمن ایسے ہیں جو زندگی جیل میں گزارتے ہیں اور ان کا جنازہ وہیں سے اٹھتا ہے۔ ان کی مدد پھر کیسے ہوئی؟

اس کا ایک جواب علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ یہاں "نصر" کا معنی انتصار اور انتقام ہے یعنی اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ایمان والوں کا اور نبیوں کا بدلہ لیتے ہیں۔ جب کوئی ظالم؛ کسی مؤمن یا کسی نبی پہ ظلم کرتا ہے تو اللہ اس ظلم کا بدلہ ان ظالموں کو

83۔ سنن ابی داؤد، رقم:4755

دنیا میں دیتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی قبیلہ کے حلیف ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ جب مشکل وقت آن پڑا تو ہم آپ کی مدد کریں گے اور وہ قبیلہ بھی کہتا ہے کہ ہم بھی مشکل وقت میں آپ کی مدد کریں گے۔ دونوں کا معاہدہ ہو گیا۔ دشمن نے اچانک آپ کے حلیف قبیلے پر حملہ کر دیا اور ان کے کچھ بندے قتل کر دیے اور کچھ بندے قید کر لیے۔ اب آپ کے مدد کرنے کا مطلب کیا ہے کہ جو مر چکے تھے ان کو زندہ کریں گے؟ اب مدد کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارا بدلہ لیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی بندہ قتل ہو جائے اور اس کا بیٹا رو رہا ہو کہ میرا باپ قتل ہو گیا ہے، بیٹی رو رہی ہے کہ میرا باپ قتل ہو گیا، بیوی رو رہی ہے کہ میرا شوہر قتل ہو گیا، ماں رو رہی ہے کہ میرا بیٹا قتل ہو گیا۔ اس مقتول کے ورثاء کی مدد یہ ہے کہ قاتل کو سزا دو۔ اب یہ ورثاء کہیں گے کہ اس نے بدلہ دلوا کر ہماری مدد کی ہے۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ جب آپ کے بیٹے پر کوئی بندہ حملہ کرے تو کوئی آپ کے بیٹے کو بچا لے، یہ بھی مدد ہے اور بیٹا قتل ہو جائے اور بیٹے کا بدلہ لے دیں تو یہ بھی مدد ہے۔ اللہ رب العزت کبھی ایمان والوں اور نبیوں کی مدد یوں کرتے ہیں کہ ان کے دشمن کو ختم کر دیتے ہیں اور نبی اور ایمان والے کو بچا لیتے ہیں اور کبھی مدد یوں کرتے ہیں کہ نبی اور ایمان والا شہید ہو جاتا ہے اور اللہ ان کا بدلہ خود لیتے ہیں۔ جب یہ بات ذہن میں ہو گی تو پھر الجھنیں نہیں رہتیں۔

اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ﴿لَنَنْصُرُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کی مدد کرتے ہیں دلیل کے ساتھ یعنی مؤمن اور نبی کا جو مخالف ہے وہ طاقت میں غالب آ بھی جائے تو دنیا دار الامتحان ہے، دار الابتلاء ہے لیکن دلیل کے درجے میں نبی اور مؤمن پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا۔ تو ہم قوتِ دلیل سے ان کی مدد فرماتے ہیں، یہ تھوڑے ہو کر بھی زیادہ نظر آتے ہیں، یہ کم ہو کر بھی غالب نظر آتے ہیں لیکن غالب

بالدلیل ہوتے ہیں۔

نبی کی طرف "ذنب" کی نسبت کا معنیٰ:

﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾﴾

آپ صبر کریں، بے شک اللہ کا وعدہ حق اور سچ ہے اور آپ اللہ سے معافی مانگیں اپنے ان معاملات کی جو آپ کی شان کے لائق نہیں تھے اور صبح وشام اللہ کی تسبیح اور تحمید کریں۔

اب اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس میں ذنب کی نسبت نبی کی طرف ہے۔ اور ذنب عام طور پر گناہ کو کہتے ہیں۔

اس کے کئی جوابات ہیں:

ذنب ایک لفظ ہے، اگر اس کی نسبت نبی کی طرف ہو جائے تو اس کا معنی اور ہوتا ہے اور جب اس کی اضافت امتی کی طرف ہو جائے تو اس کا معنی اور ہوتا ہے، معنی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ جس طرح محبت ایک لفظ ہے، اس کی نسبت ماں کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے، بیوی کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے، بیٹی کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے، بہن کی طرف ہو جائے تو معنی اور ہے۔ اب لفظ ایک ہے نسبت کے بدلنے سے معنی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ذنب ایک لفظ ہے، اس کی نسبت امت کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے اور نبی کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔ یہاں ﴿وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ کا معنی یہ نہیں کہ جیسے امتی گناہ کرتا ہے ایسے ہی نبی کا گناہ ہوتا ہے! یہ معنی بدلتا کیسے ہے ذرا اس کو سمجھیں۔

پہلے میں مثال دیتا ہوں پھر میں بات سمجھاتا ہوں۔ آپ کے ہاں ایک مہمان

آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے دودھ پینا ہے اور شیشے کے گلاس میں چاہیے۔ آپ بچے کو گھر بھیجتے ہیں دودھ لینے کے لیے، اسے ٹھوکر لگی، گلاس گرتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے اور دودھ گر جاتا ہے۔ بچہ کہتا ہے: استاد جی! مجھے معاف کردیں، مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ آپ کہتے ہیں: تم نے جان بوجھ کر توڑا ہے؟ کہتا ہے: نہیں۔ آپ کہتے ہیں پھر غلطی کس بات کی؟ جاؤ جا کر بیٹھو اور سبق پڑھو۔ استاد جی! معاف کردیں۔ بیٹا! چلے جاؤ کلاس میں بیٹھو۔ وہ پھر کہتا ہے: استاد جی! مجھے معاف کردیں، مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ اب مہمان آپ سے کہتا ہے کہ استاذ جی! اس کی غلطی تو نہیں ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑا احساس قسم کا لڑکا ہے، آپ اسے کہہ دیں کہ میں نے معاف کیا۔ آپ کہتے ہیں کہ بیٹا! تیری غلطی تو نہیں ہے لیکن جسے تو غلطی کہتا ہے چلو میں نے معاف کیا۔ اب وہ لڑکا خوش ہوتا ہے کہ استاد جی نے معاف کردیا۔

اسی طرح ایک کام پیغمبر کرتا ہے اور وہ گناہ نہیں ہوتا موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو مکا مارا وہ مر گیا گناہ تو نہیں تھا جان بوجھ کر تھوڑا مارا لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ سے کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ میں نے مکا مارا، جان سے مارنے کی نیت نہیں تھی لیکن پھر بھی میرے مکے سے مرا ہے آپ مجھے معاف کردیں۔

اب اللہ نبی کے اس لفظ کو نقل کرتے ہیں ﴿وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ یہ گناہ نہیں ہے لیکن جس کو آپ گناہ کہہ رہے ہیں ہم نے وہ بھی معاف کیا۔ تو ذنب ایک ہی لفظ ہے، اس کی نسبت نبی کی طرف ہو تو معنی یہ ہے کہ وہ گناہ ہوتا نہیں ہے لیکن نبی اس کو گناہ فرما رہے ہوتے ہیں اور جس ذنب کی نسبت امت کی طرف ہو تو وہ گناہ ہوتا ہے۔ اس لیے دونوں میں فرق ہے۔

مغفرت سے فتح کا تعلق؟

جیسے سورۃ الفتح میں ہے: ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا

تَاَخَّرَ﴾۔ اب یہاں ذنب کا معنی ”گناہ“ کریں تو آیت میں جوڑ ہی نہیں ہو گا۔ اگر معنی یہ کریں کہ ”ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کے گناہ معاف کر دیں“ تو سوال یہ ہے کہ فتح سے گناہ کی معافی کا کیا تعلق ہے؟ ہاں یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ بدلہ لیں! ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ ریاست قائم کریں! ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کو عزت ملے! ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ اسلام غالب آجائے... یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو فتح دی تاکہ گناہ معاف ہوں تو فتح اور گناہوں کی معافی کا کیا جوڑ ہے؟!

مثلاً آپ کے علاقے میں الیکشن ہوتا ہے، ایک کافر امیدوار ہے اور ایک مسلمان ہے، دونوں مقابلہ کرتے ہیں، مسلمان امیدوار ایم این اے بن جاتا ہے۔ آپ اس کے پاس پانچ کلو مٹھائی لے کر جائیں اور کہیں: مبارک ہو! آپ کے گناہ معاف ہو گئے! کیونکہ آپ جیت گئے ہیں۔ تو سارے کہیں گے کہ یار تو عجیب آدمی ہے، وہ ایم این اے بن گئے اور تو کہتا ہے کہ گناہ معاف ہو گئے۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ یہاں ذنب کا معنی گناہ ہے ہی نہیں۔ یہاں ہے ﴿لِّيَغۡفِرَ﴾ اور یہ غفران سے ہے جس کا معنی ہے ڈھانپ لینا۔ یہاں ذنب سے مراد ہے الزام اور الزام آدمی کسی کے سامنے نہیں لگاتا، ہمیشہ پشت کے پیچھے لگاتا ہے۔ ذنب عربی میں دم کو بھی کہتے ہیں اور دم جانور کے پیچھے ہوتی ہے، اور الزام بھی چونکہ کسی کی پیٹھ پیچھے لگایا جاتا ہے اس لیے اس کو ذنب کہتے ہیں۔ اب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے پیغمبر! یہ جو الزامات آپ پر لگتے تھے تو ہم نے سارے الزامات آپ کو فتح دے کر ڈھانپ دیے۔ ﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾ یہ لوگ آپ کے مخالف تھے اس لیے الزام لگاتے تھے لیکن اب آپ کے غلام بن جائیں گے، اب الزام نہیں لگائیں گے، ہم نے فتح کے بعد

سارے الزام ڈھانپ دیے۔

جیسے آپ سال کے لیے جماعت میں جائیں تو لوگ باتیں کریں گے کہ بیوی کا حق نہیں ہے؟ بچوں کا حق نہیں ہے؟ کتنا ظالم ہے، اسے دنیا کی فکر ہے لیکن اپنی اولاد کی نہیں اور جب آپ سال کے بعد گاؤں واپس آئے اور ساتھ یہ بھی پتا چل جائے کہ یہ گیا تو سال کے لیے تھا لیکن ساتھ انگلینڈ میں ملازمت بھی مل گئی ہے، یہ گیا تو سال کے لیے تھا لیکن اس کو وہاں سے اچھے خاصے ہدیے مل گئے ہیں، گیا تو سال کے لیے تھا لیکن وہاں ایک بندہ مل گیا تھا جس نے کہا کہ میں آپ کا سارا مدرسہ بنا دوں گا اور اس کے آنے سے پہلے مدرسہ بننا شروع بھی ہو جائے۔ تو اب کوئی بھی الزام نہیں لگائے گا کہ اسے بیوی بچوں کی فکر نہیں بلکہ ہر کوئی کہے گا کہ ماشاء اللہ آپ کا سال تو زبردست ہوا یار، مزا آ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے لوگ آپ کے مخالف تھے لیکن اب وہ سمجھیں گے کہ آپ کے قریب آنے سے ان کا فائدہ ہے، ان کی عزت ہے۔ جب خاندان میں آپ کا قد بڑھتا جائے گا تو خاندان آپ کے قریب آتا جائے گا۔ لیکن اگر آپ کا قد کم ہوتا جائے تو لوگ دین کے نام پر آپ کو بدنام کرتے جائیں گے۔

اخلاق کب دیکھے جاتے ہیں؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اخلاق مدینہ منورہ میں تھے وہی اخلاق مکہ میں تھے، یہ نہیں کہ آپ کے مکہ میں اخلاق کم تھے اور مدینہ میں زیادہ تھے۔ جب آپ مکہ میں تھے تو اس وقت کانٹے بچھائے جا رہے تھے، مکہ میں تھے تو اوجھڑیاں اوپر پھینکی جا رہی تھیں، مکہ میں تھے تو قتل کے منصوبے بنائے جا رہے تھے اور جب آپ فاتح بن کر آئے تو اب لوگوں نے کہا کہ محمد بہت اخلاق والے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

مجھے آپ بتائیں! جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے تو مکی زندگی میں لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کرتے تھے تو حضور نے بدلہ لیا یا معاف کیا؟ (معاف

کیا۔ سامعین) اور جب فاتح بن کر آئے تو مخالفین کو معاف کیا یا بدلہ لیا؟ (معاف کیا۔ سامعین) میرے علم میں کوئی ایک کتاب حدیث یا تاریخ کی نہیں ہے، میرے علم میں کسی بڑے سے بڑے کافر اسکالر کا جملہ بھی نہیں ہے جس نے لکھا ہو کہ حضور بہت اخلاق والے تھے کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ والے ظلم کرتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ میں نے معاف کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کب بتانے تھے؟ جب آپ فاتح بن کر گئے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں نے معاف کیا۔ اس کی وجہ کہ جب بدلہ لینے کا وقت ہو اور بدلہ لینے پر قادر ہوں اور پھر کہیں کہ میں نے معاف کیا تو اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ بڑے اخلاق والے ہیں اور جب طاقت نہ ہو اور بدلہ لینے پر قادر بھی نہ ہوں اور پھر کہیں کہ میں نے معاف کیا تو لوگ اس کو اخلاق نہیں کہتے، لوگ اس بندے کا مذاق اڑاتے ہیں۔

میں اس لیے گزارش کیا کرتا ہوں کہ اخلاق حاکم کے دیکھے جاتے ہیں، اخلاق محکوم کے نہیں دیکھے جاتے۔ ہم محکوم بن کر خوش اخلاق بننا چاہتے ہیں! محکومیت کی حالت میں کوئی آپ کے اخلاق نہیں دیکھے گا۔

ہمارا کوئی تبلیغی ساتھی امریکہ جائے، انگلینڈ جائے یا دنیا کے کسی اور ملک میں جائے تو کھڑا کر کے تلاشی لیں گے حالانکہ اس کے چہرے پر ڈاڑھی ہے، سر پر پگڑی ہے، بہت نیک ہے پھر بھی تلاشی لیں گے اور آپ اسی ڈاڑھی اور پگڑی کے ساتھ وزیر اعظم بن کر جائیں تو اب تلاشی کوئی نہیں لے گا۔ پہلے بھی یہ ڈاڑھی اور پگڑی تو تھی لیکن وہ ایک عام بندہ تھا تو نوعیت الگ تھی۔ اب چونکہ حیثیت بدل گئی ہے تو تمام لوگوں کا مزاج آپ کے بارے میں بدل جائے گا۔

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اخلاق بہت بڑی چیز ہیں لیکن کب؟ جب آپ غالب ہوں، آپ طاقتور ہوں، آپ بڑے

عہدے پر ہوں تو پھر آپ کے اخلاق سے لوگ متاثر ہوں گے۔ آپ محکوم ہوں گے تو آپ کے اخلاق سے لوگ متاثر نہیں ہوں گے، کوئی بندہ آپ کے اخلاق دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔

رات اور سکون:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾﴾

اللہ نے تمہارے لیے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو بنایا تاکہ تم اس میں دیکھو، دن میں کام کیا کرو۔ یعنی اللہ نے دن اور رات کا نظام ایسا بنایا ہے کہ رات کو چونکہ نیند کے لیے بنایا تو اس میں روشنی ختم ہو جاتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے اور نظام ایسے بنتا ہے کہ آدمی سوئے تو مزا آتا ہے۔ اگر کام کرنا چاہے تو اس کو لائٹ جلانا پڑتی ہے اور دن کو جلی جلائی لائٹ ہے، بس یہاں کام کے لیے لائٹ نہیں جلانی پڑتی۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت اور فطرت یہی ہے کہ بندہ دن کو کام کرے اور رات کو آرام کرے۔ ہاں اگر کوئی تقاضا اور ضرورت ہو اور اس کی وجہ سے رات کو کام کرنا پڑے تو کام کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ کام کرنا گناہ ہے۔

اِترانے اور اَکڑنے میں فرق:

﴿ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾﴾

کفار سے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں عذاب اس لیے ہوا کہ تم ناحق زمین میں اِتراتے تھے اور اس لیے کہ تم اکڑ دکھاتے تھے۔

ان کفار کو جو عذاب دیا گیا تو اس کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں:

♦ ”تَفۡرَحُوۡنَ“ ♦ ”تَمۡرَحُوۡنَ“

”تَفۡرَحُوۡنَ“ کے ساتھ ”بِغَيۡرِ الۡحَقِّ“ کی قید ہے اور ”تَمۡرَحُوۡنَ“ کے ساتھ کوئی قید نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہے فرح اور ایک ہے مرح۔ فرح کا معنی ہوتا ہے خوشی، یہ شریعت میں مطلوب ہے اور جب ناحق ہو تو یہ غلط ہے۔ اور مرح کا معنی ہوتا ہے اکڑنا، یہ شریعت میں مطلوب نہیں ہے، اکڑنا؛ یہ حق ہوتا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ناحق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو اللہ پاک گاڑی اچھی دیتا ہے، پیسے دیتا ہے، کپڑے دیتا ہے، مکان دیتا ہے، منصب دیتا ہے۔ یہ بندہ کہتا ہے: یااللہ! تیرا شکر ہے۔ یہ بندہ خوش ہو رہا ہے۔ ایک آدمی یوں خوش ہو رہا ہے کہ میرے پاس تو گاڑی ہے اور اُس کے پاس صرف سائیکل ہے۔ اب یہ خوشی ناحق ہے۔ اب گناہ ہو گا۔ اس لیے قرآن کریم میں فرمایا: ﴿فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا﴾[84] کہ اللہ کی نعمتوں پر خوش ہونا چاہیے۔

یہاں فرمایا کہ ان کو عذاب دیا فرحت کی وجہ سے، اس لیے کہ ﴿تَفۡرَحُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ﴾ کہ خوشی ناحق تھی اور یہ عذاب کا سبب ہے اور خوشی حق ہو تو یہ شریعت میں مطلوب ہے۔ اللہ فرماتے ہیں؛

﴿وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ۝۱۱﴾[85]

کہ آپ اپنے رب کی نعمتوں کا اظہار فرمائیں۔ تو یہ چیزیں اللہ پسند فرماتے ہیں لیکن ناحق پر اللہ گرفت بھی فرماتے ہیں۔

84۔ یونس 58:10

85۔ الضحیٰ 11:93

پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار پر عذاب کا انتظار:

﴿فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۷۷﴾﴾

اللہ اپنے نبی سے فرمارہے ہیں کہ اے میرے پیغمبر! آپ کچھ انتظار کریں، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ ہم نے ان کافروں کے ساتھ جس عذاب کا وعدہ کیا ہے یا تو آپ کی زندگی میں اس عذاب کا کچھ حصہ ان کو دے دیں گے یا آپ کی وفات کے بعد دیں گے لیکن دیں گے ضرور۔

اب دیکھو! کفار پر عذاب کا اللہ کے نبی انتظار فرمارہے ہیں نا، تبھی تو اللہ فرما رہے ہیں کہ "فَاصۡبِرۡ"۔ میں بارہا کہتا ہوں کہ شریعت کو سمجھو! ہمیشہ ایک دماغ بنانا اور ہمیشہ ایک ہی بات کہنا کہ اللہ کے نبی نبی الرحمۃ تھے اس لیے حضور چاہتے تھے کہ کافروں پر عذاب نہ آئے... یہ بات درست نہیں! اللہ تو فرمارہے ہیں "فَاصۡبِرۡ" کہ آپ انتظار کریں، اللہ کا وعدہ برحق ہے، ہم ان کو عذاب دیں گے، آپ کی زندگی میں دیں یا آپ کی وفات کے بعد دیں لیکن دیں گے ضرور! اور یہ "فَاصۡبِرۡ" کب کہتے ہیں کہ جب بندے کو انتظار ہو یا نہ ہو؟ (انتظار ہو۔ سامعین) تو ان کفار پر عذاب کا حضور بھی انتظار فرماتے تھے کہ ان پر عذاب کب آئے گا!

باقی یہ بات کہ عذاب کا انتظار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کے خلاف ہے؟ تو ہرگز نہیں، شانِ رحمت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ کفار کو عذاب دینے کا مقصد یہ تھا کہ:

نمبر 1: جن مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے وہ اس سے خوش ہوں گے کہ ظالم کو سزا ملی ہے اور مسلمان کو خوش کرنا یہ رحمت کا تقاضا ہے۔

نمبر2: اگر یہ کافر زندہ رہے تو مزید کفر کا سبب بنیں گے۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی دعا مانگی تھی: ﴿اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ﴾[86] اے اللہ! اگر آپ ان کو چھوڑ دیں گے تو یہ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾﴾[87] اے اللہ! ان کے مال کو تباہ وبرباد کر دیں اور ان کے دلوں کو اتنا سخت کر دیں کہ یہ اس وقت تک ایمان نہ لا سکیں جب تک اپنی آنکھوں سے عذاب نہ دیکھیں لیں۔

اس لیے پیغمبر کو بھی انتظار تھا کہ ان کو اب ختم ہونا چاہیے۔ آپ نے تیئیس سال محنت کی ہے، دعوت دی ہے، ان کافروں نے مسلمانوں پر بار بار ظلم کیا ہے تو اب ظالم کو باقی نہیں رہنا چاہیے۔ فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ﴾ میرے پیغمبر! آپ انتظار فرمائیں، ہم آپ کا بدلہ ان سے ضرور لیں گے۔

وحی کے مقابلے میں کفار کا اپنے فن پر اترانا:

﴿فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾﴾

جب کفار کے پاس انبیاء علیہم السلام دلائل لے کر آتے تو کفار اپنے علم پر بڑے خوش ہوتے اور اِتراتے تھے۔ اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے ان کو گھیر لیا۔

86۔ نوح 27:71

87۔ یونس 88:10

وحی کے مقابلے میں جو فن ہوتا ہے اس کو علم نہیں کہتے، قرآن اسے علم کہہ رہا ہے، اس کی وجہ ﴿يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝﴾[88] کہ وہ لوگ دنیا کی زندگی کے صرف ظاہری پہلو کو ہی جانتے تھے، آخرت کے معاملے میں بالکل غافل تھے۔ جب پیغمبر ان کے پاس دلائل لے کر آتے اور آخرت کی بات کرتے تو یہ لوگ اپنے ظاہری علم کی بنا پر اِتراتے، چونکہ ان کو دنیا کا یہ فن معلوم تھا کہ بلڈنگ کیسے بنتی ہے، کشتی کیسے بنتی ہے، جنگ کیسے کی جاتی ہے، مال کیسے اکٹھا کیا جاتا ہے؟ تو یہ لوگ اِس پر اتراتے تھے، اس پر اکڑتے تھے۔ اس لیے یہاں فرمایا: ﴿ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا﴾ کہ ان کے پاس حقیقی علم نہیں تھا بلکہ بس ظاہری سا علم تھا۔ اب اس آیت کو ملائیں گے تو ﴿فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ﴾ کو سمجھنا آسان ہو گا کہ ان کے پاس علم نہیں تھا بلکہ دنیاوی زندگی کا ظاہری علم و فن اور ظاہر ہنر تھا۔ یہ لوگ اپنے ظاہری علم پر اکڑتے تھے کہ ہمارے پاس طاقت اور قوت ہے، ہم کیوں کلمہ قبول کریں!

نزع کی حالت میں ایمان لانا معتبر نہیں!

﴿فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ وَكَفَرۡنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِيۡنَ ۝٨٤﴾

اور جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ ہم ایک اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور ہم ان کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے۔

﴿فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ قَدۡ

88۔ الروم 7:31

خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تب ایمان لانا ان کے لیے کچھ فائدہ مند نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی عادت اور معمول یہی ہے جو اس کے بندوں میں جاری رہی ہے- کہ عذاب کے بعد ایمان لانا نفع مند نہیں- اور اس موقع پر کافر لوگ نقصان میں پڑ گئے۔

حدیث پاک میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ.[89]

کہ جب غرغرہ کی حالت آ جائے، نزع کی حالت آ جائے تو اللہ توبہ قبول نہیں فرماتے۔

اللہ ہم سب کو بات ماننے والا بنائے، اللہ ہم سب کو ضدی لوگوں سے دور رکھے، اللہ ہم سب کو شریعت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

89۔ سنن الترمذی، رقم:3537

سورۃ حٰم السجدۃ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۚ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾﴾

میں نے کہا تھا کہ سات سورتیں ایسی ہیں کہ جن کے شروع میں حٰم آیا ہے۔ انہیں حوامیم بھی کہتے ہیں اور آل حٰم بھی کہتے ہیں اور پھر ہر ایک کو الگ کرنے کے لیے ساتھ کوئی لفظ بڑھا دیتے ہیں جیسے حم المؤمن، حم السجدۃ وغیرہ۔

ابو الولید عتبہ بن ربیعہ کے قرآن سننے کا واقعہ:

﴿تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۚ﴿۲﴾﴾

قرآن مجید اس ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حرم کعبہ کے ایک کونے میں الگ بیٹھے تھے اور عتبہ بن ربیعہ -ابو الولید جس کی کنیت تھی- وہ حرم کعبہ کے دوسرے کونے میں قریشیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے قریش سے کہا کہ اگر تم کہو تو میں جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کروں، صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کو کچھ پیشکش کروں کہ آپ تبلیغ چھوڑ دیں اور ہمارے مذہب کو برا نہ کہیں۔

ان لوگوں نے کہا کہ آپ چلے جائیں۔ تو عتبہ بن ربیعہ اٹھا اور آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے جا کر کہا کہ محمد! آپ ہم میں بڑے قابل احترام ہیں، آپ ایسی دعوت لے کر آئے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے خاندان میں پھوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے میں چند چیزیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں، آپ جس کو پسند فرمالیں ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ نے جو بات کہنی ہیں وہ کہہ دیں، میں آپ کی ساری بات سنتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بھتیجے! آپ نے جو دعوت اور تبلیغ شروع کی ہے اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا حاکم مان لیتے ہیں، بادشاہ بنا لیتے ہیں، اگر آپ کو دولت چاہیے تو ہم اکٹھی کر کے دے دیتے ہیں، یوں قریش میں سب سے بڑے مالدار آپ ہوں گے اور اگر آپ پر کوئی جن ہے، کوئی اثر ہے جس کی وجہ سے آپ ایسی باتیں کرتے ہیں تو ہم آپ کا علاج کرا لیتے ہیں۔

جب اس نے ساری بات کہہ لی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت حٰم السجدۃ کی تلاوت شروع فرمائی، جب آپ یہاں پر پہنچے ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ﴿١٣﴾﴾ تو ابو الولید پر خوف طاری ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ مبارک پر رکھا اور کہا کہ میں خاندان اور قرابت کا واسطہ دیتا ہوں کہ رک جائیں اور آگے نہ پڑھیں! ابو الولید ڈر گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پر عذاب آئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت شروع کی تو ابو الولید غور سے سننے لگا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم آیتِ سجدہ پر پہنچے تو آپ نے سجدہ کیا اور پھر فرمایا کہ ابو الولید! آپ نے میرا پیغام سن لیا ہے، اب آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہو کرو!

ابو الولید واپس آیا تو اس کا چہرا اترا ہوا تھا۔ قریش نے سمجھا کہ اس پر محمد کے کلام کا اثر ہو گیا ہے، صلی اللہ علیہ وسلم، اس نے آ کر کہا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے میں

اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر قریش کے علاوہ باقی عرب ان پر غالب آ گئے تو وہ ختم کر دیں گے اور ہمارا کام بغیر لڑائی کے ہو جائے گا اور اگر یہ باقی عرب پر غالب آ گئے تو ان کی حکومت ہماری حکومت ہے، ان کی عزت ہماری عزت ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کو چھوڑ دو! تو اس موقع پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات تلاوت فرمائی تھیں۔

رحمٰن اور رحیم کے معنی میں فرق:

﴿تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝۲﴾

یہاں پر ایک لفظ الرحمٰن ہے اور ایک لفظ الرحیم ہے۔ رحمٰن اور رحیم کے معنی میں فرق ہے۔ رحمٰن کہتے ہیں عام الرحمۃ کو اور رحیم کہتے ہیں تام الرحمۃ کو۔

رحمٰن کہ جس کی رحمت عام ہو اور رحیم کہ جس کی رحمت خاص اور مکمل ہو۔ کسی شخص کے پاس جتنی شفقت ہو وہ ساری ایک کو دے دے تو یہ ہو سکتا ہے اور ایک شخص اپنی شفقت ہر کسی کو دے دے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص کے پاس جتنی بھی دولت ہے ساری ایک شخص کو دے دے یہ تو ہو سکتا ہے لیکن ایک شخص کے پاس اتنی دولت ہو کہ دنیا میں ہر بندے کو دے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

تو ایک ہے عام الرحمۃ اور ایک ہے تام الرحمۃ۔ اللہ رب العزت کی رحمت عام بھی ہے اور تام بھی ہے۔ دنیا میں اللہ اپنی رحمت ہر کسی کو دیتے ہیں اور قیامت کے دن اللہ اپنی رحمت ہر کسی کو نہیں دیں گے بلکہ صرف ایمان والوں کو دیں گے۔ تو عام الرحمۃ والی صفت کا ظہور اس دنیا میں ہوتا ہے اور تام الرحمۃ والی صفت کا ظہور قیامت والے دن ہو گا۔

مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں!

کسی بشر کے لیے رحیم کا لفظ استعمال کرنا جائز ہے اور رحمٰن کا لفظ استعمال کرنا

جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٨﴾﴾ [90]

کہ تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمہاری تکلیف اس کو بہت گراں گزرتی ہے، اس کو تو بس تمہاری ہی فکر لگی ہوئی ہے۔ اور پیغمبر ایمان والوں کے لیے شفیق اور رحیم ہیں۔

تو یہاں ''رحیم'' کا لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن رحمٰن کا لفظ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

آپ تفسیر اٹھائیں گے تو وہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ لکھا ہوگا کہ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ ''نہایت رحم والا'' یہ رحیم ہے، کہ جتنا اس کے پاس ہے وہ سارا دے دے، یہ ہے رحیم۔

اور بندے کے پاس جو کچھ ہو وہ سب کسی کو دے دے تو یہ بندے کے اختیار میں ہے لیکن ہر کسی کو دے تو یہ بندے کے بس میں نہیں ہے، اس لیے کسی شخص کو رحمٰن کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ عبد الرحمٰن کو رحمٰن بھائی کہیں تو یہ ٹھیک نہیں ہے، عبد الرحیم کو رحیم بھائی کہیں تو یہ ٹھیک ہے۔ رحیم کا اطلاق مخلوق پر ہوا ہے لیکن رحمٰن کا اطلاق مخلوق پر نہیں ہوا۔ تو دونوں میں فرق ہے۔

اس لیے اللہ کے بارے میں کہتے ہیں؛ الرحیم فی الدنیا والرحمٰن فی الآخرۃ۔ دنیا میں اللہ کی رحمت ہر کسی کو ملتی ہے، کافر کو بھی اور مسلمان کو بھی لیکن آخرت میں اللہ صرف ایمان والوں کو دیں گے، وہاں کافر کو رتی برابر بھی رحمت نہیں دیں گے یعنی

90۔ التوبۃ 128:9

ایسی رحمت جس سے بندے کا کام ہوتا ہو ورنہ قیامت کے دن کسی نہ کسی درجے کی رحمت تو کافر کو بھی ملے گی۔ مثلاً حساب کتاب شروع نہ ہو تو بہت پریشانی ہے، حساب کتاب کا شروع ہو جانا یہ رحمت ہے، کافر کو جتنا عذاب ہوتا ہے اللہ اس سے زیادہ دینے پر قادر ہیں لیکن نہیں دیتے تو یہ بھی رحمت ہے۔ تو کافر کو کسی درجے میں رحمت ملے گی لیکن ایسی رحمت کہ جس کو نعمتوں سے تعبیر کریں، جس سے آسانیاں نظر آئیں یہ رحمت اللہ صرف مؤمن کو دیں گے، کفار کو نہیں دیں گے۔

قرآن کریم کو عربی میں نازل کرنے کی حکمت:

﴿كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳﴾

یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کے مضامین کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن عربی زبان میں ہے ایسے لوگوں کے لیے جو دانشمند ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے اس قرآن سے وہی لوگ نفع حاصل کرتے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

"فُصِّلَتْ" یہ "فَصْلٌ" سے ہے۔ مضمون الگ الگ بیان کریں تو بھی فَصْل ہوتا ہے اور مضمون ایک ہو اور کھل کر بیان کریں تب بھی فَصْل ہے۔

﴿بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۴﴾

یہ قرآن خوشخبری بھی دیتا ہے اور ڈراتا بھی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگوں نے قرآن سے منہ موڑ لیا ہے اور اس کو سنتے ہی نہیں!

بشیر اور نذیر جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتیں ہیں ایسے ہی قرآن کریم کی بھی صفتیں ہیں۔ "نذیر" ہیں کہ پہلے نافرمانوں اور نہ ماننے والوں کو ڈراتے ہیں اور "بشیر" ہیں کہ جب بندہ فرمانبردار بن جاتا ہے تو اسے خوشخبریاں دیتے ہیں۔ "بشیر" ہیں کہ مؤمنین کو خوشخبریاں دیتے ہیں اور "نذیر" ہیں کہ کفار کو ڈراتے

ہیں۔ تو یہ بشیر اور نذیر دونوں جگہ پر چلتا ہے، ہر ادارے میں چلتا ہے، ہر تحریک میں چلتا ہے اور یہی اسلوب اللہ پاک نے قرآن کریم میں بھی اختیار فرمایا ہے۔

کفار کی ہٹ دھرمی:

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝﴾

کافر کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں اس کے لیے ہمارے دل پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ پڑے ہوئے ہیں، ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب ہے - اس لیے ہم آپ کی بات نہیں سن سکتے - آپ اپنا کام کریں اور ہم اپنا کام کریں۔

اب دیکھو! جتنی باتیں وہ لوگ کر رہے تھے اس کا معنی یہ نہیں تھا کہ کوئی درمیان میں کوئی پردہ تھا، پردہ نہیں تھا کیونکہ ہوتا تو نظر آ جاتا۔ یہ محض کفار کی ہٹ دھرمی تھی کہ ہم تمہاری بات نہیں سن رہے۔ اب پیغمبر کو حکم ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

آپ فرمائیں کہ میں بھی تم جیسا انسان ہوں البتہ مجھ پر یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، بس اسی کی طرف متوجہ رہو اور اسی سے مغفرت مانگو!، اور مشرکین کے لیے تباہی ہے۔ جو بات نہیں مانتا وہ دنیا میں بھی تباہ ہو گا اور آخرت میں بھی تباہ ہو گا۔

کفار احکام کے مکلف ہیں یا نہیں؟

﴿الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝﴾

وہ مشرک تباہ ہوں گے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کا بھی انکار کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنا مسلمان کے ذمہ ہے احکام کا مکلف مسلمان ہوتا ہے کافر نہیں جب کافر احکام کے مکلف ہی نہیں ہیں تو ان کی برائی میں یہ بات کیوں کی جاتی ہے کہ زکوٰۃ نہیں دیتے؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ علماء میں اختلافی ہے بعض کہتے ہیں کہ جیسے مسلمان احکام کے مکلف ہیں ایسے کافر بھی احکام کے مکلف ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں مسلمان مکلف ہیں کافر مکلف نہیں ہیں۔

جو کہتے ہیں کہ کفار بھی احکام کے مکلف ہیں ان کے ہاں تو اعتراض ہی نہیں ہے۔ جن کے ہاں کافر احکام کے مکلف نہیں ہیں ان کے ہاں مطلب کیا ہے؟

ان کا مطلب یہ ہے کہ اصل میں یہ بتایا جارہا ہے کہ زکوٰۃ دینا مسلمان پر فرض ہے اگر تم مسلمان ہوتے تو تم بھی زکوٰۃ دیتے لیکن تم مسلمان نہیں ہو اس لیے تم زکوٰۃ بھی نہیں دیتے۔

﴿لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ کی اصل بنیاد ہے ایمان تباہی ہو مشرکین کے لیے کہ جو زکوٰۃ نہیں دیتے مسلمان ہوتے تو زکوٰۃ بھی دیتے چونکہ یہ مسلمان نہیں ہیں اس لیے زکوٰۃ بھی نہیں دیتے لہذا ان کے لیے تباہی ہے۔

اور یہ بات ان کو کیوں سمجھائی جارہی ہے حالانکہ مسلمان تو نماز بھی پڑھتا ہے، زکوٰۃ بھی دیتا ہے لیکن یہاں نماز کی بات نہیں کی زکوٰۃ کی بات کی ہے یہ بتانے کے لیے کہ عرب لوگ مالدار تھے اور یہ لوگ صدقہ بھی کرتے تھے، خرچہ بھی کرتے تھے، غریبوں پر مال خرچ کرتے تھے اور مہمانوں پر بھی مال خرچ کرتے تھے لیکن جو کلمہ پڑھتا اس پر خرچ کرنا بند کر دیتے تھے تو یہ طعنہ دیا جارہا ہے کہ جب تمہارا خرچ

کرنے کا مزاج ہے تو ایک مسلمان پر تمہارا ہاتھ کیوں تنگ ہوتا ہے؟

تو یہاں "لَا یُصَلُّوْنَ" کی بات نہیں کی ﴿لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ﴾ کی بات کی ہے کہ تمہارے پاس مال ہے تم خرچ بھی کرتے ہو لیکن جونہی مسلمان آتا ہے تو تم زکوٰۃ بھی نہیں دیتے خرچ بھی نہیں کرتے۔ تو موافق اور مخالف میں خرچ کے حوالے سے آدمی کا دل تھوڑا سا کھلا ہونا چاہیے، تمہارا یہ مزاج ٹھیک نہیں ہے۔

یہاں ﴿لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ﴾ فرمایا تو دوسرا سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ تو مکہ مکرمہ میں فرض ہی نہیں تھی مدینہ منورہ میں فرض ہوئی تھی تو یہاں زکوٰۃ کی بات کیسے کی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے اجمالی طور پر نماز اور زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں ہی فرض تھی جس طرح سورت مزمل سے پتہ چل رہا ہے۔ سورت مزمل مکی سورت ہے وہاں زکوٰۃ کا ذکر بھی ہے اور نماز کا ذکر بھی ہے تو نماز اور زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض تھی لیکن اجمالاً۔ نصاب اور تفصیلات مدینہ منورہ میں آئی تھیں۔ مکہ میں نماز فرض تھی چھپ کر دار ارقم میں پڑھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو نماز کھل کے پڑھی ہے تو نماز تھی تبھی تو پڑھ رہے تھے لیکن باقاعدہ پانچ اذانیں ہوں پانچ نمازیں ہوں پھر جماعت ہو پھر اتنی رکعات ہوں یہ اہتمام مکہ میں نہیں بلکہ مدینہ میں ہوا ہے۔

اس طرح زکوٰۃ خرچ کرنا یہ مکہ میں بھی تھا لیکن کتنا خرچ کرنا ہے، اس کی شرائط کیا ہیں، کس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟ یہ تفصیلات مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں۔

ایمان اور عمل صالح کا لامتناہی اجر:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے تو ان کے لیے ایسا اجر ہو گا جو کبھی ختم نہیں ہو گا۔

ختم نہ ہونے کے دو معنی ہیں؛ ایک معنی یہ ہے کہ اجر دائمی ہو گا جو جنت کی صورت میں ملے گا اور کبھی ختم نہیں ہو گا۔ دوسرا اس کا معنی یہ ہے کہ یہ اجر ایسا ہو گا کہ آدمی اعمال کرے صحت کی حالت میں اور پھر کسی بیماری کی وجہ سے عمل نہ کر سکے تو اللہ بیماری کی حالت میں بھی اس اجر کو باقی رکھتے ہیں جو حالتِ صحت میں ہوتا تھا۔

زمین پہلے بنی یا آسمان؟ ایک تعارض کا حل:

﴿قُلۡ اَئِنَّکُمۡ لَتَکۡفُرُوۡنَ بِالَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَ تَجۡعَلُوۡنَ لَہٗۤ اَنۡدَادًا ؕ ذٰلِکَ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۚ﴿۹﴾ وَ جَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِہَا وَ بٰرَکَ فِیۡہَا وَ قَدَّرَ فِیۡہَاۤ اَقۡوَاتَہَا فِیۡۤ اَرۡبَعَۃِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ ہِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَہَا وَ لِلۡاَرۡضِ ائۡتِیَا طَوۡعًا اَوۡ کَرۡہًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیۡنَا طَآئِعِیۡنَ ﴿۱۱﴾ فَقَضٰہُنَّ سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَہَا ؕ﴾

آپ فرمادیں کہ کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا ہے اور تم اس ذات کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو حالانکہ وہ ذات ایسی ہے جو تمام جہانوں کو پالنے والی ہے اور اسی نے زمین پر پہاڑ رکھ دیے اور اس میں برکت دی اور مخلوقات کی غذائیں اس زمین میں پیدا کیں تو یہ چار دن ہو گئے۔ اللہ نے یہ جو غذائیں پیدا فرمائی ہیں تو اس سے ضرورت مند یکساں طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے آسمان کا ارادہ فرمایا جو دھوئیں کی شکل میں تھا، آسمان اور زمین کو حکم فرمایا: جبراً ہو یا خوشی سے تم نے ہماری بات ماننی ہے تو آسمان اور زمین نے کہا کہ ہم خوشی سے مانتے ہیں۔ تو اللہ نے دو دنوں میں سات آسمان مکمل کر دیے - یوں چھ دن

مکمل ہوئے۔ پھر ہر آسمان میں اس کے مناسب جو حکم تھا وہ بھیجا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے زمین کو پہلے پیدا فرمایا اور سورۃ البقرۃ کی آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین پہلے بنائی گئی ہے اور آسمان بعد میں، اللہ نے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ﴾[91]

کہ اللہ نے پہلے زمین بنائی اور پھر آسمان کا ارادہ فرمایا اور سات آسمان تخلیق فرمائے۔

لیکن آخری پارے کی سورۃ النّٰزعٰت سے معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب اس سے الگ ہے کہ پہلے آسمان کو پیدا کیا گیا اور پھر زمین کو۔ سورۃ النّٰزعٰت میں ہے:

﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاۗءُ ۭ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾﴾[92]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پہلے بنایا اور زمین بعد میں۔ تو ان میں کیا تطبیق ہے؟

اس کا جواب جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ نے پہلے زمین کا مادہ بنایا اور پھر آسمان کا مادہ دُخانیہ بنایا۔ اس کے بعد آسمان کے مادہ دُخانیہ سے مکمل آسمان بنایا پھر زمین کے بنے ہوئے مادہ سے زمین کو مکمل

91۔ البقرۃ 29:2

92۔ النّٰزعٰت 27:79 تا 30

کیا۔ اب آیات کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہو گا۔[93]

تو یہاں جو ہے "خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ" کہ اللہ نے دو دنوں میں زمین کو بنایا تو اس سے مراد زمین کا مادہ ہے اور "ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ" سے مراد یہ ہے کہ زمین کا مادہ بنانے کے بعد پھر آسمان کا مادہ دخانیہ بنایا، اور سورۃ النّٰزعٰت سے جو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آسمان کو بنایا اور پھر زمین کو بنایا تو وہ اس طرح کہ آسمان کا جب مادہ دخانیہ بنایا تھا تو اس کو پہلے مکمل آسمان بنایا، پھر جو زمین کا مادہ تیار کیا تھا اس سے زمین کو مکمل بنا دیا۔ اب دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔

کس دن کس چیز کی تخلیق ہوئی؟

یہ دن کون کون سے تھے؟ تو اکثر روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ اتوار، پیر، منگل اور بدھ کے دن تھے۔ اتوار اور پیر کے دن زمین بنائی، منگل کے دن پہاڑ بنائے اور پہاڑوں سے متعلقہ جو چیزیں ہیں زمین کو مضبوط کرنے کے لیے وہ بنائیں، بدھ کو غذائیں، پانی اور چشمے بنائے۔ یہ چار دن ہو گئے۔ پھر جمعرات کے دن کو آسمان بنایا، آگے جو جمعہ کا دن تھا تو جمعہ کی تین ساعات میں سے کچھ وقت میں آسمان کو تیار کیا اور باقی جو ساعات رہ گئی تھیں تو اس میں مصائب و آلام، مشقتوں اور تکالیف کو پیدا کیا۔ پھر اس کے بعد آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، جنت میں رکھا، پھر فرشتوں اور ابلیس کو سجدے کا حکم دیا، ملائکہ نے سجدہ کر لیا لیکن ابلیس نے انکار کیا۔ یوں جمعہ کے دن سارے کام مکمل ہو گئے صرف چھ دن میں۔

اس پر اتنا سوال ذہن میں آتا ہے کہ اس وقت دن تو تھے ہی نہیں، دن تو بنے ہیں سورج بنانے کے بعد، تو پھر ان دنوں کا مطلب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں

93۔ بیان القرآن: ج3 ص325

دن سے مراد حقیقی دن نہیں ہے بلکہ دن سے مراد دنوں کی مقدار ہے۔ جیسے چوبیس گھنٹے کا ایک دن ہوتا ہے تو یہاں چوبیس گھنٹے... چوبیس گھنٹے... چوبیس گھنٹے... یوں دنوں کی مقدار بیان فرمائی ہے۔

اعضائے جسمانی کی گواہی:

﴿وَ يَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

اس دن کو یاد کرو جب اللہ کے دشمنوں کو آگ کی طرف ٹولیوں کی شکل میں لے جایا جائے گا۔ جب یہ آگ کے قریب جا پہنچیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔ یہ لوگ اپنی کھال اور دیگر اعضا سے کہیں گے کہ ہمارے خلاف تم کیوں گواہی دیتے ہو؟ وہ کہیں گے: جس طرح اللہ نے اوروں کو بولنے کی توفیق دی ہے ایسے ہی اللہ نے ہمیں بھی قوتِ گویائی عطا کی ہے، اس لیے ہم تمہارے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جارہا ہے۔

﴿وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَ لَا جُلُوْدُكُمْ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾

اور تم اس بات سے تو چھپ ہی نہیں سکتے تھے کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف گواہی دیں بلکہ تمہارا خیال تو یہ تھا کہ اللہ کو تمہارے کئی اعمال کا پتا ہی نہیں! حالانکہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے، یہ تمہارے اعضاء بھی

دیکھتے ہیں اور اللہ بھی تمہیں دیکھتا ہے۔

﴿وَ ذٰلِكُمۡ ظَنُّكُمُ الَّذِىۡ ظَنَنۡتُمۡ بِرَبِّكُمۡ اَرۡدٰٮكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝۲۳﴾

اللہ کی ذات کے بارے میں تمہارا یہی گمان تمہیں لے ڈوبا اور تم تباہ و برباد ہو گئے۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بیٹھے بیٹھے مسکرا دیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم سمجھے کہ میں کیوں ہنسا ہوں؟ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! نہیں، فرمایا کہ میں ہنسا اس بات پر ہوں کہ قیامت کے دن ایک بندہ اللہ سے کہے گا کہ یا اللہ! کیا آپ نے ہمیشہ مجھے ظلم سے بچا کر نہیں رکھا ہے؟ اللہ فرمائیں گے: بے شک بچا کر رکھا ہے۔ اس پر بندہ کہے گا کہ یا اللہ! اگر یہی بات ہے تو پھر میں اپنے بارے میں کسی اور کی گواہی پر مطمئن نہیں ہوں، ہاں اگر میرے اپنے اعضاء گواہی دیں تو میں مطمئن ہو جاؤں گا۔ اس وقت اللہ فرمائیں گے کہ اچھا تو پھر تم اپنا حساب خود لے لو۔ اس وقت اس کی زبان کو بند کر دیا جائے گا تو اس کے ہاتھ بولنا شروع ہو جائیں گے، اس کے پاؤں بولیں گے، اس کا جسم بولے گا۔ یہ شخص سوچ رہا تھا کہ میرے خلاف کوئی گواہی دینے والا ہے ہی نہیں تو جن اعضاء سے اس نے گناہ کیے تھے وہی اعضا اس کے خلاف بولنے لگ جائیں گے۔ پھر اس شخص کی زبان کھول دی جائے گی تو وہ اپنے اعضاء سے کہے گا کہ یہ سارا کچھ تو میں تمہارے مزے کے لیے کرتا تھا، تمہیں آرام پہنچانے کے لیے کرتا تھا اور آج تم ہی میرے خلاف گواہی دیتے ہو۔[94]

94۔ صحیح مسلم، رقم:2969

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں، اللہ ہم سب کو محفوظ رکھیں۔

اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگا کریں!

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾﴾

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ گئے-ڈٹنے کا معنی ہے کہ اس بات پر قائم رہے اور اس موقف پر مضبوط رہے- تو ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں، -جب موت کا وقت آتا ہے- ملائکہ کہتے ہیں کہ آئندہ کی زندگی کے بارے میں تمہیں خوف نہیں ہونا چاہیے اور جو پیچھے ہو چکا ہے اس پر تمہیں غم نہیں کرنا چاہیے کہ فلاں چیز چھوٹ گئی، فلاں چیز چھوٹ گئی، پچھلی پر غم نہ کرو اور آئندہ کا خوف نہ کرو، اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تمہارے ساتھ وعدہ ہے۔

﴿نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾

ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

مجھے سورت ہود نے بوڑھا کر دیا:

یہاں ”استقامت“ کا لفظ استعمال کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم استقامت کے معاملے سے بہت خوف زدہ ہوتے تھے۔ آپ نے پڑھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک باسٹھ سال ہو رہی ہے اور بیس کے قریب بال آپ کی ڈاڑھی مبارک اور سر مبارک میں سفید تھے، باقی سارے بال سیاہ تھے یعنی آپ کا بڑھاپا ہے کہ صرف چند ایک بال سفید ہوئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ کو کس چیز نے بوڑھا کر دیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ”شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا“ کہ مجھے سورت ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ عرض کیا

گیا کہ یا رسول اللہ! سورت ھود کی کس آیت نے؟ فرمایا: اس آیت نے ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ﴾ کہ تم ڈٹ جاؤ؟ اس آیت کے غم نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔[95]

اس لیے اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرنی چاہیے۔ استقامت بڑوں کا کام ہے، ہم بہت چھوٹے ہیں۔ ہمیں عافیت کی دعا کرنی چاہیے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا: یا رسول اللہ! اگر لیلۃ القدر مجھے مل جائے تو میں کون سی دعا مانگوں؟ فرمایا: یہ دعا مانگو!

"اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي."[96]

اے اللہ! آپ بہت زیادہ معاف فرمانے والے ہیں اور معاف فرمانے کو پسند بھی فرماتے ہیں، مولائے کریم مجھے معاف فرما دیں!

بھائی میرے لیے عافیت ہی مانگو!

اور میں کئی بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ جب کوئی مجھے استقامت کی دعا دیتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ استقامت کی دعا نہ دو بلکہ عافیت کی دعا دو۔ کئی بار ایسے ہوا ہے کہ میں جلسے سے فارغ ہوا ہوں اور کوئی دھڑلے دار بیان ہوا ہو تو لوگ فوراً کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ! اللہ آپ کو استقامت دے۔ میں انہیں کہتا ہوں کہ استقامت کا معنی کہ اب اس تقریر پر پرچہ ہو، میں تھانے جاؤں، پھر جوتے کھاؤں، پھر جیل جاؤں، پھر رِہا ہوں اور پھر اسی طرح تقریر کروں... یہ ہے استقامت، اس لیے یہ دعا کرو کہ اللہ آپ کو عافیت دیں۔ عافیت کا معنی کہ مولانا صاحب بیان کریں، دیسی گھی میں دیسی مرغا کھائیں، بہترین سی مچھلی کھائیں، اچھی سی فیس ملے، آرام سے گھر واپس جائیں، پھر دوسرے دن

95۔ المفردات: ص127

96۔ سنن الترمذی، رقم:3513

واپس آکر اسی طرح کا بیان کریں... یہ ہے عافیت۔ تو عافیت ٹھیک ہے یا استقامت ٹھیک ہے؟ (عافیت ٹھیک ہے۔ سامعین) اس لیے اللہ سے عافیت مانگا کریں۔ پھر میں ان سے کہتا ہوں کہ اپنے لیے استقامت مانگنی ہے تو شوق سے مانگو لیکن ہمارے لیے اللہ سے عافیت مانگو، ہم اللہ سے عافیت مانگتے ہیں۔

جنت عیش کی جگہ ہے:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾﴾

تمہیں جنت میں وہ کچھ ملے گا جو تم چاہو گے اور تمہیں جنت میں وہ کچھ ملے گا جو تم مانگو گے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ جنت کی تعریف میں فرماتے تھے کہ جنت چھوٹی خدائی کا نام ہے۔ بڑی خدائی تو یہ ہے: ﴿إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾﴾[97] کہ جو چاہو وہ ہو جائے، جس کا ارادہ کرو وہ ہو جائے۔ حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ جنت میں انسان جو چاہے گا وہی ملے گا تو یہ چھوٹی خدائی ہے کیونکہ یہ اپنے اختیار میں نہیں ہے، یہ اختیار اللہ نے دیا ہے جب چاہیں واپس لے لیں۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک شخص اڑتے ہوئے پرندے کو دیکھے گا اور اس کا جی چاہے گا کہ میں اس کا گوشت کھاؤں تو بغیر آگ کے بغیر دھویں کے وہ بھنا ہوا پرندہ اس کے سامنے پلیٹ میں آجائے گا اور یہ اسی وقت کھا لے گا۔ حتی کہ بعض روایات میں ہے کہ آدمی جنت میں چاہے گا کہ میرے ہاں اولاد پیدا ہو تو آناً فاناً حمل ہو گا اور اسی وقت بچہ پیدا ہو جائے گا۔

97۔ یٰس 82:36

جنت عجیب نعمت ہے اور آپ یقین فرمائیں بس عیش کرنے کی اصل جگہ جنت ہے اور یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةْ فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةْ." [98]

اے اللہ ! اصل عیش تو جنت کی عیش ہے، میرے انصار اور مہاجر صحابہ کی مغفرت فرما!

اور یہ بات میں کئی بار عرض کرتا ہوں کہ اللہ نے انسان کی فطرت میں بعض چیزوں کی خواہش رکھی ہے لیکن اس کی تکمیل کی جگہ دنیا نہیں ہے بلکہ اس کی تکمیل کی جگہ جنت ہے۔ مثلاً ہر انسان کی خواہش ہے من مانی زندگی۔ اگر من مانی زندگی انسان کی خواہش نہ ہوتی تو مان کے چلنا عبادت نہ ہوتا۔ مان کر چلنا عبادت اس لیے ہے کہ طبیعت میں من مانی کرنا ہے۔ اگر طبیعت میں بھی مان کے چلنا ہوتا اور پھر مان ہی کے چلتا تو یہ کون سی عبادت ہے؟ اصل عبادت تو بنتی ہی تب ہے کہ جی نہ چاہے اور انسان پھر بھی کام کرے، طبیعت نہ چاہے پھر بھی اعمال کرے لیکن من مانی کی خواہش جو طبیعت میں ہے اس کے پورا کرنے کی جگہ یہ دنیا نہیں ہے، اس خواہش کے مکمل ہونے کی جگہ آخرت ہے۔

ہمارے حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ نفس اتنا شرارتی ہے کہ دنیا جہان کے حسین اس کو دکھادو، یہ ساری خوبصورت عورتیں دیکھ لے اور اس کے کان میں کہو کہ ایک باقی ہے تو یہ اس کو بھی دیکھے گا۔ یہ نفس کا مزاج ہے۔

بازارِ جنت:

دنیا میں ایسے زندگی گزارو جس طرح اللہ چاہتے ہیں، جنت میں ویسی زندگی

98۔ صحیح البخاری، رقم:6414

گزاروگے جس طرح تم چاہوگے، دنیا میں اپنی شکل وصورت ایسی بناؤ جیسے اللہ کا حکم ہے اور جنت میں ایک بازار ہوگا "سُوقُ الصُّوَر" جو تصویروں کا بازار ہوگا، وہاں جاؤ، گھومو پھرو جیسی تصویر پسند آئے ویسی اپنی شکل بنالو۔ یہاں حمام میں نائی کے پاس جاؤ تو جو فوٹو لگے ہوئے ہوتے ہیں ان کے ڈیزائن کے مطابق اپنی کٹنگ نہیں کرانی اور جنت میں فوٹو لگے ہوئے ہوں گے تو یہ جو کٹنگ والی خواہش ہے یہ جنت میں پوری ہو جائے گی۔ بس دنیا میں تھوڑا سا ضبط کرلو، پھر آخرت میں بس مزے ہی مزے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو جنت کی طلب عطا فرمائیں۔ جنت کی یہ صفتیں اس لیے اللہ نے بیان فرمائی ہیں کہ بندوں کو آخرت کی فکر ہو اور رغبت ہو۔

ہم عمر بیویاں:

جنتی بیویوں کی ایک صفت "أَتْرَابًا" ہے یعنی ہم عمر۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ہم عمر کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ ان کی اور ان کے شوہروں کی عمر ایک جیسی ہوگی، اس سے مناسبت ہوتی ہے، اور ایک عجیب معنی یہ بھی لکھا ہے کہ شوہر کی ہم عمر نہیں بلکہ یہ آپس میں ہم عمر ہوں گی۔ کیونکہ اگر آپس میں ہم عمر نہیں ہوں گی تو سوکن کی رقابت ہوگی اور ایک جیسی ہوں گی تو کھیلتی رہیں گی۔ سوکنوں کا مزاج پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ پاک نے کیسی عجیب نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو عطا فرمائیں۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

"عَلَيْكُمْ بِالْأَبْكَارِ فَإِنَّهُنَّ أَعْذَبُ أَفْوَاهًا وَأَنْتَقُ أَرْحَامًا وَأَرْضٰى بِالْيَسِيْرِ." [99]

کہ جب شادی کرو تو اس عورت سے کرو جو کنواری ہو کیونکہ ان کا منہ میٹھا ہوتا ہے، ان کا رِحم ستھرا ہوتا ہے اور یہ تھوڑے پر خوش ہو جاتی ہیں۔

99۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج7 ص81 رقم الحدیث 13855

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوصاف بیان فرمائے، دیکھو! اللہ کے نبی کیسے انسانیت کا مزاج سمجھتے تھے!

اللہ کی میزبانی کے کیا کہنے!

﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾﴾

یہ مہمانی ہو گی اس ذات کی طرف سے جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی ہے، معاف کرنے والا بھی ہے اور رحم کرنے والا بھی ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ جنت میں ایسی نعمتیں ملیں گی جن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں ہو گا، لَا عَيْنٌ رَأَتْ اور کسی کان نے سنا نہیں ہو گا، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ اور کسی بشر کے دل میں ان کا خیال بھی نہیں آیا ہو گا وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ.[100]

اس کو سمجھنا بہت آسان ہے۔ مثلاً مہمان کسی کے ہاں جاتا ہے تو میزبان بعض ایسی چیزیں پیش کرتا ہے کہ جس کا مہمان کو تصور بھی نہیں ہوتا کہ یہ بھی دنیا میں ہے اور وہ تو جنت ہو گی۔ دنیا میں میزبان انسان ہوتا ہے تو مہمان کے لیے دستر خوان پر ایسی ڈشیں آتی ہیں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ مجھے یہ ڈش بھی ملے گی اور جب میزبان اللہ ہو گا تو وہاں ایسی نعمتیں ملیں گی کہ جو کسی نے سوچی بھی نہ ہوں گی۔

بہت سے واقعات پیش آتے ہیں جب میں سفر میں جاتا ہوں۔ صوبہ سندھ میں ایک جگہ ہے کھپرو، وہاں ایک بندے نے کوئی چیز دی، میں نے کہا: یہ کیا ہے؟ کہا جی یہ مچھلی کا حلوا ہے اور میں کراچی سے آیا ہوں صرف آپ کو یہ کھلانے کے لیے۔ میں حیران ہوا کہ مچھلی کا حلوا بھی ہوتا ہے! اور واقعی بہت لذیذ تھا۔ اتنا کہ ہم انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔

100۔ سنن الترمذی، رقم:3197

سب سے اچھی کس کی بات ہے؟

﴿وَ مَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾﴾

اس سے بہتر کس آدمی کی بات ہو سکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل بھی کرے اور پھر یہ کہے کہ میں اللہ کی بات مانتا ہوں۔ نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی، برائی کے مقابلے میں ایسے طریقے سے جواب دو جو بہتر ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایسا بندہ کہ تمہارے اور اس کے درمیان سخت دشمنی ہو تو وہ بھی دوست بن جائے گا۔

یہاں یہ بات سمجھیں ﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ﴾ کہ اگر کوئی تمہارے خلاف برا پلان بناتا ہے تو تم اس کا جواب اچھا دو، اس طرزِ عمل کی وجہ سے جو تمہارے اور اس کے درمیان عداوت تھی وہ محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ برائی کے جواب میں طرز عمل اچھا ہونا چاہیے۔ ہمارے خلاف غلط عقائد اور غلط دلائل پھیلائے جا رہے ہیں تو ہمیں جواب میں صحیح عقیدہ تو دینا چاہیے لیکن طرز سلجھا ہوا ہو۔ مطلب یہ کہ غلط عقیدہ کا جواب ہونا تو چاہیے، لوگ کہتے ہیں کہ ہونا ہی نہیں چاہیے، اب قرآن کہتا ہے "اِدۡفَعۡ" کہ مدافعت تو کرو لیکن اچھے طریقے سے کرو، یہ نہیں کہ مدافعت ہی نہیں کرنی! اللہ تعالی ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

الحاد کا انجام:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخۡفَوۡنَ عَلَیۡنَا ؕ اَفَمَنۡ یُّلۡقٰی فِی النَّارِ خَیۡرٌ اَمۡ مَّنۡ یَّاۡتِیۡۤ اٰمِنًا یَّوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ اِنَّہٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ

بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾

وہ لوگ جو ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں ہم سے مخفی نہیں ہیں۔ یہ دیکھو کہ جو شخص جہنم میں ڈالا جائے وہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو قیامت کے دن امن اور امان کے ساتھ آئے؟ بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾﴾

یہ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ وہی ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ﴾ ہیں، یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ فرمایا بے شک یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس ذکر یعنی قرآن مجید کا انکار کیا جب قرآن ان کے پاس آیا، حالانکہ یہ قرآن تو ایک زبردست کتاب ہے۔

﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾﴾

کتاب میں الحاد کرتے ہو اور آیات کا انکار کرتے ہو لیکن یہ ذہن میں رکھ لو ہماری یہ کتاب ایسی ہے کہ باطل اس کتاب میں نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ ایسی ذات کی طرف سے نازل کردہ ہے جو حکمت والی اور خوبیوں والی ذات ہے۔

"الحاد" کا معنی ہوتا ہے کہ آدمی آیت ٹھیک پڑھے اور معنی اس کا غلط کرے۔ مثلاً کہے خاتم النبیین لیکن معنی غلط کرے جیسے مرزا قادیانی کرتا تھا تو یہ الحاد ہے۔ جو لوگ الحاد کرتے ہیں، تفسیر غلط بیان کرتے ہیں وہ سنیں کہ ﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ﴾ کہ اگر کوئی چاہے کہ میں قرآن کے الفاظ بدل لوں تو وہ نہیں بدل سکتا اور اگر چاہے کہ لفظ نہ بدلوں بلکہ معنی بدلوں تو ﴿وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ وہ معنی بھی نہیں بدل سکتا۔ قرآن کا ظاہر بھی محفوظ ہے اور قرآن کا باطن بھی محفوظ ہے۔

﴿مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ﴾ سے مراد ظاہر ہے اور ﴿مِنۡ خَلۡفِهٖ﴾ سے مراد باطن ہے۔ جو سامنے ہے وہ نظر آتا ہے اور جو پیچھے ہے وہ نظر نہیں آتا۔ تو جو نظر آتے ہیں الفاظ ان کو قرآن نے ﴿مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ﴾ فرمایا اور جو نظر نہیں آتا معنی اس کو ﴿مِنۡ خَلۡفِهٖ﴾ فرمایا۔ یعنی قرآن کا ظاہر بھی محفوظ رہے گا اور قرآن کا باطن بھی محفوظ رہے گا۔ نہ کوئی قرآن کا لفظ بدل سکتا ہے نہ ہی معنی بدل سکتا ہے۔ کوشش تو کریں گے لیکن رسوا ہوں گے، بالآخر حق ہی غالب رہے گا۔ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی کتاب ہے "اکفار الملحدین" اس مسئلے پر، بہترین کتاب ہے، اس کا ہر بندے کو مطالعہ کرنا چاہیے۔

قرآن مجید فصیح ہے:

﴿وَلَوۡ جَعَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِيًّا لَّقَالُوۡا لَوۡلَا فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَ اَعۡجَمِىٌّ وَّعَرَبِىٌّ ؕ﴾

اگر ہم قرآن کو ایسا بنا دیتے کہ یہ فصیح نہ ہوتا تو لوگ کہتے کہ اس کی آیات وضاحت کے ساتھ کیوں بیان نہیں کی گئیں؟! لوگ کہتے کہ جس پر قرآن اترا ہے وہ تو فصیح ہے اور خود قرآن غیر فصیح ہے؟!

ایک لفظ ہے اعجم اور ایک ہے عجم۔ عجم کہتے ہیں غیر عرب کو اور اعجم کہتے ہیں غیر فصیح کو اگرچہ عربی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے اعجمی کا معنی غیر عربی نہ کرنا بلکہ اس کا معنی غیر فصیح کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم قرآن کو ایسے بناتے جو فصیح نہ ہوتا تو لوگ کہتے کہ قرآن کے مضامین کھلے ہوئے کیوں نہیں ہیں۔ قرآن غیر فصیح ہوتا اور عرب جو اس کے اولین مخاطب ہیں وہ فصیح تھے تو جوڑ کیسے ہوتا؟

مزاجِ انسانی:

﴿لَا يَسۡـَٔمُ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ دُعَآءِ الۡخَيۡرِ ۫ وَ اِنۡ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوۡسٌ

قَنُوۡطٌ ﴿۴۹﴾

یہاں سے اللہ رب العزت نے انسان کا مزاج بتایا ہے کہ جب بھلائی مانگتا ہے تو تھکتا نہیں ہے اور جب اسے کوئی تکلیف ملتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے اور امیدیں چھوڑ بیٹھتا ہے۔

﴿وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنَّا مِنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ هٰذَا لِىۡ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّجِعۡتُ اِلٰى رَبِّىۡۤ اِنَّ لِىۡ عِنۡدَهٗ لَـلۡحُسۡنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِمَا عَمِلُوۡا ۙ وَلَـنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ﴿۵۰﴾﴾

جب انسان کو تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ بھلائی تو میرا حق تھا، کہتا ہے کہ میرا نہیں خیال کہ قیامت قائم ہو لیکن بالفرض اگر قیامت قائم ہوئی بھی اور میں اپنے رب کی پاس گیا تو وہاں بھی مجھے خوشحالی ملے گی۔ کافروں کو ان کے اعمال کے بارے میں ہم ضرور بتائیں گے اور انہیں سخت عذاب کا مزا ضرور چکھائیں گے۔

﴿وَاِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ ﴿۵۱﴾﴾

جب ہم انسان کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے اور اکڑ جاتا ہے اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچے تو لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے۔

یہاں "عَرِيۡضٍ" فرمایا "طَوِيۡلٍ" نہیں فرمایا کیونکہ جس کا عرض بڑا ہو تو اس کا طول تو بڑا ہوتا ہی ہے۔ جنت کے بارے میں فرمایا: ﴿سَابِقُوۡۤا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ

رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ [101] کہ اپنے رب کی مغفرت کی طرف دوڑو اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے۔ تو یہاں جنت کا عرض بتا رہے ہیں، اس کا طول نہیں بتا رہے۔ جب عرض بڑا ہو گا تو طول تو اور بھی بڑا ہو گا۔

تو انسان کو راحت بھی اللہ کی طرف سے ملتی ہے اور تکلیف بھی اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔ راحت آئے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اگر تکلیف آئے تو بندے کو چاہیے کہ برداشت اور صبر کرے۔ اللہ ہم سب کو یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

101۔ سورۃ الحدید 21:57

سورۃ الشوریٰ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۙ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۳﴾﴾

سات سورتیں جن کے شروع میں حٰم ہے جنہیں حوامیم کہتے ہیں یہ ان میں سے تیسری سورت ہے۔ ﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾﴾... یہ مقطعات میں سے ہے، ﴿عٓسٓقٓ ﴿۲﴾﴾ یہ بھی مقطعات میں سے ہے۔

﴿کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۙ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ﴾

یعنی جس طرح اس سورت کے ذریعے آپ کو دینی احکام بتائے جارہے ہیں اسی طرح آپ کی طرف بھی اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی طرف بھی اللہ جو غالب حکمت والا ہے، وحی بھیجتا رہا ہے۔

﴿تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِہِنَّ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ﴾

ایسے لگتا ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں گے – مطلب کہ آسمان میں اللہ کی معرفت رکھنے والے اور اللہ کی عبادت کرنے والے فرشتے اس کثرت سے ہیں کہ

یوں لگتا ہے کہ آسمان پھٹ پڑے گا۔ اور فرشتے اللہ کی تسبیح اور تحمید بھی کرتے ہیں اور زمین والوں کے لیے استغفار بھی کرتے ہیں۔

اب بظاہر یہ ہے کہ یہاں لفظ ”مَنْ“ عام ہے کہ فرشتے ہر کسی کے لیے استغفار کرتے ہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر ہو حالانکہ استغفار صرف ان کے لیے ہوتا ہے جو مسلمان ہوں۔ اس لیے یہاں یہ کہنا پڑے گا کہ یہاں ”مَنْ“ عام نہیں ہے بلکہ ”مَنْ“ خاص ہے۔

ترک قرأت خلف الامام پر ایک دلچسپ واقعہ:

ایک بار کچھ ساتھی چکوال سے ایک شخص کو یہاں پر لائے۔ اس نے کہا میں نے ترک قرأت خلف الامام پر بات کرنی ہے۔ وہ عالم نہیں تھے بلکہ عام آدمی تھے اور عام آدمی نے دو چار حدیثیں رٹی ہوتی ہیں جن پر ان کا اصرار ہوتا ہے۔ تو میں نے کہا کہ اچھا امام کے پیچھے آپ قرأت کرتے ہیں تو اس کی دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ بخاری شریف، حالانکہ بخاری شریف میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں، آپ کبھی دل چھوٹا نہ کیا کریں! اس نے کہا بخاری میں ہے:

لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.[102]

کہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، اور یہ جو ”مَنْ“ ہے یہ عام ہے خواہ امام ہو، خواہ مقتدی ہو، خواہ اکیلا ہو سب کو یہ شامل ہے۔

میں نے کہا کہ ”مَنْ“ عام ہوتا ہے؟ کہا کہ جی ہاں۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ کہ ملائکہ استغفار کرتے ہیں اس شخص کے لیے جو زمین میں ہے خواہ مسلمان ہو خواہ کافر ہو، کیا یہی معنی ہے؟ کہا کہ

102۔ صحیح البخاری، رقم:756

نہیں جی، صرف مؤمنین کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ ”مَنۡ“ عام ہے تو یہ ”مَنۡ“ تو خاص ہو گیا تو اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کی یہ بات غلط ہو گئی کہ ”مَنۡ“ عام ہوتا ہے۔ وہ اس میں پھنس گیا اور اس کا جواب نہیں دے سکا۔

تو اگر اس سے مراد مؤمن ہوں تو ”مَنۡ“ خاص ہو گا اور اگر اس سے مراد کفار اور مؤمنین دونوں ہوں تو پھر استغفار خاص ہو گا، استغفار عام نہیں ہو گا یعنی کفار کے لیے استغفار یہ نہیں ہے کہ ان کے گناہ معاف ہو جائیں بلکہ ان کے لیے استغفار یہ ہو گا کہ یا اللہ! ان کے کفر کے باوجود آپ ان کو عذاب نہ دیں، ان کو مہلت دیں شاید یہ ایمان قبول کریں۔ اب یہ استغفار خاص ہو جائے گا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

ترک قرأت خلف الامام کی عوامی تقریر:

میں آپ سے کئی مرتبہ عرض کرتا ہوں کہ ایک زبان ہوتی ہے درسگاہ کی اور ایک زبان ہوتی ہے عوامی جلسوں کی۔ یہ بات تو میں نے آپ کو عالمانہ طرز اور طالب علمانہ طور پر بتا دی ہے لیکن جب عوام کو سمجھائیں تو اس کا طرز بالکل الگ ہوتا ہے۔ عوام کو میں یہ بات سمجھاتا ہوں کہ یہ جو لوگ ترجمہ کرتے ہیں اس حدیث کا کہ:

لَا صَلَاةَ لِمَنۡ لَمۡ يَقۡرَأۡ بِفَاتِحَةِ الۡكِتَابِ.

اس شخص کی نماز ہی نہیں ہوتی جو [لفظ ”جو“ کو کھینچ کر ادا کیا] فاتحہ نہ پڑھے۔

یہ ”جو“ کو لمبا نہ کریں، یہ ”جو“ چھوٹا ہے، اور یہ جو آپ لوگ تشریح کرتے ہیں کہ خواہ امام ہو، خواہ مقتدی ہو، خواہ منفرد ہو... میں نے کہا یہ خواہ، خواہ نہ کریں ورنہ ﴿وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ﴾ کا ترجمہ ہو گا کہ فرشتے استغفار کرتے ہیں ہر اس شخص کے لیے جو [لفظ ”جو“ کو کھینچ کر ادا کیا] زمین میں ہے خواہ آپ ہوں، خواہ ابوجہل ہو... تو خواہ، خواہ، خواہ آپ کر لیں گے؟ کہتا ہے کہ جی نہیں۔ تو میں نے کہا کہ جس

طرح یہاں ”من“ چھوٹا ہے تو وہاں بھی ”من“ چھوٹا سا ہے، لمبا نہیں ہے۔ بات سمجھ آئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

الفاظ کے ساتھ لہجہ کا اثر:

پھر میں آگے بات سمجھاتا ہوں کہ بسا اوقات جب تک لفظ لمبا کھینچ کر ادا نہ کریں تب تک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جس طرح غیر مقلد کہتے ہیں کہ کوئی شخص اگر بڑی عمر میں عورت کا دودھ پینا چاہے تو پی سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

وَيَجُوْزُ اِرْضَاعُ الْكَبِيْرِ وَلَوْ كَانَ ذَا الِحْيَةٍ لِتَجْوِيْزِ النَّظَرِ.[103]

بڑی عمر کا بندہ دودھ پی سکتا ہے اگرچہ ڈاڑھی والا ہو۔

ویجوز اور جائز ہے دودھ پینا "ذالحیة" (ذا کو کھینچ کر) اگرچہ وہ لمبی ڈاڑھی والا ہو اگرچہ وہ ڈاڑھی والا ہو...

میں نے کہا کہ ”وَلَوْ كَانَ ذَا لِحْيَةٍ“ [لفظ ذا کو کھینچ کر ادا کیے بغیر] کہو گے تو حنفی نکل آئے گا کیونکہ حنفی کی ڈاڑھی ایک مشت ہوتی ہے، اگر اس کو کھینچ کر کہو گے کہ ”ذَا لِحْيَةٍ“ [لفظ ذا کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے] تو اب غیر مقلد ہو گا، عورت کا دودھ پینا جائز ہے اگرچہ ”ذَا لِحْيَةٍ“ [ذا کو کھینچ کر ادا کرتے ہوئے] ہو، میں نے کہا کہ یہ مسئلہ تمہارا ہے اس لیے ”ذا“ کو لمبا رکھو اور اسی لحاظ سے تم اس کی طرز لگاؤ، ہماری طرح نہ لگاؤ۔ عوامی طرز میں ان باتوں کو سمجھانا بہت ضروری ہوتا ہے۔

گناہ چھڑوانے کے لیے گناہ کا ارتکاب کبھی نہ کریں!

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ

103۔ کنز الحقائق از علامہ وحید الزمان: ص 67 کتاب الرضاع

رَحۡمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوۡنَ مَا لَهُمۡ مِّنۡ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۸﴾

اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے لیکن ظالم لوگوں کے لیے نہ کوئی دوست ہو گا نہ کوئی مددگار۔

اگر اللہ چاہتا تو سب کو مسلمان بنا دیتا، دنیا میں کوئی کافر بھی نہ رہتا لیکن اللہ کا نظام یہ نہیں ہے۔ جب اللہ کا یہ نظام ہی نہیں ہے تو پھر کافر کو مسلمان بنانے کے لیے ناجائز اعمال کا ارتکاب کرنے سے بچنا چاہیے۔ اللہ چاہتا تو سب کو نمازی بنا دیتا تو جب سب نے نمازی نہیں بننا تو بے نمازی کو نمازی بنانے کے لیے اپنی نمازیں خراب کرنے کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟! ہمارے ہاں چونکہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی قباحت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن ہم اس قبیح چیز سے بچنے کے لیے خود قباحت کا ارتکاب نہیں کرتے اور بعض چیزوں کی ہمارے ہاں اہمیت نہیں ہوتی اس لیے ان کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص بدعتی آدمی کو نیک کام پر لگانے کے لیے بدعات کر لے گا، اس کا ذہن یہ ہے کہ اگر ہم بدعات میں شریک نہیں ہوں گے تو یہ ہمارے قریب نہیں آئیں گے، اگر قریب نہ آئے تو ان کو بات کیسے کہیں گے، ان کو قریب لانے کے لیے بدعات کا ارتکاب ہماری مجبوری ہے...... اور زانیہ عورت کا زنا چھڑانے کے لیے نہ بندہ اس کے ساتھ زنا کرنے کے لیے تیار ہے، نہ اس سے بوس و کنار کرنے کے لیے تیار ہے، اس کے لیے کوئی بندہ تیار نہیں کہ زنا کر لوں یا تھوڑا سا پیار کر لوں تاکہ یہ مجھ سے مانوس ہو جائے، اس کے دل میں میرا پیار آ جائے تو پھر یہ میری بات بھی مانے گی، تو کوئی بندہ اس کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ زنا کی نفرت دل میں ہے تو زانیہ کا زنا چھڑانے کے لیے کوئی شخص زانیہ سے زنا کے لیے تیار نہیں ہو گا، اس کے ساتھ بوس و کنار کے لیے تیار نہیں ہو گا حتی کہ اس زانیہ کو دیکھنے کے لیے بھی تیار نہیں ہو گا لیکن بدعتی کو بدعت سے

نکالنے کے لیے بدعات کا ارتکاب کرلے گا کیونکہ ہمارے دل میں بدعت کی نفرت نہیں ہے اور زنا کی نفرت ہے۔ شرابی کو شراب چھڑانے کے لیے کوئی شخص شراب پینے کے لیے تیار نہیں ہے، کسی فلم دیکھنے والے کو فلم سے بچانے کے لیے کوئی بندہ فلم دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ آج میں اس کے ساتھ فلم دیکھ لوں کیونکہ میں نے اس سے فلموں کو چھڑانا ہے کوئی بندہ تیار نہیں ہوتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بدعات کے معاملے میں اتنے نرم، اتنے نرم ہیں کہ الامان والحفیظ... اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ وعیدیں سنیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سنیں، جو الفاظ بدعات کے رد کے لیے ارشاد فرمائے ہیں وہ شاید دوسرے گناہوں کے لیے نہیں ہوں گے۔ میں اپنے طلبہ سے کہتا ہوں کہ پہلے آپ خود سمجھیں گے تو دوسروں کو بات سمجھائیں گے، جب خود نہیں سمجھیں گے تو کسی اور کو آپ کیسے سمجھائیں گے؟

چھوٹوں کی خوشی چاول کھانا:

میں نے پرسوں لاہور میں بیان میں کہا اور میں آپ کو بھی سمجھاتا ہوں، میں نے کہا دیکھو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ﴾[104]

ہم جو بھی پیغمبر بھیجتے ہیں تو اس لیے بھیجتے ہیں تاکہ اس کی بات مانی جائے۔

کسی گھر میں کوئی بڑا عالم آئے تو گھر کے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہماری سعادت ہے کہ کسی کام کے لیے انہوں نے ہم سے رابطہ کیا اور ہماری سعادت ہے کہ ہم بڑوں کے کام آئے اور ان کا جو مقصد ہے وہ ہم پورا کریں... اور اس گھر کے چھوٹے خوش ہیں کیونکہ ان بڑوں کے آنے پر ہمارے گھر میں چاول، چکن یہ چیزیں

104۔ النساء 64:4

پکیں گی۔ تو اب بڑوں کے آنے پر بڑوں کا خوش ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کا مقصد ہمارے ذریعے پورا ہو رہا ہے اور بڑوں کے آنے پر چھوٹوں کا خوش ہونا اس وجہ سے ہے کہ بڑوں کے آنے پر ہمیں پلاؤ ملنا ہے۔ میں نے کہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر ایک خوشی وہ ہے جو بڑوں والی ہے اور ایک خوشی وہ ہے جو چھوٹوں والی ہے۔ وہ لوگ جو چھوٹوں والی خوشی کریں وہ چھوٹے ہیں اور جو بڑوں والی خوشی کریں وہ بڑے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں اپنے ساتھیوں سے گزارش کیا کرتا ہوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو بھائی مت کہو، میں کہتا ہوں کہ بھائی کہو لیکن بڑا مت کہو، ان کو چھوٹا کہو! میں نے یہ کہا کہ ان کے پاس کیوں گئے ہو؟ میں نے کہا تم نے ان کو بھائی کیوں کہا ہے؟ میں نے کہا کہ ان کو بڑا نہ کہو بلکہ چھوٹا کہو، ان کو بڑے بھائی نہ کہو بلکہ ان کو چھوٹے بھائی کہو! تو چھوٹے کو بڑا نہیں کہنا چاہیے۔ اس سے نقصان یہ ہو گا کہ جب انہیں بڑا مانیں گے تو ان کی عظمت کریں گے، اور حدیث میں ہے:

مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ أَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْإِسْلَامِ.[105]

جو شخص بدعتی کی توقیر کرتا ہے وہ اسلام کے مٹانے میں مدد کرتا ہے۔

جب آپ انہیں چھوٹا سمجھیں گے تو "مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا"[106] آپ اس پر شفقت کریں گے اور یہ چھوٹے بھی ہیں، مریض بھی ہیں، مریض آدمی احترام کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ مریض آدمی شفقت کا مستحق ہوتا ہے۔

جب مریض کو آپ ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں تو ڈاکٹر اس کو احترام کی نگاہ

105۔ شعب الایمان للبیہقی: ج7 ص61 رقم الحدیث 9464

106۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4943

سے نہیں دیکھتا بلکہ شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ڈاکٹر کی اس شفقت کو مریض سمجھتا ہے کہ میرا احترام کیا ہے حالانکہ وہ احترام نہیں کر رہا ہوتا، وہ شفقت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ڈاکٹر کہہ رہا ہوتا ہے کہ بھائی! ان کو ذرا یہاں بٹھاؤ، ذرا منہ اوپر کرو، تھوڑا سا پانی اس کے لیے لاؤ... اب یہ شفقت ہو رہی ہے یا احترام ہو رہا ہے؟(شفقت ہو رہی ہے۔سامعین) لیکن وہ مریض سمجھ رہا ہے کہ مجھے عزت دے رہا ہے، میرا احترام کر رہا ہے حالانکہ وہ شفقت ہو رہی ہے۔

ان کو بڑا بنا کر توقیر مت کرو بلکہ ان کو چھوٹا سمجھ کر ان پر شفقت کرو اور رحم کا معاملہ کرو۔ ہم مزاجِ شریعت آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔اب جس نے ہماری پوری بات نہیں سنی تو وہ سمجھے گا کہ مولانا گھمن صاحب بہت سخت آدمی ہیں، دیکھو اہلِ بدعت کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا، میں نے تو یہ کہا کہ شفقت کرو، محبت کرو، ترس کھاؤ ان پر، ان کو چھوٹا سمجھو، ہم منع تھوڑا کرتے ہیں ان کے پاس جانے سے۔

اللہ تعالیٰ کی مثال نہیں تو مثال کیوں دی؟

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱۱﴾﴾

اللہ کی مثل کوئی نہیں ہے اور اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں۔جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہیں، پھر مثال دے کر سمجھاتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے:﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی نہیں، قرآن کہتا ہے:﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾[107] کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مثالیں پیش نہ کیا کرو اور تم لوگ مثالیں دیتے ہو۔

107۔النحل 74:16

میں نے کہا: اللہ نے خود مثال دی ہے، فرمایا:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ﴾[108]

کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اللہ کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہوا ہو۔

اللہ تو مثالیں دے رہے ہیں۔ ہاں اب یہ سمجھنا چاہیے کہ مثال دے بھی رہے اور ہمیں حکم بھی فرما رہے ہیں کہ مثال نہ دو۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اچھی اچھی مثالیں تو دو لیکن بری بری مثالیں نہ دو۔ جیسے مشرک کہتے تھے ہم تو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، باقی ان بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾[109] اس سے اللہ راضی ہوتا ہے، یہ اللہ کے قریب بھی ہیں، یہ خوش ہو جائیں گے تو ہمیں جلدی اللہ سے ملا دیں گے، ہم اس لیے ان کی عبادت کرتے ہیں۔ جیسے آج کے دور میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ ایک بڑا ہوتا ہے، اس بڑے تک پہنچنے کے لیے درمیان میں کوئی واسطہ ہوتا ہے، جب تک واسطہ نہ ہو تو بڑے تک کیسے جائیں گے؟ فرمایا ایسی مثالیں نہ دو، کیونکہ تمہارے اور بڑے کے درمیان فاصلہ ہے جو واسطے کے بغیر طے نہیں ہوتا، اور ﴿وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝۱۶﴾[110] اللہ تو تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، یہاں تو فاصلہ ہی نہیں ہے تو واسطوں کی ضرورت کیا ہے؟

108۔ النور 35:24

109۔ الزمر 3:39

110۔ ق 16:50

اس کا خلاصہ یہ نکلا کہ اچھی مثالیں دو اور بری بری مثالیں مت دو۔ تو دو باتوں میں فرق سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر آدمی نہ سمجھے تو پھر الجھنیں بہت ہوتی ہیں۔

امام ابو حنیفہ نے مناظرے سے روکا، اس کا مطلب:

دو باتوں میں فرق پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مولانا صاحب نے مجھے کہا:
امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے امام حماد کو وصیت فرمائی تھی کہ مناظرہ نہ کیا کرو اور آپ لوگ تو مناظرہ کرتے ہیں، آپ کیسے حنفی ہیں؟ میں نے کہا کہ امام صاحب نے وصیت فرمائی تھی کہ مناظرے نہ کیا کرو، تو خود امام صاحب مناظرے کرتے تھے یا نہیں؟ کہنے لگے جی کرتے تھے۔ تو میں نے کہا کہ امام صاحب خود کرتے ہیں اور بیٹے کو منع کرتے ہیں تو میرا سوال ہے کہ اگر مناظرہ اچھا کام تھا تو بیٹے کو منع کیوں کیا اور اگر اچھا کام نہیں تھا تو خود کیوں کیا؟

وہ مولانا صاحب کہنے لگے کہ بیٹے سے کہا تھا کہ ہم اللہ کے لیے کرتے تھے اور تم ذات کے لیے کرو گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمارے بارے میں آپ کا کیا گمان ہے کہ ہم اللہ کے لیے کرتے ہیں یا اپنی ذات کے لیے کرتے ہیں؟ مجھے کہنے لگے: آپ کے بارے میں تو اچھا گمان ہے۔ تو میں نے کہا کہ پھر وصیت ہمیں کیوں سناتے ہو؟ ہمارے بارے میں کہو کہ مولانا صاحب اس لیے کرتے ہیں کہ امام صاحب کے مقلد ہیں، ان کا امام بھی کرتا تھا اور یہ بھی کرتے ہیں۔ تو ہمارے بارے میں یہ بات کرو! اصل میں جب آدمی حاسد ہوتا ہے تو پھر وہ اچھی تعبیر پیش نہیں کرتا، اچھی بات کو غلط انداز میں پیش کرتا ہے۔

میں نے کہا کہ علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اَلْمُنَاظَرَةُ فِي الْعِلْمِ لِنُصْرَةِ الْحَقِّ عِبَادَةٌ۔[111]

کہ حق کی مدد کرنے کے لیے مناظرہ کرنا عبادت ہے اور آپ کہتے ہیں کہ مناظرہ سے امام صاحب نے منع کیا ہے۔ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ مناظرہ کرنا ذات کے لیے گناہ ہے تو بتائیں کہ نماز دکھلاوے کے لیے پڑھنا جائز ہے؟ کہا جی نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر اس سے بھی منع کر دیں۔ قیامت کے دن اللہ شہید کو جہنم میں بھیج دے گا، کیونکہ وہ اللہ کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذات کے لیے لڑا تھا، جہاد بھی چھوڑ دیں! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو جہنم میں بھیج دیں گے کیونکہ وہ اللہ کے لیے نہیں بلکہ دکھاوے کے لیے پڑھتا تھا تو قرآن بھی چھوڑ دیں! اللہ سخی کو جہنم میں بھیج دیں گے کہ یہ سخاوت دکھلاوے کے لیے کرتا تھا تو سخاوت بھی چھوڑ دیں!

میں نے کہا کہ ایک مناظرے کا کیا قصور ہے؟ دین کا کوئی بھی شعبہ ہو اور اس میں لوگ ریا کرتے ہوں تو اس کو ختم کر دو! اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج لوگوں کی طبیعت یہ بن گئی ہے کہ دین کے ایک شعبہ میں کام کرتے ہیں اور باقی شعبوں میں کام کرنے والوں کو منع کرتے ہیں تو منع کرنے کے لیے جھوٹے اور غلط جواز پیش کرتے ہیں!

دین کے کام میں اخلاص شرط ہے:

لیکن ہمارا مزاج یہ نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مزاج وہ رکھو جو شریعت کا ہے۔ جو بندہ دین کا کام کرتا ہے، کام بہت بڑا ہو لیکن نیت ٹھیک نہ ہو تو وہ کام بہت چھوٹا ہو جاتا ہے، کام بہت چھوٹا ہو لیکن نیت ٹھیک ہو تو کام بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

111۔ الدر المختار: ج9 ص695 کتاب الحظر والاباحۃ فصل فی البیع

"اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ التَّمْرَةِ"[112]

کہ جہنم کی آگ سے بچو اگر چہ تمہیں کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ اب اگر اخلاص کے ساتھ ہو گا تو یہ ٹکڑا بھی بہت بڑا ہو جائے گا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ أَنْفَقَ أَحَدُكُمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلاَ نَصِيفَهُ.[113]

میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہنا، کیونکہ اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کر لو تو ان کے تقریباً کلو، آدھا کلو جو کے برابر بھی نہیں۔

اس کی وجہ سمجھنا! وجہ یہ ہے کہ ان کے کلو، آدھا کلو میں جو اخلاص تھا وہ بہت بڑا تھا اس لیے ان کا کلو بھی بہت بڑا تھا اور ہمارا احد پہاڑ کا سونا بہت چھوٹا ہے چونکہ ہمارا اخلاص ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

کبھی لوگ کہیں گے کہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا دفاع کرتے ہیں اور تم تو فروعی مسائل کا دفاع کرتے ہو۔ میں نے کہا: فروعی مسائل کی نسبت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی طرف ہے، اللہ کے نبی کی ذات نہ ہوتی تو فروعی مسائل کہاں سے نکلتے ؟! اور فروعی مسائل کوئی معمولی چیز ہوتی ہے کیا؟ اس لیے میں نے کہا کہ اس بات کو سمجھا کرو اچھی طرح!

اخلاص پرکھنے کا معیار:

آج امت کا عجیب مزاج ہے۔ مثلاً ایک عنوان پر ہم کام کرتے ہیں اور اسی

112۔ سنن النسائی، رقم:2552

113۔ سنن ابی داؤد، رقم:4658

عنوان پر کوئی دوسرا فرد کرے تو ہم برداشت نہیں کرتے۔ اسی عنوان پر دوسری جماعت کام کرے تو ہم برداشت نہیں کرتے۔ یہ کتنی بڑی زیادتی ہے!

میں کسی فرد یا جماعت کا نام نہیں لیتا، میں اپنی بات کہتا ہوں کہ میں کام کرتا ہوں فرقِ باطلہ کے رد میں۔ اگر کوئی اور فرق باطلہ کے رد میں کام کرتا ہو اور میں اس پر خوش ہوتا ہوں تو آپ کو سمجھنا چاہیے کہ استاد جی ٹھیک ہیں، اگر میں اس پر ناراض ہوتا ہوں تو پھر آپ کو یقین کر لینا چاہیے کہ استاد جی ٹھیک آدمی نہیں ہیں۔ میں ٹھیک ہوتا تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔ اب دیکھو! دنیا بھر کے تمام فرق کا رد میں اکیلا کر سکتا ہوں؟ (نہیں۔ سامعین) تو جو دوسرے کر رہے ہیں وہ میرے معاون ہیں، مجھے تو خوش ہونا چاہیے، خواہ وہ میرے شہر میں ہوں، خواہ وہ میرے ملک میں ہوں، خواہ وہ کسی اور ملک میں ہوں۔

یہ معیار ہے کسی بندے کو پرکھنے کا لیکن آپ نے اس معیار پر دوسروں کو نہیں پرکھنا، اس معیار پر خود کو پرکھنا ہے۔ یہ معیار میں اس لیے نہیں بتا رہا کہ آپ اس کسوٹی پر دوسرے کو پرکھیں اور دوسروں پر فتوے دیں، آپ دوسروں کو پرکھنا شروع کر دیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ ہمارا مزاج نہیں سمجھ سکے، آپ ہمارے متخصص نہیں ہیں... ہاں اگر اس معیار پر خود کو پرکھو گے تو میں سمجھوں گا کہ آپ ہمارے متخصص ہیں، ہمارے شاگرد ہیں، آپ نے ہمارا مزاج سمجھا ہے۔

فراغت کے بعد اساتذہ سے رابطہ ضرور رکھیں!

آپ یہاں سے فارغ ہو کر جاتے ہیں لیکن آپ حفظ کے شعبے میں کام کرتے ہیں تو معمول کا رابطہ تمام اساتذہ سے رکھیں، عزت تمام اساتذہ کی کریں لیکن اصل رابطہ حفظ کے استاذ سے رکھیں، اپنے کام کی کارگزاری ان کو جا کے سنائیں، ان سے پھر مزید رہنمائی لیں، اس سے آپ کے حفظ کے کام میں برکت آ جائے گی۔ آپ درجہ

کتب میں کام کر رہے ہیں تو درجہ کتب کے اساتذہ سے رابطہ رکھیں، ان کو کارگزاری سنائیں، ان سے رہنمائی لیں، اس سے آپ کا شعبہ کتب مضبوط ہو جائے گا، اور اگر فراغت کے بعد فرقِ باطلہ کے رد پہ کام کرنا ہے تو پھر رابطہ ہم سے رکھیں، پھر مشورہ ہم سے لیں، اس سے آپ کا کام بہت بڑھ جائے گا۔ اس اعتدال کو کبھی نہیں چھوڑنا! اور یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ یہ مزاج آپ بنائیں، آج آپ اُدھر بیٹھے ہیں[اشارہ طلبہ کی نشستوں کی طرف] اور کل آپ نے اِدھر بیٹھنا ہے[اشارہ مسند تدریس کی طرف]... یہاں وہ مزاج ہو جو اِدھر والوں کا ہو تو بس پھر آپ کو لطف آئے گا، پھر آپ بہت خوش ہوں گے۔

بعض طلبہ یہ زیادتی کرتے ہیں کہ کتب کے استاذ کی وجہ سے حفظ کے استاذ کو چھوڑ دیتے ہیں اور بعض تخصص کے استاذ کی وجہ سے کتب کے استاذ کو چھوڑ دیتے ہیں، ایسا کبھی نہ کریں۔ ہاں یہ بات ضروری ہے کہ آپ حفظ سے لے کر تخصص تک آئے ہیں، اب اللہ جس شعبہ میں آپ سے کام لیتا ہے تو عزت سب اساتذہ کی کریں لیکن رابطہ اس شعبہ کے اساتذہ سے زیادہ رکھیں، رہنمائی ان سے زیادہ لیں۔

بس جب یہ مزاج بنالیں گے تو کسی کے خلاف دل میں حسد نہیں ہو گا، آپ یہ سمجھیں گے کہ دنیا میں جو بھی دین کا کام کرتا ہے وہ ہمارا معاون ہے۔ اگر اس کے بارے میں کچھ خدشہ بھی ہو تو اس سے بات کریں، جب تک اس سے بات نہیں ہوتی تب تک اپنی زبان بند رکھیں، عوام میں ان کے بارے میں باتیں نہ کریں، اس کا نقصان بہت ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

احتباء اور انابت میں فرق:

﴿اَللّٰهُ یَجْتَبِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ﴿۱۳﴾﴾

اللہ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور جو اللہ کی طرف رجوع

کرتا ہے اللہ اس کو اپنی طرف پہنچا دیتے ہیں، اپنی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔

ایک ہے عام قانون اور عام ضابطہ اور ایک قانون اور ضابطہ نہیں ہے بلکہ وہ خواص کے لیے خاص ترتیب ہے۔ ترتیب عمومی یہ ہے ''وَيَهْدِيٓ اِلَيْـهِ مَنْ يُّنِيْبُ'' اور ''اَللّٰهُ يَجْتَبِيٓ اِلَيْـهِ مَنْ يَّشَآءُ'' یہ عمومی ترتیب نہیں ہے بلکہ یہ خواص کی ترتیب ہے۔ اصل ترتیب تو یہ ہے کہ جو طالب ہو گا ہدایت اسے ملے گی اور جو طالب نہیں ہو گا اللہ اسے بھی کھینچ لیں تو یہ عام ترتیب نہیں ہے بلکہ یہ خواص کے لیے ہے اور یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔

عام قانون کسبی ہے، عام قانون وہبی نہیں ہے۔ مثلاً کوئی چاہے گا تو قرآن کا حافظ بن سکے گا، نہیں چاہے گا تو نہیں بن سکے گا لیکن امت میں ایسے بندے مل جائیں گے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ماں کا دودھ پینے سے فارغ ہوئے ہوں اور دو سال میں قرآن کے حافظ بن جائیں لیکن یہ عام ضابطہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ہم محنت چھوڑ دیں!

متکلم اسلام کی تحدیث بالنعمۃ:

میں بہت ساری باتیں عرض کیا کرتا ہوں۔ میں نے مناظرے کا فن کسی سے نہیں پڑھا اور میں پڑھاتا ہوں، میں نے خطابت کسی سے نہیں سیکھی اور میں سکھاتا ہوں، میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ کسی سے نہیں سیکھی اور میں ڈرائیونگ کرتا ہوں، کوئی خاص چیز کسی سے پوچھ لی کہ بھائی یہ کیا ہے... یہ کیا ہے... یہ الگ چیز ہے لیکن میں بغیر سیکھے گاڑی پر بیٹھا ہوں اور ہم نے ڈرائیونگ کی تو چل پڑی ہے گاڑی۔

چپاٹا میں تدریس کا واقعہ:

سب سے پہلے میں نے کینیا، زمبیا میں گاڑی چلائی تھی۔ وہاں ایک جگہ ہے چپاٹا، وہاں مولانا محمد عبد الرحیم متالا رحمہ اللہ تھے حضرت جی حضرت شیخ الحدیث مولانا

محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کے خلفاء میں سے تھے، میں وہاں ان کے پاس گیا۔ یہ 1992 یا 1993 کی بات ہے۔ میں نے وہاں درس دیا اور میرا درس ان کو پسند آیا۔ میں چونکہ اس وقت ایک جماعت میں کام کرتا تھا تو انہوں نے اس قیادت سے کہا کہ مولانا کو ہمیں دے دو۔ یوں انہوں نے مجھے وہاں اپنے مدرسے میں مدرس رکھ لیا۔

پھر انہوں نے صبح مجھے ایک فارم دیا، جو انگلش میں لکھا ہوا تھا، کہ آپ یہ فارم پُر کریں! میں نے نیچے دستخط کر دیے۔ انہوں نے کہا کہ اس کو پُر کر کے دیں۔ میں نے کہا کہ میں نے دستخط کر دیے ہیں بس میری طرف سے پُر ہے، اوپر آپ نے جو لکھنا ہے لکھ لیں، ہماری کوئی شرط نہیں ہے، ہم نے بس سبق پڑھانا ہے۔ تو یوں دو ماہ تک میں نے وہاں سبق پڑھایا۔ حضرت کے بیٹے تھے عبد الرشید اور عبد الحلیم وہ میرے پاس پڑھتے تھے اور ایک چھوٹا بیٹا تھا عبد الرؤف وہ حفظ میں تھا۔ میں عشاء کے بعد سو جاتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر پوچھا آپ مطالعہ کرتے ہیں؟ میں نے کہا کرتا ہوں۔ کہا کہ آپ تو عشاء کے فوراً بعد سو جاتے ہیں، آپ کے سبق جلالین تک ہیں، ہر درجے کا سبق ہے۔ تو میں نے کہا جب میں سبق پڑھا رہا ہوں تو آپ اچانک میرے سبق میں تشریف لائیں اور سنیں کہ میں سبق کیسے پڑھا رہا ہوں۔ میں نے طالب علمی میں محنت اتنی کی ہے کہ اب مجھے مطالعہ کی الجھن نہیں ہے، بس سرسری سا دیکھتا ہوں کہ سبق کون سا پڑھانا ہے؟

خیر دو ماہ تک میں نے وہاں پڑھایا۔ پھر میں واپس آ گیا، میری مجبوری تھی۔ جب زمبیا سے واپس آیا تو چپاٹا میں لوسا کا دار الحکومت ہے تو وہ لوگ وہاں مجھے ملنے کے لیے آئے کہ وہاں سے روانہ کریں گے۔ تو انہوں نے مجھے کچھ ڈالر دیے، کتنے تھے مجھے اب بھی نہیں پتا، میں نے نہ دیکھے نہ گنے کہ کتنے دیے۔ میں نے کہا کہ جی میں نہیں لوں گا۔ کہنے لگے: وجہ؟ میں نے کہا کہ میں نے تنخواہ کے لیے نہیں پڑھایا، میری تشکیل تھی

تو میں نے سبق پڑھایا بس، اب میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر آپ نے دینا ہی ہے تو ان کو دیں جنہوں نے میری تشکیل کی ہے، میں نہیں لوں گا، اور واقعتاً میں نے نہیں لیے۔ یہ بات میں 1992 / 1993 کی کر رہا ہوں جب میں کنوارہ تھا اور بالکل جوانی تھی، اس دور میں کون پیسے چھوڑتا ہے۔ اس کی برکت ہے کہ اللہ آج دیتا ہے۔

دین کی خدمت کا موقع ملے تو فوراً قبول کریں!

میں اس لیے کہتا ہوں کہ پیسہ چھوڑو... امامت ملے تو فوراً قبول کرو، یہ طے نہ کرو کہ کتنی تنخواہ ہو گی، آپ مجھے کیا دیں گے، یہ باتیں چھوڑو! بس بسم اللہ پڑھ کر کام شروع کرو، کام اچھا ہوا تو لوگوں کا رجوع اتنا ہو گا کہ پیسے سنبھالے نہیں جائیں گے۔ اگر کام اچھا نہ ہوا تو بہت جلد امامت ختم ہو جائے گی۔ پھر تم لڑو گے اور وہ رکھیں گے نہیں، جبراً وہاں رہو گے تو ایسے رہنے کا مزا نہیں آتا۔ اس لیے اگر تدریس کی جگہ ملے تنخواہ کی بات چھوڑو، بس پڑھانا شروع کرو۔ آپ اچھے مدرس ہیں اور آپ جانا چاہتے ہیں تو مہتمم صاحب کہیں گے کہ کیوں جا رہے ہیں؟ جی میری معاشی مجبوری ہے تو وہ مہتمم خود پیسے دے گا کہ ہم آپ کا مسئلہ حل کرتے ہیں، آپ مت جائیں اور اگر پہلے ہی دن آپ تنخواہ کا مطالبہ شروع کریں گے تو آپ کی وقعت ان کے دل سے نکل جائے گی اور وہ کہہ دے گا کہ جاؤ کسی اور مدرسے میں مدرس بنو۔

میں بطورِ خاص اپنے طلبہ سے عرض کرتا ہوں کہ دن کو سبق پڑھاؤ، رات کو تہجد پڑھو، صبح اٹھ کر اللہ اللہ کی ضربیں لگاؤ، اعمال کی پابندی کرو تو ان شاء اللہ اتنی محبوبیت خدا عطا فرمائے گا کہ آپ مہتمم کی مجبوری بن جائیں گے، وہ کہے گا کہ اس مدرس کو مت نکالو، وہ تمہیں سونے سے تول لے گا لیکن جانے نہیں دے گا اور جب تنخواہوں پر لڑو گے، تنخواہ اتنی ہوئی تو میں رہوں گا ورنہ نہیں... اس سے میرا گزارا نہیں ہوتا... میرا گھر دور ہے... میرے بچے ہیں، اس تنخواہ سے گزارا نہیں ہوتا...

اگر یہ باتیں کروگے تو پھر کچھ نہیں ہو گا۔

میں نے جس دن سے مسلک کا کام شروع کیا ہے اس دن سے صرف ایک یا دو مرتبہ شاید میں نے بس کا سفر کیا ہو اور وہ بھی کسی مجبوری کی وجہ سے - پیسوں کی وجہ سے نہیں، کوئی اور وجہ تھی - مثلاً میں کراچی سے آ رہا ہوں کبیر والا جلسہ تھا تو دھند میں فلائٹ کینسل تھی تو میں وہاں سے کوچ پر بیٹھا اور آ گیا، جلسہ میں نے نہیں چھوڑا، واپسی پر میں نے کراچی جانا تھا تو بس میں ٹکٹ نہیں تھا۔ میں ٹرین پر بیٹھا اور سکھر پہنچ گیا... لیکن میں نے جلسہ نہیں چھوڑا۔ باقی جس دن سے میں نے کام شروع کیا ہے میں بس پر نہیں بیٹھا بلکہ رینٹ کی گاڑی پر بیٹھا ہوں۔ میں نے کہا: اللہ! مجھے ذلیل نہ کرنا، ہماری جنگ مخالف سے ہے، بسوں کے دھکے بہت مشکل ہیں، مخالف بھی خوش ہوتا ہے، اللہ! اپنا کرم فرما دیں۔ میں یہاں سے پشاور گیا ہوں تو مجھے انہوں نے پندرہ سو دیے، میں یہاں سے ڈیرہ غازیخان گیا ہوں رینٹ کی گاڑی پہ تو مجھے انہوں نے تین ہزار دیے، میں یہاں سے حیدر آباد گیا ہوں تو مجھے کسی نے ایک روپیہ نہیں دیا لیکن میں نے کام نہیں چھوڑا۔ آج گاڑی بھی دیکھ لو کہ اللہ نے کیسی قیمتی دی ہے۔

ہمارے ایک بہت بڑے عالم ہیں پنجاب کے، میں ایک بار ملتان گیا، آگے لودھراں جانا تھا تو میں نے ان سے فون پر پوچھا: مولانا! کدھر ہیں؟ کہا کہ میں وفاق کے دفتر میں ہوں۔ میں نے کہا کہ میں آ رہا ہوں اور آپ سے ملتا ہوں۔ مجھے انہوں نے کہا کہ کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے لودھراں ایک جلسے میں جانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے بھی اسی جلسے میں جانا ہے۔ میں نے کہا کہ چلیں پھر میری گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ہم گاڑی میں بیٹھے اور گپ شپ لگا رہے تھے۔ ان کے سیکیورٹی گارڈ دوسری گاڑی میں تھے۔ تو میں نے ان سے کہا کہ مولانا! میں نے زندگی بھر جلسے والوں سے پیسے نہیں مانگے، وہ خود دے دیں تو واپس نہیں کرتا اور نہ دیں تو مانگتا نہیں ہوں اور

میں آج بھی قسم کھالوں تو حانث نہیں ہوں گا کہ میں اس دن کے انتظار میں ہوں کہ اللہ مجھے اتنے اسباب دے دیں کہ جلسے والے کرایہ دیں اور میں واپس کر دوں کہ میرے پاس ہیں۔ بس یہ میری مجبوری ہے کہ میں لے لیتا ہوں، ابھی اتنا ہے کہ جو دیتا ہے تو میں لے لیتا ہوں اور نہیں دیتا تو مانگتا نہیں ہوں، جتنے وہ دیں تو بس قبول کر لیتا ہوں۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَ الۡمِیۡزَانَ ؕ وَ مَا یُدۡرِیۡكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیۡبٌ ﴿۱۷﴾﴾

اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور میزان کو بھی اتارا ہے اور آپ کو کیا معلوم شاید کہ قیامت قریب ہو۔

"اَللّٰهُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ" یہ حقوق اللہ ہیں اور "وَ الۡمِیۡزَانَ" یہ حقوق العباد ہیں۔ "میزان" سے مراد ترازو ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ترازو میں چیزیں تولی جاتی ہیں بندوں کے حقوق کے لیے۔ تو اللہ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں سمجھائے ہیں۔ لہذا ہمیں دونوں قسم کے حقوق کو ادا کرنا چاہیے۔

رشتہ داری کا خیال کرو!

﴿قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَیۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی ؕ﴾

اے میرے پیغمبر آپ ان سے کہیں کہ میں تمہیں جو دعوت دیتا ہوں اس پر پیسے نہیں مانگتا، بس یہ کہتا ہوں کہ رشتہ داری کا خیال کرو۔

اس کو سمجھنا! یہ جو ﴿اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِی الۡقُرۡبٰی﴾ ہے یہ "اَجۡرًا" سے مستثنیٰ متصل نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ "میں آپ سے مزدوری نہیں مانگتا ہاں اتنا اجر مانگتا ہوں کہ رشتہ داری کا خیال کرو"... یہ مطلب نہیں ہے۔ یہ استثناء مفرغ

ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے کچھ بھی نہیں مانگتا، ہاں البتہ اتنی بات کہتا ہوں کہ میں تمہارا رشتہ دار ہوں، تم لوگ رشتہ داری کا خیال کرو، میری بات کو توجہ سے سنو! میں تمہارا آدمی ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمارہے ہیں۔ اور بسا اوقات مبالغے کے طور پر لوگ ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ میری مزدوری یہی ہے کہ تم میری قرابت کا خیال کرو۔ جیسے کسی عالم کو آپ بلائیں اور وہ کہے: بس! میرے پیسے یہی ہیں کہ تم مسئلہ سمجھ جاؤ، میں سمجھوں گا کہ مجھے تم نے بہت کچھ دے دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اس کی مزدوری تو نہیں ہے، یہ تو مبالغے کے انداز میں بات سمجھائی جارہی ہے۔

تو اللہ کے نبی بھی یہ فرمارہے ہیں کہ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا! بس میری قرابت کا خیال کرو، تمہارا رشتہ دار ہوں، تمہارا آدمی ہوں۔

دینی امور پر اجرت کا جواز:

اس پر میں بات کر چکا ہوں ﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿٨٦﴾﴾[114] کے تحت کہ جماعۃ المسلمین والے ایسی آیات کو پیش کر کے یہ بات کہتے ہیں کہ اجرت علی تعلیم الدین جائز نہیں ہے۔ بنیادی جواب ذہن میں رکھ لیں کہ یہ خطاب کفار کو ہے اور ہم اجرت کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے لیتے ہیں، یہ اغیار سے ہے اور ہم غیروں سے نہیں بلکہ اپنے معتقد سے لیتے ہیں، غیر سے لیں تو بات اور ہوتی ہے اور اپنے معتقد سے لیں تو بات اور ہوتی ہے۔

مصیبت کا اکثری سبب گناہ ہیں:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ

114۔ ص 86:38

﴿كَثِيرٍ ﴿٣٠﴾﴾

تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے تو یہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے ہے اور بہت سارے گناہ تو اللہ ویسے ہی معاف کر دیتے ہیں، ان کے بدلے میں تمہیں تکلیف دیتے ہی نہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات سمجھائی، فرمایا کہ بندے کو چھوٹی سے چھوٹی تکلیف بھی ہو تو یہ انسان کے گناہوں کی وجہ سے ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ اس آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ دنیا میں ہر بندے کو جو تکلیف آتی ہے تو وہ اس کے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو انبیاء علیہم السلام اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، اسی طرح نابالغ بچے اس سے مستثنیٰ ہیں، مجنون اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی تکالیف گناہ کی وجہ سے نہیں ہیں کیونکہ ان کا تو گناہ ہوتا ہی نہیں تو گناہ پر تکلیف کیسے آئے گی! ان کی تکالیف ہوتی ہیں ابتلاء اور آزمائش کی وجہ سے۔ حدیث مبارک میں ہے:

"أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً: اَلْأَنْبِيَاءُ." [115]

یہاں بلاء؛ ابتلاء ہے کہ سب سے زیادہ تکلیف نبی کو ہوتی ہے ابتلاء کے لیے۔

تو انبیاء علیہم السلام پہ ابتلاء اور آزمائش آتی ہے اور جن کے گناہ نہیں ان پہ بھی ابتلاء آتی ہے، اور بسا اوقات مصیبت آنے کی وجہ رفع درجات ہوتی ہے، اس کی وجہ گناہ نہیں ہوتے بلکہ مقصود درجات کو بڑھانا ہوتا ہے۔

دنیا کی زندگی کی حقیقت:

﴿فَمَآ أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾

115۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج10 ص280 رقم الحدیث 20096

جو کچھ تمہیں ملا ہے تو یہ دنیا کا سامان ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گا، یہ دنیا کے استعمال کی چیزیں ہیں، ان کی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔

اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات سمجھائی ہے، فرمایا:

أَنَّ الدُّنْيَا كُلَّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ.[116]

دنیا میں جو چیزیں خدا نے پیدا فرمائی ہیں یہ تمہارے استعمال کی ہیں اور ان میں بہترین چیز نیک عورت ہے۔

اللہ آپ سب کو عطا فرمائیں۔ اللہ آپ کو خوب صورت بھی دیں اور خوب سیرت بھی دیں، اللہ ایسی بیوی دیں کہ دیکھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے۔(آمین۔ سامعین) اور بہترین عورت کون سی ہوتی ہے! اس کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خَيْرُ النِّسَاءِ امْرَأَةٌ إِذَا نَظَرْتَ إِلَيْهَا سَرَّتْكَ" کہ بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو دیکھے تو تجھے مزا آ جائے، "وَإِذَا أَمَرْتَهَا أَطَاعَتْكَ" جب تو اس کو بات کہے تو فوراً وہ تیری بات مانے، "وَإِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِيْ مَالِهَا وَ نَفْسِهَا" اور جب تو کہیں چلا جائے تو وہ تیرے مال اور تیری عزت کی حفاظت کرے۔[117]

آخرت کے اجر کے مستحقین کی صفات:

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾

جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی ہے۔ کن کے لیے؟

[1]: ﴿اٰمَنُوْا﴾ ان کے لیے جن کے عقیدے ٹھیک ہیں۔

116۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج7 ص80 رقم الحدیث 13580

117۔ جامع الاحادیث للسیوطی: جزء12 ص365 رقم الحدیث 12105

[2]: ﴿وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ ان کے لیے جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، اور وہ کون لوگ ہیں؟ تو ان کی چند صفات بیان فرمائی ہیں:

﴿وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ﴾

[3]: یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں۔

یہاں "كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ" یعنی بڑے بڑے گناہ کا ذکر اس لیے فرمایا کیونکہ صغائر تو اللہ رب العزت ویسے ہی معاف فرما دیتے ہیں، اور "الْفَوَاحِشَ" بھی کبائر ہی ہوتے ہیں۔ بے حیائی کے کام کو الگ بیان فرمایا اس لیے کہ عام گناہ اور فحاشی میں فرق ہے، یہ قبیح زیادہ ہوتے ہیں، عیب دار زیادہ ہوتے ہیں۔ دیکھو! پیغمبر کی بیوی کافرہ ہو سکتی ہے لیکن زانیہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے شرعی عیب اور ایک ہوتا ہے انسانی سوسائٹی کا عیب۔ کفر بہت بڑا عیب ہے لیکن شرعی، انسانی سوسائٹی میں کفر عیب نہیں سمجھا جاتا۔ اور زنا ایسا عیب ہے جو انسانی سوسائٹی میں بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ اللہ اس عیب سے اپنے نبی کی بیوی کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں فواحش کا الگ مستقل ذکر فرمایا۔

﴿وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

[4]: جب کبھی غصہ ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ غصہ ہوتے ہی نہیں بلکہ فرمایا کہ غصہ ہوتے ہیں لیکن معاف کر دیتے ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے تھے: جو شخص غصے کی بات پر غصہ نہ ہو تو وہ گدھا ہے اور کوئی معافی مانگے اور وہ پھر بھی معاف نہ کرے تو وہ شیطان ہے۔

غصے کی بات پر غصہ آنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ بسا اوقات

خلافِ شرع بات دیکھتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اتنے غصے ہو جاتے کہ ایسا لگتا کہ جیسے آپ کے چہرۂ انور پر انار نچوڑ دیا گیا ہو، ایسے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا غصے کی وجہ سے۔

﴿وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٨﴾﴾

[7،6،5]: اور یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی بات مانتے ہیں بطورِ خاص نماز کی پابندی کرتے ہیں اور اپنے معاملات مشورے سے طے کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ نا کچھ خرچ بھی کرتے ہیں۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ ہر مہینے کچھ مرکز میں جمع کروایا کرو! یہ ہے "مِنۡ" ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ گھر سے لاتے ہو وہ سارا جمع کروادو، نہیں بلکہ اپنی چائے کے لیے بھی رکھو، اپنے کھانے پینے کے لیے بھی رکھو لیکن کچھ نا کچھ ہر مہینے مرکز میں بھی جمع کراؤ، یہ اپنا مزاج بناؤ۔

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾﴾

[8]: اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر ظلم ہو تو بدلہ لیتے ہیں۔

یہ مؤمن کی شان ہے۔ پیچھے فرمایا تھا "وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ" کہ جب غصے میں ہوں تو معاف کر دیتے ہیں اور یہاں فرمایا کہ بدلہ لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام ان کا مزاج یہ ہے کہ وہ معاف کرتے ہیں لیکن جہاں سمجھیں کہ ظالم کو معاف کرنے سے وہ ظلم میں اور بڑھ جائے گا اور فاسق کو معاف کرنے سے وہ فسق میں اور ترقی کرے گا تو پھر اس سے بدلہ بھی لے لیتے ہیں۔

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ﴾

اور تکلیف کا بدلہ تکلیف ہے اس جیسی۔ یہاں "سَيِّئَةٌ" سے مراد ہے

تکلیف۔ تکلیف دینا برا کام ہے، یہ کوئی اچھا کام تو نہیں ہے، یہ معنی ہے کہ برے کام کا بدلہ اسی جیسا برا ہے۔ نقصان دہ چیز کا بدلہ اسی جیسا نقصان دہ ہے، یہ نہیں کہ کوئی تمہارے ساتھ گناہ کرے تو تم اس کے ساتھ گناہ کرو! یہ معنی نہیں... اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

﴿فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾﴾

جو معاف کر دیں اور صلح کر لیں تو اس کا اجر اللہ دیں گے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتے۔

مطلب یہ کہ دنیا میں بدلہ لو گے تو تم نے خود بدلہ لیا ہے اور اگر تم چھوڑ دو گے تو آخرت میں اللہ دے گا اور اللہ کا بدلہ دنیا کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔

اولاد دینے والی ذات اللہ ہی کی ہے:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کا مالک اللہ ہی ہے، اللہ جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں بیٹیاں دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں بیٹے دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں بیٹے اور بیٹیاں دونوں دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نہ بیٹا دیتے ہیں اور نہ بیٹی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتے بھی ہیں کہ کس کو کیا دینا ہے، اور اللہ کو قدرت بھی ہے کہ اس کو کیا دینا ہے۔

آپ دعا کریں ہماری تو بڑی نیت ہے کہ اللہ اسباب عطا فرما دیں کہ قرآن کریم اس طرح مکمل ہو جائے کہ الحمد سے لے کر والناس تک ایک ایک آیت کی تفسیر

کروں، یہ میں نے نیت پکی کی ہے کہ ویڈیو ریکارڈنگ کرائیں، ایک ایک آیت کی تفسیر کریں، پہلے خلاصہ بیان کریں، پھر ایک ایک آیت پر بولتے جائیں، جب آپ قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر دیکھنا چاہیں تو بس ایک کلک کریں اور انٹرنیٹ آپ کو اس آیت کی تفسیر دے دے اور ترجمہ بامحاورہ ہو جس کو عام بندہ بھی سمجھ سکے۔

بیٹی خدا کی رحمت ہے:

یہاں یہ بات سمجھیں کہ ہر بندہ شادی کے بعد مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے بیٹا عطا فرما! اور قرآنی ترتیب کیا ہے؟ "یَهَبُ لِمَنۡ یَّشَآءُ اِنَاثًا" اللہ پہلے بیٹی کی بات کرتے ہیں۔ میں اس پر اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ میری پہلی بیوی سے بڑی بیٹی ہے، اس کے بعد دوسری بیوی سے پہلی بیٹی ہے، اس کے بعد تیسری بیوی سے پھر پہلی بیٹی ہے۔ تینوں بیویوں سے ہماری پہلی بیٹیاں ہی پیدا ہوئی ہیں۔

میں یہ باتیں سمجھانے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ دل بڑا رکھو! میں کچھ دن پہلے ایک جگہ بیان سے فارغ ہوا تو ایک بندہ مجھے کہنے لگا: مولانا صاحب! پانچ بیٹیاں ہیں، دعا کرو کہ اللہ بیٹا بھی دے۔ میں نے کہا کہ دیکھو! وہ بیٹا جو آپ کی بیوی سے ہو گا وہ کالا ہے یا گورا ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، ضدی ہے یا اچھا ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، جاہل ہے یا عالم ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، وہ لنگڑا ہے یا ٹھیک ہے آپ نے برداشت کرنا ہے، وہ پاگل ہے یا سمجھدار ہے آپ نے برداشت کرنا ہے اور اللہ نے جو آپ کو بیٹی دی ہے اس بیٹی کی وجہ سے جو آپ کو بیٹا ملنا ہے نا داماد... وہ آپ ہزاروں میں سے جس کو چاہو منتخب کرو، میں نے کہا: کیسے تم سادے آدمی ہو یار! داماد بھی تو بیٹا ہوتا ہے لیکن داماد آپ لاکھوں میں سے اپنی پسند کا چنیں... کالا نہ چنیں آپ سفید کو دے دیں، جاہل نہ چنیں آپ عالم کو دے دیں، لنگڑا نہ چنیں آپ صحیح چن لیں اور جو بیٹا آپ کا پیدا ہوا وہ جیسا بھی ہو آپ نے برداشت کرنا ہے۔ تو بیٹی اللہ کی ایسی نعمت

ہے... ایسی رحمت ہے... کہ بیٹی کی وساطت سے جو بیٹے ملتے ہیں وہ اپنی پسند کے ہوتے ہیں اور جو براہ راست ہوتے ہیں وہ اپنی پسند کے نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ کس الجھن میں پڑے ہو تم۔

حضرت مریم کی والدہ نے دعا مانگی تھی:

﴿رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا﴾[118]

کہ اے اللہ! جو میرے پیٹ میں ہے بس یہ بیٹا ہو جائے، "مُحَرَّرًا" کہ بیٹا پیدا ہو تو میں اس کو طالب علم بناؤں گی، مدرسے میں داخل کراؤں گی اور جب بیٹا نہیں بلکہ بیٹی پیدا ہوئی تو انہوں نے کہا: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰی ؕ﴾ اے اللہ یہ تو بیٹی پیدا ہو گئی ہے۔ جواب ملا ﴿وَ لَیۡسَ الذَّکَرُ کَالۡاُنۡثٰی ۚ﴾ کہ جو بیٹا تو نے مانگا تھا- "الذَّکَرُ" پر الف لام عہد کا ہے- وہ اِس بیٹی کی طرح نہیں ہے جو ہم نے دی ہے۔ تو نے بیٹا مانگا تھا اپنی حیثیت کے مطابق اور ہم نے بیٹی دی ہے اپنی شان کے مطابق۔

اس بیٹی کا اپنا لطف ہوتا ہے۔ اس لیے دل چھوٹا نہ کیا کریں۔ بیٹیاں ہیں تو ہماری بیویاں ہیں، بیٹیاں ہیں تو آج ہم پیدا ہوئے ہیں، بیٹیاں نہ ہوتیں تو ہماری زندگیاں کتنی اجیرن ہو جاتیں، اس لیے گھبرایا نہ کرو۔ بیٹا ہے تب بھی ٹھیک ہے اور بیٹی ہے تب بھی ٹھیک ہے۔

﴿وَ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَیُوۡحِیَ بِاِذۡنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ﴿۵۱﴾﴾

بشر کے ساتھ اللہ کلام کرے گا یا تو الہام کے ذریعہ یا اس سے کلام کرے گا

118۔ آل عمران 35:3

پردے کے پیچھے سے یا کلام کرے گا فرشتہ بھیج کر فرشتہ کے واسطہ سے

1: ”الہام“ کہ اللہ دل میں کوئی بات ڈال دیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں: ”اَلْقِیَ فِیْ رُوْعِیَ“ کہ میرے دل میں اللہ نے یہ خیال ڈالا ہے۔

2: پردے کے پیچھے سے جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بات ہوئی۔

3: جبرائیل امین علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ بھیج دیتے ہیں۔

”پیغمبر بشر نہیں“ پر استدلال کا جواب:

اہلِ بدعت کہتے ہیں کہ پیغمبر کے بشر نہ ہونے پر دلیل یہ آیت ہے کہ بشر وہ ہوتا ہے جس سے اللہ بات کریں گے الہام کے ذریعے یا پردے کے پیچھے یا بذریعہ فرشتہ... اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عرش پر براہِ راست خطاب کیا ہے... نہ الہام ہے، نہ پردہ ہے اور نہ ہی درمیان میں جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں ہیں، چونکہ بشر کے لیے طریقے تین ہیں اور یہ چوتھا طریقہ بشر کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اس کا جواب ہمیں دینے کی ضرورت نہیں، تبیان القرآن یہاں لائبریری میں موجود ہے اس کے مصنف مولانا غلام رسول سعیدی بریلوی صاحب ہیں کراچی کے، فوت ہوگئے ہیں اب، انہوں نے خود اس کے دو جواب دیے ہیں:

- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب براہ راست بالمشافہ ملاقات تھی بغیر حجاب کے تو اس میں گفتگو نہیں تھی، گفتگو کے یہی تین طریقے ہیں۔
- یہ عمومی ضابطہ بیان کیا ہے اور اس ضابطہ سے ہٹ کر حضور سے گفتگو یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے، جس سے بشریت پر فرق نہیں پڑتا۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے، ایک وقت تھا کہ آپ کو علم نہیں تھا کہ کتاب کیا ہے اور آپ کو ایمان کے اس درجہ کا علم نہیں تھا جس پر اب ہیں!

پیغمبر کو جب نبوت ملتی ہے تو نبوت ملنے سے پیغمبر صاحبِ ایمان ہوتا ہے، کیونکہ ایمان کا تعلق تو عقل سے ہے وحی سے نہیں ہے۔ اگر عقل نہ ہو اور وحی ہو تو ایمان کا بندہ مکلف نہیں ہوتا اور عقل ہو اور زمانہ فترت وحی کا ہو تب بھی آدمی پابند ہے ایمان لانے کا، یہ تو عام بندے کے لیے ہے تو نبی کے پاس ایمان کیسے نہیں ہو گا؟! اس لیے نبی اعلانِ نبوت سے پہلے صاحبِ ایمان ہوتا ہے لیکن ایمان کی تفصیلات اور ایمان کا وہ مقام جو اعلانِ نبوت کے بعد ہوتا ہے یہ پیغمبر کو معلوم نہیں ہوتا۔

﴿وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۟ۙ﴾

لیکن ہم نے اس قرآن کو نور بنایا ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت عطا فرماتے ہیں اور آپ بھی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرماتے ہیں۔ وہ راستہ کون سا ہے؟

﴿صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ۟۠﴾

یہ راستہ اللہ کا ہے جس کی ملکیت میں آسمان اور زمین ہیں اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ الزخرف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۚ﴿۳﴾﴾

حٰم، قسم ہے اس کتاب کی جو بڑی واضح ہے۔ ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو!

یہاں پر واضح ہونے سے مراد ہے کہ بطورِ وعظ و نصیحت قرآن کریم بڑی واضح کتاب ہے۔ اس کا معنی یہ کرنا کہ قرآن کریم میں احکام بہت واضح ہیں، یہ معنی غلط ہے۔ اگر احکام بہت واضح ہوتے تو استنباط اور اجتہاد کی ضرورت نہ ہوتی لیکن احکام کے لیے استنباط اور اجتہاد کرنا پڑتا ہے۔

﴿وَ اِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ؕ﴿۴﴾﴾

اور یہ قرآن ہمارے پاس لوحِ محفوظ میں ہے اور یہ قرآن عظیم اور حکمت والی کتاب ہے۔

یہاں دیکھیں اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ اُمُّ الۡکِتٰبِ میں ہے۔ میں صرف یہ بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ اُم کا معنی ہمیشہ ماں نہیں ہوتا، اس کا معنی اصل بھی ہوتا ہے، بنیاد بھی ہوتا ہے، ماں بھی ہوتا ہے اور ٹھکانا بھی ہوتا ہے۔ مختلف اس کے

معانی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ﴾[119] کا معنی ٹھکانا ہے، ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾[120] کا معنی اصل ہے اور ﴿وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾[121] میں اُم سے مراد ماں ہے۔ تو لفظ ام کے کئی معنی آتے ہیں، ہمیشہ ایک معنی کبھی نہ کریں۔

ثواب و عذاب قبر پر ایک دلچسپ واقعہ:

میرا ایک مرتبہ ملتان میں جمعہ تھا۔ تلمبہ مدرسہ جو رائیونڈ کی شاخ ہے وہاں کے صدر مدرس مولانا ریاض صاحب کا مجھے فون آیا کہ آپ ذرا جلدی آ جائیں، یہاں قادر پور میں کسی بندے سے بات کرنی ہے۔ ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کون سے علاقے میں کون سا فتنہ ہے اور وہاں کون سی بات ہو گی۔ تو میں نے صحاحِ ستہ جو ایک جلد میں اکٹھی چھپی ہے وہ ساتھ رکھ لی اور رات کو ہی تلمبہ چلا گیا۔ رات وہیں سویا۔ طلبہ سوالات کرتے رہے، ہمارے جوابات چلتے رہے۔ صبح اس بندے کے پاس گئے جس سے ملاقات کرنی تھی۔ عمر اُس کی کافی تھی اور وہ تھا جماعۃ المسلمین کا کارکن جو عذابِ قبر کا منکر تھا۔

مولانا نے مجھے بتایا کہ مولانا طارق جمیل صاحب سے اس کی بات ہوئی ہے لیکن مولانا کا چونکہ مناظرانہ مزاج نہیں ہے تو یہ بندہ قابو نہیں آیا۔ مولانا نے ان کو سمجھایا بھی کہ سارے مسائل قرآن میں نہیں ہوتے، تفصیلات احادیث میں ہوتی ہیں، نماز کا ذکر قرآن میں ہے لیکن اس کی تفصیلات احادیث میں ہیں، حج کا ذکر قرآن میں ہے لیکن تفصیلات احادیث میں ہیں اور مولانا کی یہ بات بڑی معقول تھی لیکن اس

119۔ القارعۃ 9:102

120۔ آل عمران 7:3

121۔ المائدۃ 75:5

بندے نے کہا کہ نہیں جی! جو قرآن میں ہے ہم وہ مانیں گے اور جو نہیں ہے ہم نہیں مانیں گے۔

خیر ہم وہاں چلے گئے۔ اس نے کہا کہ یہ جو عذابِ قبر ہے اس کو ہم نہیں مانتے کیونکہ قرآن کریم میں نہیں ہے۔ میں پہلے سمجھتا ہوں کہ اس بندے کی اصل بیماری کیا ہے تاکہ اس کو وہاں سے پکڑوں۔ میں نے قرآن کریم کی آیت پڑھی:

﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾[122]

کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھتے ہیں دنیا میں اور قبر میں۔

میں نے کہا کہ دیکھو! یہاں قبر کی بات آگئی ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں تو "الْاٰخِرَةِ" ہے، قبر تو نہیں ہے آپ نے "الْاٰخِرَةِ" کا معنی قبر کیسے کر دیا؟ چونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ یہ سوال کرے، کیونکہ یہ سوال کرے گا تو آگے چلیں گے۔ تو میں نے کہا کہ پھر "الْاٰخِرَةِ" کا کیا معنی کریں؟ اس نے کہا کہ آخرت کا معنی آخرت کریں۔ میں نے کہا کہ آخرت کسے کہتے ہیں؟ یہ دنیا ہے، اس کے بعد آخرت ہے۔ آخرت تو موت کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے تو یہاں آخرت سے کون سا معنی مراد ہو گا؟ کیونکہ موت کے فوراً بعد سے حشر تک یہ بھی آخرت ہے... حشر سے لے کر دخولِ جنت اور دخولِ جہنم تک یہ بھی آخرت ہے... دخولِ جنت اور دخولِ جہنم کے بعد کی زندگی یہ بھی آخرت ہے... تو یہاں ہم آخرت کا کون سا معنی مراد لیں گے؟ میں نے کہا کہ دیکھو! جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾

اب اُم کا معنی ایک تو نہیں ہے کہ جہاں بھی اُم آئے گا تو اس کا معنی ماں ہی

122۔ ابراہیم 27:14

کریں گے۔ ﴿وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ یہاں معنی ماں ہے، ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ یہاں اُم کا معنی اصل ہے، ﴿فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹﴾ یہاں اُم کا معنی ٹھکانا ہے۔ تو لفظ تو ایک ہی ہے لیکن معانی کئی ہیں۔ اسی طرح "الْاٰخِرَةِ" لفظ تو ایک ہے لیکن اس کا ایک مصداق ہے قبر سے حشر تک، ایک مصداق ہے حشر سے جنت تک اور ایک مصداق ہے جنت کے بعد... تو یہاں کون سا مصداق ہو گا؟

میں نے کہا کہ اس کا مصداق نہ آپ متعین کر سکتے ہیں، نہ میں متعین کر سکتا ہوں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا مصداق کیا متعین فرمایا ہے؟ اس پر میں نے پھر روایت پڑھ دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب بندے کو قبر میں اتارا جاتا ہے، ملائکہ آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں، پھر تین سوال کرتے ہیں: "مَنْ رَبُّكَ؟ وَمَا دِينُكَ؟ وَمَنْ نَبِيُّكَ؟" بندہ ان تین سوالوں کا جواب دے دیتا ہے تو ایک فرشتہ آسمان سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ فرما رہے ہیں: "أَنْ قَدْ صَدَقَ عَبْدِيْ" کہ میرے بندے نے سوالوں کا صحیح جواب دیا ہے، "فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ" اس کو جنت کا بچھونا دو! "وَأَلْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ" اس کو جنت کا لباس دے دو!، "وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ" جنت کی طرف سے دروازہ کھول دو! "فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيبِهَا" جنت کی ہوائیں اور جنت کی خوشبو اس قبر میں پہنچ جاتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"فَذٰلِكَ قَوْلُ اللهِ تَعَالٰى ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ" کا یہی مطلب ہے۔[123]

میں نے کہا: دیکھو! قبر کی پوری زندگی بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "آخرۃ" کا معنی یہ ہے۔ آپ اللہ کے نبی سے ثابت کرو کہ آخرۃ کا معنی یہ نہیں ہے بلکہ یہاں آخرت سے مراد حشر ہے یا جنت اور جہنم ہے۔

اب دیکھو! میں نے اس پوری گفتگو میں حدیث کا نام نہیں لیا، کیونکہ وہ حدیث کے نام سے بدکتا تھا تو ہم نے حدیث کا نام نہیں لیا تو وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ حدیث ہم نہیں مانتے، قرآن پیش کرو۔ بات میں نے حدیث سے کی لیکن حدیث کا نام نہیں لیا۔ اب اِس کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چونکہ ضد ہے اور ماننا نہیں ہوتا تو اس نے ایک دو باتیں اور کیں، پھر میں نے بات کی۔

اس دوران ایک سنجیدہ سمجھدار آدمی کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ دیکھیں مولانا صاحب! آپ آئے ہیں تیاری کر کے اور ہم نے تیاری نہیں کی، آپ کے پاس کتابیں ہیں اور ہم تو ویسے بیٹھے ہیں، پھر کبھی کتابیں لے کر بیٹھیں گے تو بات حل ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ یہ بات اُس نے کیوں کی؟ دراصل وہ بندہ ہمارا ہم نوا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ فساد نہ ہو اور بات سمجھ میں آ جائے، وہ بابا جی بڑی عمر کے ہیں اور ضدی ہیں وہ تو مانیں گے نہیں لیکن آئندہ کوئی بندہ اس کے پاس بات کے لیے اس کے ڈیرے پر نہیں آئے گا، بس لوگوں کے سامنے بات کھل گئی جو ہمارا مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ تو میں بتا رہا تھا کہ اُم کا معنی ہمیشہ ماں نہیں ہوتا۔

نصیحت کرتے رہنا چاہیے:

﴿اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝۵﴾

123۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4753

کیا تمہاری ضد اور حد سے تجاوز کی وجہ سے ہم تم سے اس نصیحت اور ذکر کو پھیر لیں گے ؟! تمہیں نصیحت نہیں کریں گے ؟!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حد تک ممکن ہو فاسق کو، کافر کو، ہر کسی کو نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔

سواری پر بیٹھنے اور سفر کی دعا:

﴿ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ ﴾

پاک ہے وہ ذات جس نے یہ سواری ہمارے تابع کر دی، اور ہم اس سواری کو اپنے قابو میں نہیں لا سکتے تھے، اور ہمیں اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔

جب سواری پر پاؤں رکھیں تو پڑھیں: بسم اللہ، اور جب اس پر بیٹھ جائیں تو کہیں: الحمد للہ، پھر یہ دعا پڑھیں: "سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۳﴾"

اور بھی دعائیں احادیث میں موجود ہیں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ دو دعائیں الگ ہیں؛ ایک ہے دعا سواری کی اور ایک ہے دعا سفر کی، یہ دعا سفر کی نہیں ہے یہ دعا سواری کی ہے، سفر کی دعا الگ ہے، سفر کی دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡأَلُكَ فِیۡ سَفَرِنَا ھٰذَا الۡبِرَّ وَالتَّقۡوٰی وَمِنَ الۡعَمَلِ مَا تَرۡضٰی.[124]

یہ الگ دعا ثابت ہے اور "اَللّٰھُمَّ ھَوِّنۡ عَلَیۡنَا سَفَرَنَا"[125] یہ دعا الگ ہے۔

124۔ سنن ابی داؤد، رقم:2599

125۔ سنن ابی داؤد، رقم:2599

دونوں میں فرق کیا ہے؟ جب آپ گھر سے نکلیں اور سفر پہ چلے جائیں تو دعائے سفر ایک مرتبہ پڑھنا کافی ہے اور سواری کی دعا جب بھی سوار ہوں گے پڑھتے رہیں گے، سفر کی دعا بار بار پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بیٹی کی پیدائش پر مشرک کے تاثرات:

﴿اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿١٦﴾ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿١٧﴾﴾

اللہ نے مشرکین کی غلط فہمی دور کی ہے۔ مشرکین کہتے تھے کہ اللہ نے فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنایا ہے۔ اللہ رب العزت نے بات سمجھائی ہے کہ تمہاری اپنی حالت یہ ہے کہ اگر تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہو تو تمہارے چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں تو جس چیز کو تم اپنے لیے ناپسند کرتے ہو وہ تم اللہ کے لیے کیسے ثابت کرتے ہو؟ ہاں اگر تمہارے ہاں بیٹی بہت فخر کی علامت ہوتی اور تم یہ کہتے کہ اللہ نے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا ہے پھر بھی کوئی بات تھی! جو چیز تمہارے ہاں پسندیدہ نہیں ہے اس کو تم اللہ کے لیے کیسے ثابت کرتے ہو؟

زیورات میں رہنا عورت کی فطرت ہے:

﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَ هُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿١٨﴾﴾

پھر آگے فرمایا کہ عورت کی تو فطرت اور طبیعت یہ ہے کہ وہ زیور میں کھیلتی ہے اور بات کھل کر سمجھا نہیں سکتی۔

یہاں زیور میں رہنا یہ عورت کی طبیعت بیان کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیور کا استعمال عورت کے لیے ہے، مرد کے لیے نہیں ہے، اور اگر عورت زیور کا مطالبہ کرے تو دینا چاہیے، مطالبہ نہ بھی کرے تب بھی بغیر مطالبہ کے دینا چاہیے، یہ

اس کی فطرت ہے، یہ عورت کی طبیعت ہے۔ لیکن یہ یاد رکھ لیں کہ عورت کے لیے سونے اور چاندی کی انگوٹھی اور سونے اور چاندی کے دیگر زیورات جائز ہیں لیکن انگوٹھی سونے اور چاندی کے علاوہ دیگر دھاتوں کی جائز نہیں ہے۔ آج کل ہمارے ہاں نقلی زیور چلتے ہیں، اس کی چوڑیاں تو جائز ہیں لیکن انگوٹھی جائز نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیں اور اپنے گھروں میں بتائیں کہ گھروں میں عورتیں دھاتی انگوٹھیاں پہنتی ہیں جو سونے یا چاندی کی نہیں ہوتیں، یہ جائز نہیں ہے۔

﴿وَ هُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾... یہ جنسِ عورت کی بات کی ہے ورنہ بہت سی عورتیں فصاحت میں ایسی ہوتی ہیں کہ مرد بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

غلط عقائد و اعمال سے براءت ضروری ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٦﴾﴾

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم سے فرمایا کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو میں ان سے بری الذمہ ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب ماحول غلط قسم کا ہو تو آدمی ماحول کی وجہ سے ان غلط قسم کی رسومات میں شرکت نہ کرے اور صرف شرکت نہ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ براءت کا اعلان کرنا بھی ضروری ہے کہ میرا کام یہ نہیں ہے جو تم کرتے ہو... اگر آدمی بدعتی ماحول میں رہتا ہو اگرچہ وہ بدعات کا ارتکاب نہ کرے لیکن چونکہ ایسے ماحول میں رہتا ہے تو لوگ بدعتی سمجھیں گے اس لیے اس کے لیے ضروری ہے کہ بدعات کا ارتکاب بھی نہ کرے اور بدعات کا رد نہیں کر سکتا تو کم از کم بدعات سے براءت کا اعلان ضرور کر دے کہ میں یہ کام نہیں کرتا جو تم کرتے ہو۔

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾﴾

مشرکین کہتے کہ اگر یہ قرآن اللہ نے اتارنا تھا تو یہ مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر اتارا جاتا جس کے پاس مال اور دولت خوب ہوتا، قرآن کو اتارا ہے تو ایک غریب آدمی پر جس کے پاس مال و دولت نہیں ہے، جس کے پاس طاقت نہیں ہے۔

اب ان کی خواہش یہ تھی کہ اللہ کی رحمتِ خاصہ جو نبوت ہے یہ غریب آدمی کو نہیں بلکہ امیر آدمی کو ملنی چاہیے تھی۔ اللہ ان کے جواب میں فرماتے ہیں:

﴿اَهُمۡ يَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّكَ‌ؕ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا﴾

کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟! یہ رحمتِ عامہ جو دنیا کی روزی ہے یہ بھی ہم خود تقسیم کرتے ہیں تو رحمتِ خاصہ جو نبوت ہے کیا وہ تم تقسیم کرو گے کہ اس کو دے دو اور اس کو نہ دو؟

﴿وَ رَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَـتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا‌ؕ﴾

ہم نے معیشت میں تقسیم اس لیے کی ہے تاکہ ایک آدمی کا دوسرے سے کام لینا آسان ہو جائے، آسانی سے کام لے سکے۔ اگر سارے ہی مالدار ہوتے تو مزدوری کون کرتا؟ سارے ہی مزدور ہوتے تو پیسے کون دیتا؟ تو اللہ نے کچھ غریب بنائے اور کچھ امیر بنائے۔

﴿وَرَحۡمَتُ رَبِّكَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۲﴾﴾

اور اللہ کی رحمتِ خاصہ جو نبوت ہے یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جس کو تم جمع کرتے پھرتے ہو!

مطلب یہ کہ تم نبوت کو تقسیم کرتے ہو کہ نبوت اس کو ملنی چاہیے اس کو نہیں ملنی چاہیے۔ نبوت رحمتِ خاصہ ہے۔ دنیا کی روزی رحمتِ عامہ ہے جس کی اللہ کے ہاں کوئی وقعت ہی نہیں ہے اللہ نے اس کی تقسیم کا اختیار تمہیں نہیں دیا تو نبوت کی تقسیم کا اختیار تمہیں کیسے دیں گے ؟!

اللہ کے ہاں دنیا کی زینت کی کوئی قیمت نہیں:

﴿وَلَوْلَآ اَنْ یَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ زُخْرُفًا﴾

اللہ کا تکوینی نظام ہے کہ دنیا میں کچھ کافر اور کچھ مسلمان رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہو کہ سارے لوگ ہی کافر ہو جائیں گے تو ہم کافروں کو اتنا دیتے کہ ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی ہوتیں، سیڑھیاں چاندی کی ہوتیں، دروازے چاندی کے ہوتے، تکیے چاندی کے ہوتے، ”وَ زُخْرُفًا“ اور سونے کے۔

اس کا معنی یہ نہیں کہ سارے چاندی یا سارے سونے کے، مطلب کہ کچھ سونے کے کچھ چاندی کے۔ جیسے ہمارے عرف میں کہتے ہیں سونے اور چاندی کے برتن... تو اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ سارے سونے کے ہیں یا صرف پلیٹیں سونے کی ہیں۔

تو اللہ فرما رہے ہیں کہ ہمارا نظام ایسا ہے کہ کچھ مسلمان ہوں گے اور کچھ کافر۔ اگر یہ نظام نہ ہوتا ہوتا تو ہم کافروں کو اتنا مال دیتے کہ دنیا میں سارے لوگ کافر ہو جاتے لیکن مال کی کثرت ہم ہر کافر کو نہیں دیتے کہ جو بھی کافر ہو گا تو اس کو مال

خوب دیں گے ورنہ اس طرح تو ہر بندہ کافر ہو جائے گا۔ اس لیے ایسا نہیں ہوتا۔

﴿وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾﴾

یہ سب دنیا کے فائدے کی چیزیں ہیں اور اصل آخرت ہے جو اللہ متقین کو عطا فرمائیں گے۔

دنیا کی قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں:

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ" کہ اگر اللہ کے ہاں دنیا کی قیمت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو "مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ" اللہ کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا۔[126]

چونکہ خدا کے ہاں دنیا کی قیمت نہیں ہے اس لیے کفار کو دے دیتے ہیں۔

لیکن جو کافر ہو اس کو خوب مال دیں یہ بھی نہیں ورنہ تو سارے لوگ کافر ہو جاتے۔

﴿وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

جو ضد کی وجہ سے اللہ کے ذکر کو چھوڑ دیتا ہے، اللہ کی بات کو نہیں مانتا تو اللہ اس پر شیطان مسلط فرمادیتے ہیں۔ وہ شیطان اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور شیطان اس کو سیدھے راستے سے ہٹاتا ہے اور یہ بندہ سمجھتا ہے کہ وہ ہدایت پر ہے حالانکہ ہدایت پر نہیں ہوتا۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

126۔ سنن الترمذی، رقم:2320

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ
الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾

جب قیامت کا دن ہو گا تو یہ اپنے اس شیطان ساتھی سے کہے گا کہ کاش! میرے اور تمہارے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا کیونکہ تو بہت برا ساتھی ہے... لیکن تم لوگ اپنے آپ پر ظلم و ستم کر چکے ہو آج تمہاری اس حسرت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، آج تم اس عذاب میں اکٹھے شریک ہو گے۔

﴿اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ مَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾﴾

اے نبی! کیا آپ بہروں کو سنائیں گے؟ کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھائیں گے؟ کیا آپ ان لوگوں کو راہِ راست پر لائیں گے جو کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں؟

برے دوست سے اجتناب:

دوستی بری چیز نہیں ہے لیکن دوست ایسا بناؤ جو اچھا ہو اور کسی بندے کو پرکھنا ہو کہ بندہ کیسا ہے، اس کا معیار کیسا ہے تو آپ اس کے دوستوں کو دیکھ لو۔ کسی شاعر کا شعر ہے:

عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْأَلْ وَ أَبْصِرْ قَرِيْنَهٗ   وَ كُلُّ قَرِيْنٍ بِالْمُقَارِنِ مُهْتَدِيْ

اگر دیکھنا ہو کہ بندہ کیسا ہے تو اس کے دوست دیکھو، اس لیے کہ بندہ اپنے دوستوں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔

ایسا ممکن نہیں ہے کہ بندہ خود اچھا ہو اور دوست اس کے برے ہوں، اس کے دوست اچھے ہی ہوں گے اور جو دوستی کے لیے برے کو پسند کرتا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ یہ نام کا اچھا ہے، اس کی فطرت میں اچھائی نہیں ہے، ورنہ اپنے دوست ہمیشہ

اچھے رکھتا۔

وفات کے بعد اچھا تذکرہ:

﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾

میرے پیغمبر! یہ جو قرآن کریم ہے یہ آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نیک نامی کا ذریعہ ہے، ایک شرف کی چیز ہے۔ یعنی لوگ قرآن پڑھتے رہیں گے تو آپ کا تذکرہ ہوتا رہے گا، یہ آپ کے لیے شرف کا باعث ہے اور آپ کی قوم کے لیے شرف کا باعث ہے۔

اس آیت سے بعض مفسرین نے استدلال فرمایا ہے کہ کسی بندے کی اچھی شہرت ہونا اور اس کی موت کے بعد اچھے لفظوں سے اس کا تذکرہ ہونا یہ بری بات نہیں ہے، یہ اچھی بات ہے۔ حضرت ابرہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی:

﴿وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾﴾

کہ اے اللہ! میں وفات پا جاؤں تو اس کے بعد لوگ مجھے اچھے لفظوں میں یاد کریں۔

اللہ! لوگوں کی نظروں میں مجھے بڑا بنا دے

یہ بات یاد رکھنا! نیک عمل کرنا تاکہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں یہ تو رِیا ہے لیکن نیک عمل کرنا تاکہ اللہ راضی ہو جائے اور یہ خواہش ہو کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں یہ رِیا نہیں ہے، یہ پسندیدہ امر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کیا ہے، اسباب جمع کیے ہیں کہ میری دعوت لوگ قبول کریں، اسباب میں سے ایک سبب دعا ہے اور ایک دعا یہ ہے:

وَاجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا۔ [127]

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا بنادے اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنادے۔

لوگ بڑا سمجھیں گے تو بات قبول کریں گے، اگر بڑا نہیں سمجھیں گے تو بات قبول کیسے کریں گے؟! لیکن "فِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا" کے لیے ضروری ہے کہ "فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا" ہو۔ جو "فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا" ہوتا ہے وہ "فِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا" ہوتا ہے، جو بندہ اپنی نگاہ میں چھوٹا ہوتا ہے اللہ اس کو دوسروں کی نگاہ میں بڑا کر دیتے ہیں اور جو اپنی نگاہ میں خود کو بڑا سمجھے اللہ اس کو دوسروں کی نگاہ میں چھوٹا اور ذلیل کر دیتے ہیں۔

نوافل مسجد میں پڑھنے کی نصیحت:

حضرت امام صاحب نے اپنے ایک شاگرد کو وصیت فرمائی کہ واپس جاؤ تو نوافل مسجد میں پڑھنا، تو لوگ نوافل کی وجہ سے تمہیں نیک سمجھیں گے اور پھر تجھ سے مسائل پوچھیں گے۔ اب دیکھیں اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مجھے نیک سمجھ کر مجھے ہدیے دیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ مجھے اچھا سمجھیں گے تو مجھ سے مسائل پوچھیں گے۔ شریعت میں یہ مطلوب ہے۔

حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی رحمہ اللہ کے ایک مرید نے کہا کہ حضرت! میں دکان پر بیٹھا ہوتا ہوں، جب گاہک نہیں ہوتے تو بسا اوقات وقت لغویات اور فضولیات میں گزر جاتا ہے، حضرت میں کیا کروں؟! فرمایا: تسبیح ہاتھ میں رکھ لو، جب گاہک نہ ہوں تو تسبیح پڑھ لیا کرو۔ اس نے پھر خط لکھا کہ حضرت! میں تسبیح تو پڑھتا ہوں لیکن میرے دل میں وسوسہ آتا ہے کہ لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ تو اس پر حضرت

127۔ جامع الاحادیث: جزء 6 ص 103 رقم الحدیث 4801

نے فرمایا کہ پھر تم کیا چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں برا سمجھیں؟! بھائی اس پر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تم تسبیح اللہ کے لیے کرتے ہو لوگوں کے لیے نہیں کرتے لیکن اس کا اللہ نے دنیا میں نفع تمہیں یہ دیا کہ لوگ اچھا سمجھنے لگے، تو اس میں حرج کی بات کیا ہے؟

ہم علم پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں کہ اللہ راضی ہو جائیں، ہماری آخرت ٹھیک ہو جائے، شریعت پر عمل کی توفیق مل جائے اور اس کا دنیا میں فائدہ یہ ہے کہ لوگ بھی اچھا سمجھتے ہیں تو اس میں حرج کی بات کیا ہے؟ ایک ہوتا ہے پڑھنا پڑھانا تاکہ لوگ اچھا سمجھیں، ایک ہوتا ہے پڑھنا پڑھانا تاکہ اللہ راضی ہو اور اللہ اس کا نتیجہ دیتے ہیں کہ لوگ بھی اچھا سمجھتے ہیں۔ اللہ قرآن میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾﴾ [128]

جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اللہ ان کے لیے محبت کی فضا بنا دیتے ہیں۔

اللہ اعلان فرماتے ہیں کہ اے ملائکہ! میں فلاں بندے سے پیار کرتا ہوں تم بھی کرو، پھر ملائکہ دیگر مخلوق میں اعلان کرتے ہیں کہ اس سے خدا پیار کرتے ہیں تم بھی کرو، وہ آواز اتنی پھیلتی ہے کہ لوگ اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔

دونوں میں فرق اچھی طرح سمجھ لو! اس وجہ سے عمل کرنا کہ لوگ اچھا سمجھ لیں یہ تو رِیا ہے لیکن عمل کرنا اللہ کے لیے اور لوگ بھی اچھا سمجھ لیں تو یہ محمود ہے... یہ مذموم نہیں ہے۔ اور حدیث پاک میں بھی ہے:

لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ أَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ. [129]

128۔ مریم 96:19

129۔ سنن الترمذی، رقم: 2254

کہ مؤمن کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا ابتلاء:

ایک یہ ہے کہ آپ دین کا کام کرتے ہیں اور اس کام میں ذلت آتی ہے تو پھر پیچھے نہ ہٹیں، اس کو پھر برداشت کریں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ طلاق مکرہ یعنی جبراً طلاق واقع نہیں ہوتی۔ احناف کے ہاں جبری طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا: "طَلَاقُ الْمُكْرَهِ لَيْسَ بِشَيْءٍ" حاکمِ مدینہ نے کہا کہ تمہارا فتویٰ غلط ہے۔ حضرت نے کہا کہ جو فتویٰ دیا ہے میں اس پر قائم ہوں۔ ایک وقت تھا کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ روزانہ نیا سوٹ پہنتے تھے اور جو جوڑا ایک بار پہنتے وہ زندگی میں دوبارہ نہیں پہنتے تھے۔ اپنے شاگردوں کے جھرمٹ میں باہر نکلتے عجیب شاہانہ انداز میں آکر مسندِ حدیث پر بیٹھتے اور درس دیتے اور ہزاروں لوگ ان کا درس سننے کے لیے آتے۔ لیکن ایک وقت یہ بھی آیا حضرت امام مالک رحمہ اللہ کو سزا کے طور پر اونٹ پر بٹھا کر مدینے کی گلیوں میں پھرایا گیا امام مالک رحمہ اللہ گرج برس کر بولنے لگے: "أَلَا مَنْ عَرَفَنِي فَقَدْ عَرَفَنِي" جو مجھے جانتا ہے وہ تو مجھے جانتا ہے "وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْنِي فَأَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ" اور جو نہیں جانتے وہ سن لیں کہ میں مالک ابن انس ہوں، "وَأَنَا أَقُولُ طَلَاقُ الْمُكْرَهِ لَيْسَ بِشَيْءٍ" میں کہتا ہوں کہ طلاق مکرہ واقع نہیں ہوتی۔[130]

یہ ہوتا ہے امام ربانی۔ بظاہر تھوڑی سی ذلت آئی اور دین کو چھوڑ دیا تو یہ کون سا عالم ہے؟ تھوڑی سی گرفتاری آئی تو دین کو بدل دیا یہ کون سا عالم ہے؟ یہ لعنت کا مستحق ہے یہ مولوی تھوڑا ہو سکتا ہے! ہمیشہ اللہ کی نعمتیں کھاتے ہو، کبھی تھوڑی سی

130۔ حلیۃ الاولیاء: ج6 ص345 ترجمہ مالک بن انس

مصیبت آئے تو برداشت کرو، بچپن سے لے کر ڈاڑھی سفید ہو گئی اللہ کے نام پر صدقات کھاتے ہیں، بکرے چھترے کیا کچھ ہم نے نہیں کھایا... اس لیے خدا کے نام پر تھوڑی سی جیل آجائے تو پیچھے مت ہٹو! ذلت آئے تو برداشت کرو! ڈٹ جاؤ دین پر!

اکابر کا ابتلاء اور ثابت قدمی:

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ- جن کے ہم مقلد ہیں- چار سال آخری عمر کے آپ نے جیل کاٹی ہے اور جیل سے ہی جنازہ اٹھا ہے لیکن ہمارے امام موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کوڑے کھائے لیکن اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔ میں اس لیے کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے لیکن جب اللہ کے دین کے لیے ذلت اٹھانی پڑے تو اسی ذلت میں ہمارے لیے عزت ہے، یہ موت کے بعد فیصلے ہوں گے، دنیا میں فیصلے نہیں ہوا کرتے، دنیا امتحان کی جگہ ہے۔

ما معذورم کہ مارا ننگ است!

علامہ سعد الدین تفتازانی علم الکلام، معانی، بیان، بدیع، صرف، نحو، منطق کے ایک جید عالم تھے۔ ان کو تیمور لنگ بادشاہ نے بلایا ملاقات کے لیے۔ تیمور لنگ بادشاہ کی ٹانگ میں عذر تھا، زخم آیا تو ٹانگ ایسی ہو گئی کہ فولڈ نہیں ہوتی تھی بلکہ سیدھی رہتی تھی۔ لنگ کا معنی کہ تھوڑے سے لنگڑے تھے۔ بادشاہ تخت پر بیٹھے اور ٹانگ سیدھی کر کے بیٹھے۔ جب علامہ تفتازانی آئے تو بادشاہ کی طرف سیدھی ٹانگ کر کے بیٹھے۔ تیمور لنگ نے کہا: ما معذورم کہ مارا لنگ است، میرا تو عذر ہے کہ میں لنگڑا ہوں۔ علامہ فرمانے لگے: ما معذورم کہ مارا ننگ است، میری مجبوری ہے کہ غیرت مند ہوں۔ یہ ہوتے تھے علماء... جب تک علماء ایسے تھے دین تباہ نہیں ہوا اور جب ہم جیسے ہوئے تو دین تباہ ہو گیا۔ اس لیے اللہ کے لیے اٹھ جاؤ! اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ! کچھ نہیں ہوتا، ذلت اور عزت اللہ کے ہاتھ میں ہے، رزق کے دروازے اللہ کے ہاتھ میں ہیں،

سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

مسئلہ ٹھیک بیان کرو!

مسئلہ ٹھیک بیان کرو اور میں آپ کی خدمت میں بار ہا عرض کر چکا ہوں کہ مسئلہ غلط کبھی بیان نہ کرنا! اگر ایمان اتنا کمزور ہے کہ طاقت اور مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تو خاموش ہو جاؤ لیکن غلط مسئلہ بیان نہیں کرنا۔ دیکھو! ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد کے لوگ ہیں، ہمارے تھوڑے سے ڈٹ جانے پر بہت مدد آتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے کئی نبی ایسے گزرے ہیں کہ جن کا کلمہ گو ایک بندہ بھی نہیں ملتا اور آج علماء میں سے ایسے نہیں ہیں کہ جن کا ماننے والا کوئی نہ ہو، اس کے ماننے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔

آخر وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ نبی کا ایمان اس مقام پر ہوتا ہے کہ ایک بھی اس کا ماننے والا نہ ہو تو اس کے ایمان میں تزلزل نہیں آتا اور امتی کا ایمان کمزور ہوتا ہے، اس کی محنت پر لوگ نہ جڑیں تو بیچارہ پریشان ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی تھوڑی سی محنت پر ظاہری نتیجہ بہت عطا فرما دیتے ہیں اور نبی بسا اوقات بہت محنت کرتا ہے لیکن ظاہری نتیجہ نہیں نکلتا چونکہ پیغمبر کے ایمان میں تزلزل نہیں آتا، پاؤں نہیں ڈگمگاتے اور ہماری محنت پر نتیجہ نہ ہو تو پھر پریشانی ہو جاتی ہے تو اللہ اس پریشانی سے بچانے کے لیے تھوڑی محنت پر نتیجہ بہت عطا فرما دیتے ہیں۔ پھر بے وقوف وہ ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ میری محنت ہے میں نے ایسا کیا ہے، اس نے ایسا نہیں کیا ہوتا بلکہ اللہ کا خاص کرم متوجہ ہوتا ہے کہ اللہ پاک اس سے کام لے لیتے ہیں۔ تو کام بھی کریں اور دعائیں بھی مانگیں، اللہ تعالیٰ بہت عطا فرمائیں گے۔

نبی کی وحی اپنی قوم کی زبان میں ہوتی ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ﴾... فرمایا اے میرے پیغمبر! یہ قرآن کریم

آپ کے ذکر کا ذریعہ ہے اور آپ کی قوم کے ذکر کا ذریعہ بھی ہے۔ یہاں "وَ لِقَوْمِكَ" سے مراد بعض کہتے ہیں کہ آپ کی قوم قریش ہے، بعض کہتے ہیں کہ مراد پوری امت ہے، صحیح بات یہی ہے کہ مراد قریش ہی ہونے چاہییں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں لفظ "قوم" آیا ہے اور پیغمبر اپنی قوم کی زبان میں بات کرتا ہے، تو اگر مراد پوری امت ہوتی تو کئی زبانوں میں بات کرتے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو ہمیشہ عربی میں فرمائی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ﴾[131]

نبی کی وہی زبان ہوتی ہے جو نبی کی قوم کی زبان ہے، نبی پر وحی اسی زبان میں آتی ہے جو نبی کی قوم کی زبان ہوتی ہے۔

ایک مرزا قادیانی بدبخت ایسا ہے کہ جس کی وحی کی زبانیں کم از کم سات ہیں۔ اس کا معنی کہ اس کی پھر قومیں بھی سات ہوں گی اور جس بندے کی قوم ایک نہیں بلکہ سات ہوں وہ حلال زادہ نہیں بلکہ حرام زادہ ہوتا ہے۔ اگر قوم ایک ہو تو وحی کی زبان بھی ایک ہوتی ہے اور وحی کی زبانیں کئی ہوں تو پھر قومیں بھی کئی ہوتی ہیں اور حرام زادہ کبھی نبی نہیں ہو سکتا۔

حضور علیہ السلام کا پہلے انبیاء سے سوال:

﴿وَ سۡـَٔلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِـهَةً يُّعۡبَدُوۡنَ ﴿۴۵﴾﴾

اے پیغمبر! آپ پہلے انبیاء علیہم السلام سے پوچھیں کہ ہم نے اپنے علاوہ کسی

131۔ ابراہیم 4:14

اور کو خدا بنایا ہے کہ جس کی عبادت کی جائے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے انبیاء علیہم السلام سے کیسے پوچھیں؟ لیلۃ المعراج میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء علیہم السلام کے امام بنے ہیں اس وقت آپ نے پوچھا، یا انبیاء علیہم السلام سے پوچھنے سے مراد یہ ہے انبیاء علیہم السلام کے جو صحیفے اور کتابیں ہیں اس میں آپ دیکھیں کہ کسی غیر خدا کو کبھی خدا بنایا ہے؟

قومِ فرعون کی سرکشی:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٦﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٤٨﴾﴾

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو دعوت دی کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ جب موسیٰ علیہ السلام یہ دلائل لے کر آئے تو ان لوگوں نے مذاق اڑایا، ہم ان کو اپنی جو بھی نشانی دکھاتے تو وہ پہلی نشانی سے بڑھ کر ہوتی تھی، پھر ہم نے ان کو عذاب دیا تاکہ یہ باز آجائیں... پھر بھی باز نہیں آئے۔

﴿وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٤٩﴾﴾

وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: اے جادوگر! جو آپ کے خدا نے آپ کے ساتھ وعدہ کیا ہے وہ اللہ سے مانگیں! وہ وعدہ یہ ہے کہ اگر ہم باز آجائیں تو عذاب ٹل جائے گا۔ ﴿اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ﴾ اگر آپ نے دعا کی اور عذاب دور ہو گیا تو ہم سیدھی راہ پر آجائیں گے۔

یہ جوان لوگوں نے ﴿یَاَیُّہَ السّٰحِرُ﴾ کہا تھا اس کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بظاہر لگتا ہے کہ انہوں نے قصداً نہیں کہا تھا، بس ان کو عادت پڑی ہوئی تھی اس عادت کی وجہ سے اس کے منہ سے نکلا کیونکہ بندہ ایسے موقع پر ایسا جملہ نہیں کہتا، وہ تو عذاب ٹلنے کی دعا کرا رہے تھے ﴿ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ﴾ کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ جو اللہ کا آپ کے ساتھ وعدہ ہے کہ ہم باز آجائیں گے تو عذاب ٹل جائے گا، ہم باز آتے ہیں آپ اللہ سے عذاب ٹلوادیں۔ تو ایسے موقع پر تو بندہ ایسا لفظ استعمال نہیں کرتا لیکن بسا اوقات بعض لفظ زبان پر چل رہے ہوتے ہیں تو وہ خود بخود نکل جاتے ہیں، مقصد انہیں ادا کرنا نہیں ہوتا۔

﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿٥٠﴾﴾

جب ہم ان سے عذاب کو دور کر دیتے تو وہ اپنا کیا ہوا وعدہ توڑ ڈالتے۔

فرعون نے اپنی قوم سے کہا کہ دیکھو! میں بادشاہ ہوں، میرے محل کے نیچے سے نہریں نکلتی ہیں، تم دیکھتے نہیں ہو! میں بہتر ہوں یا یہ بندہ بہتر ہے جس کی معاشرے میں کوئی عزت بھی نہیں ہے، ﴿وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ﴾ اور قوتِ بیان اس میں نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فصیح اللسان تھے تو پھر اس نے یہ کیوں کہا؟... یا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جو پرانی بچپن کی باتیں تھیں فرعون نے انہی کو دہرایا... یا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ مجھے متاثر کر سکے۔ یہ بات فرعون نے ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے کہی تھی۔

﴿فَلَوْ لَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿٥٣﴾﴾

فرعون کہتا ہے کہ جب بادشاہ کسی سے خوش ہوتا ہے تو اس کو کنگن پہناتا ہے، اگر اس کا خدا اس سے خوش ہے تو اس کو تو کوئی کنگن نہیں پہنائے! خدا اس سے کیسے راضی ہے؟ اور اگر یہ خدا کا نمائندہ ہے تو بادشاہ کے نمائندے کے ساتھ فوج ہوتی ہے، یہ کیسا نمائندہ ہے کہ اس کے ساتھ ملائکہ کی فوج ہمیں نظر نہیں آتی! فرعون یہ ساری باتیں اپنی قوم کو دھوکہ دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔

﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٥٤﴾﴾

فرعون نے اپنی قوم کو بے وقوف بنایا اور قوم نے اس کی بات کو مان لیا۔

﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٥﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿٥٦﴾﴾

﴿فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا﴾ ”جب انہوں نے ہمیں مایوس کر دیا“ اللہ رب العزت مایوس نہیں ہوتے کیونکہ اللہ صفتِ انفعال سے پاک ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول ایسا ہو گیا کہ چھوٹا ایسی حرکتیں کرے کہ جس سے بڑا مایوس ہو جائے، جب ایسا ماحول پیدا ہو گیا، تو پھر ہم نے ان سے انتقام لیا اور ہم نے تمام کو ختم کر دیا۔ اب یہ پہلے اور بعد والوں کے لیے عبرت کا نشان بن گئے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اور قوم کا شور شرابا:

﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿٥٧﴾﴾

جب حضرت عیسیٰ بن مریم کی مثال دی گئی تو آپ کی قوم کے لوگ شور کرنے لگے۔

حدیث مبارک میں ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ لَا خَيْرَ مَعَ أَحَدٍ يُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ.[132]

کہ اللہ کے علاوہ جس کی پوجا ہوتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔

اس پر مشرکین نے کہا کہ عیسائی تو عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں تو کیا عیسیٰ علیہ السلام میں بھی خیر نہیں ہے حالانکہ مسلمان خود مانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی اور نیک بندے تھے۔ تو ان کے اس اعتراض پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب قرآن کریم کی آیت اتری

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾[133]

کہ تم لوگ اور جس کی پوجا تم کرتے ہو، سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔

تو ایک شخص تھا عبد اللہ بن الزِّبعری جو اس وقت کافر تھا، اس نے کہا کہ میرے پاس اس آیت کا جواب ہے، وہ یہ کہ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں، یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں تو کیا وہ بھی جہنم میں جائیں گے؟ اس پر مشرکین بہت خوش ہوئے۔ اس وقت قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾[134] کہ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی لکھی جا چکی ہے وہ اس جہنم سے دور ہوں گے، اور سورۃ الزخرف کی یہ آیت بھی نازل ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ...

نمبر1: وہ پتھر جن کی تم پوجا کرتے ہو یہ جہنم کا ایندھن ہیں، وہ بے جان مورتیاں جن کی تم عبادت کرتے ہو یہ جہنم کا ایندھن ہیں، ان میں کوئی خیر نہیں ہے۔

132۔ شرح مشکل الآثار: ج3 ص17 رقم الحدیث 987

133۔ الانبیاء 21:98

134۔ الانبیاء 21:101

نمبر2: وہ لوگ جو اپنی عبادت خود کروائیں ان میں بھی خیر نہیں ہے۔ عیسیٰ السلام نے اپنی عبادت کا کبھی نہیں فرمایا، عزیر علیہ السلام نے کبھی نہیں فرمایا، بلکہ وہ تو کہتے تھے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے خدا نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

تو "لَا خَيْرَ مَعَ أَحَدٍ يُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللهِ" سے مراد وہ پتھر ہیں جن کی پوجا کی جائے یا وہ لوگ جو اپنی عبادت خود کروائیں جیسے فرعون کرواتا تھا، اس لیے اس کا حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر علیہما السلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿وَ قَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿۶۰﴾﴾

وہ کہنے لگے کہ ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ ایک خدا بہتر ہے؟ یہ لوگ سب مثالیں جھگڑے کی ہی دے رہے ہیں کیونکہ یہ ہیں ہی مزاج کے جھگڑالو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ایک بندہ تھا، جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اس کو بہترین نمونہ بنا دیا۔ تم عیسیٰ علیہ السلام کی بات کرتے ہو کہ بغیر باپ کے کیسے پیدا ہوئے؟ ہم اگر چاہیں تو تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیں۔ جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین بن کر رہیں گے۔ لیکن یہ ہم کرتے نہیں ہیں اور نہ ہی ہماری یہ ترتیب ہے۔

سلام متارکت کا معنیٰ:

﴿وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾﴾

﴿وَ قِيْلِهٖ﴾ کی کئی تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر کے مطابق اس میں واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف ہے ﴿السَّاعَةِ﴾ پر۔ معنیٰ یہ ہو گا ﴿وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾

کہ قیامت کا علم بھی اللہ کے پاس ہے اور اپنے پیغمبر کی اس بات کا علم بھی اللہ کے پاس ہے کہ جب پیغمبر نے کہا: ﴿يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ﴾ کہ میرے رب! یہ قوم ایسی ہے مجھ پر ایمان نہیں لاتی۔ اللہ نے فرمایا: ﴿فَاصْفَحْ عَنْهُمْ﴾ ان سے در گزر کریں، ﴿وَ قُلْ سَلٰمٌ﴾ اور ان لوگوں سے کہیں کہ تمہارا راستہ اپنا ہے میرا راستہ اپنا ہے۔

جب آپ کا مد مقابل ضدی ہو اور آپ کی بات نہ مانے تو اس کو "سلام" کہہ دیں۔ اس سلام کا معنی یہ نہیں ہے کہ کافر کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہیں، اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ سورۃ الفرقان میں ہے:

﴿وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾﴾

یہ جو سلام اور سلاما فرمایا یہ ایک محاورہ ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں "او بابا! معاف کر" اب اس کا معنی کیا ہوتا ہے کہ آپ اس سے معافیاں مانگ رہے ہیں؟ نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم تجھ سے بات نہیں کر سکتے۔ یہ کلام عرب کا محاورہ ہے کہ جب کسی سے بات نہ کرنی ہو کہا سلام، سلام، سلام... بس جان چھوڑو ہماری!

یہ سلام محاورہ ہے۔ اگر کوئی بندہ اس سے استدلال کرتا ہے کہ کافر کو سلام کرنا جائز ہے تو ایسا بندہ عربی زبان تو سمجھتا ہے لیکن عربی زبان کے محاورے نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے عربی زبان اور عربی زبان کے محاوروں کا سمجھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الدخان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنۡذِرِیۡنَ ﴿۳﴾﴾

یہ تو آپ کے علم میں ہے کہ اکثر سورتوں کے جو نام ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس سورت میں کوئی خاص واقعہ ہوتا ہے اور اس واقعہ کی وجہ سے اس سورت کا نام ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں "تَسۡمِیَۃُ الۡکُلِّ بِاِسۡمِ الۡجُزۡءِ" اس سورت میں بھی چونکہ "دخان" یعنی دھوئیں کا ذکر ہے اس لیے اسے سورت دخان کہتے ہیں۔

حٰمٓ پر پہلے بات ہو چکی ہے کہ یہ سات سورتیں وہ ہیں جو حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں، جنہیں حوامیم کہتے ہیں۔ فرمایا: قسم ہے اس کتاب کی جو بڑی واضح ہے، قرآن کریم کو ہم نے برکت والی رات میں نازل فرمایا ہے کیونکہ ہم لوگوں کو ڈرانے والے ہیں۔

نزولِ قرآن دو مرتبہ ہوا ہے:

یہ بات سمجھیں کہ یہاں نازل ہونے سے مراد کیا ہے؟ کیونکہ قرآن کریم کا نزول دو مرتبہ ہوا ہے:

- ایک مرتبہ لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر ہوا ہے۔
- اور ایک مرتبہ آسمان دنیا سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب

مبارک پر ہوا ہے ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ "﴾ [135]۔

لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر جو قرآن کریم نازل ہوا ہے وہ صرف لیلۃ القدر کی ایک رات میں ہوا ہے جس کا ذکر ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ [136] میں ہے۔ پھر آسمانِ دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس سال کے عرصے میں نازل ہوا ہے۔

اس لیے عام طور پر جب لفظ "اَنْزَلْنَا" ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اور جب لفظ "نَزَّلْنَا" ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ آسمان دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر کیونکہ اَنْزَلَ يُنْزِلُ اِنْزَالًا باب افعال کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں نزول دفعۃً واحدۃً ہو یعنی ایک ہی دفعہ ہو اور نَزَّلَ يُنَزِّلُ تَنْزِيْلًا باب تفعیل کا استعمال وہاں ہوتا ہے جہاں نزول تدریجاً ہو یعنی تھوڑا تھوڑا ہو۔ تو لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نزول ایک دفعہ ہے اس لیے لفظ "اَنْزَلْنَا" ہے اور آسمان دنیا سے قلب اطہر پر چونکہ تیئیس سال میں نازل ہوا ہے اس لیے وہاں "نَزَّلْنَا" ہے۔

باقی جو کتب سماویہ ہیں تورات، زبور، انجیل اور صحیفے ان کے لیے عموماً لفظ "اَنْزَلْنَا" استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی ہیں۔

قرآن ہی محفوظ کتاب ہے:

سورۃ الحجر میں ہے "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹" ہم کہتے

135۔ البقرۃ 97:2

136۔ القدر 1:97

ہیں کہ اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔ اس کی دلیل یہی آیت ہے۔

اس پر اعتراض ہے کہ یہاں پر "اَلْقُرْاٰنَ" نہیں ہے بلکہ "الذِّكْرَ" ہے اور جس طرح "الذِّكْرَ" قرآن کو کہتے ہیں اسی طرح تورات، زبور، انجیل کو بھی کہتے ہیں۔

اس کا جواب ہم یہی دیتے ہیں کہ تورات، زبور اور انجیل کو ایک دفعہ اکٹھا نازل کیا گیا اور قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا اور جس کتاب کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہو وہاں "نَزَّلْنَا" آتا ہے اور جس کو ایک ہی بار نازل کیا ہو وہاں "اَنْزَلْنَا" آتا ہے اور یہاں پر "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ" میں "نَزَّلْنَا" ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الذکر سے مراد عام ذکر نہیں ہے بلکہ خاص ذکر ہے جو کہ قرآن کریم ہے۔

اس پر پھر یہ سوال ہے کہ "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ" میں تو قرآن کریم کے نزول کے لیے لفظ "اَنْزَلْنَا" آیا ہے، "نَزَّلْنَا" تو نہیں آیا۔

اس کا ہم جواب یہ دیتے ہیں کہ قرآن کریم کا نزول دو مرتبہ ہے۔ ایک مرتبہ لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر نزول ہوا جس کا ذکر "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ" میں ہے اور ایک ہے آسمانِ دنیا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر "فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ" اور یہاں پر لفظ "نَزَّلْنَا" ہے۔ تو چونکہ نزول دو مرتبہ ہے اس لیے لفظ بھی دو قسم کا آیا ہے۔

کثرت اور برکت میں فرق:

یہاں فرمایا لیلۃ مبارکۃ کہ یہ رات برکت والی ہے۔

میں کئی بار یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ ایک ہے لفظ کثرت، ایک ہے لفظ

برکت، چیز تھوڑی ہو اور فائدہ زیادہ ہو یہ برکت ہے اور چیز زیادہ ہو لیکن فائدہ کم ہو تو یہ کثرت ہے۔ یہاں قرآن کریم میں لیلۃ مبارکۃ فرمایا کہ یہ رات ایسی ہے جو کمیت اور مقدار میں عام راتوں کی طرح ہے لیکن کیفیت اور معیار میں عام راتوں سے بڑھ کر ہے کہ یہ رات برکت والی ہے۔

استقبالِ رمضان (حدیث سلیمان فارسی)

اس پر میں ایک حدیث مبارک آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں فضائل رمضان سے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰخِرَ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ: أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ...

یہ جو لمبی حدیث ہے امام ابن خزیمہ نے اپنی کتاب صحیح ابن خزیمہ [137] میں اس کو نقل کیا ہے اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ نے "فضائل اعمال" میں جو ان کا رسالہ ہے فضائل رمضان اس کے شروع میں پہلی حدیث یہی لائے ہیں۔ عام طور پر اس حدیث کی جو شرح بیان کی جاتی ہے وہ آپ نے پڑھی ہے یا سنی ہے لیکن اس حدیث مبارک کی شرح جو میں کرتا ہوں ذرا وہ سنیں! میں کہتا ہوں کہ اس حدیث مبارک میں دو چیزیں ہیں؛ ایک ہے اجمال اور ایک ہے تفصیل۔ "يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ" یہ گویا اجمال اور متن ہے اور آگے اس کی تفصیل اور شرح ہے۔ اس کو آپ اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہاں لفظ "اَظَلَّ" فرمایا، لفظ "اَتٰی" یا "جَاءَ" نہیں فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ "اَتٰی" اور "جَاءَ" کا معنی ہے آنا اور "اَظَلَّ" کا معنی ہے چھا جانا۔ جیسے بعض آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور بعض

137۔ صحیح ابن خزیمہ: ج2 ص911 باب فضائل شہر رمضان

آتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔

تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے لفظ فرمایا "قَدْ أَظَلَّكُمْ" دیکھو! لفظ کتنا پیارا استعمال کیا، رمضان آتا ہے اور چھا جاتا ہے اور پوری دنیا میں رمضان آتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ رمضان آیا ہے، اس کے علاوہ کوئی ایسا مہینا نہیں ہے کہ جو اس طرح چھا جائے جیسے رمضان چھا جاتا ہے۔۔

آپ کے ذہن میں آئے گا ربیع الاول، ربیع الاول آتا ہے لیکن اس کے چند دن ہوتے ہیں، پورا مہینا ربیع الاول میں بہاریں نظر نہیں آتیں، رمضان میں پورا مہینا بلکہ جب رمضان ختم ہو رہا ہوتا ہے تو بہاریں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔

آپ کہیں گے محرم، محرم بھی دیکھ لیں تو محرم میں بازار سجتے ہیں لیکن مساجد کی آبادی محرم میں نہیں بڑھتی، ربیع الاول میں مساجد کی آبادی نہیں بڑھتی، رمضان ایسا ہے کہ جس میں مساجد کی آبادی بڑھ جاتی ہے اور شروع سے لے کر آخر تک، آخر میں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس لیے فرمایا کہ رمضان مبارک صرف آ گیا نہیں بلکہ چھا گیا ہے۔ اب دیکھو "اَظَلَّ" رمضان آیا نہیں ہے ابھی آنا ہے تو پھر یوں فرمانا چاہیے تھا "يُظِلُّ" پھر "اَظَلَّ" کیوں فرمایا؟ اصل میں لفظ ماضی تحقق کے لیے ہوتا ہے یعنی جس چیز نے مستقبل میں یقیناً ہونا ہو اس کو لفظ ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ جس طرح قرآن کریم سورۃ شمس میں ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹﴾

اب یہاں "قَدْ يُفْلِحُ" ہونا چاہیے تھا لیکن فرمایا "قَدْ اَفْلَحَ" اس لیے کہ تزکیہ کے بعد فلاح اتنی یقینی ہے کہ اس کو ماضی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

"شَهْرٌ عَظِيمٌ" صرف عظمت نہیں بتائی بلکہ فرمایا: "شَهْرٌ مُبَارَكٌ" کہ یہ

برکت والا بھی ہے۔ برکت کا معنی ہوتا ہے کہ چیز تھوڑی ہو اور فائدہ زیادہ ہو۔ یہ متن ہے۔ آگے ساری حدیث اس کی شرح ہے:

”فِيهِ لَيۡلَةٌ خَيۡرٌ مِنۡ أَلۡفِ شَهۡرٍ“ اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ باقی مہینوں میں ایسی رات نہیں ہے، یہ صرف رمضان ہی میں ہے۔

”جَعَلَ اللهُ صِيَامَهُ فَرِيۡضَةً وَ قِيَامَ لَيۡلِهِ تَطَوُّعًا“ یہ مہینا ایسا ہے کہ جس میں اللہ نے روزے کو فرض فرمایا اور اس کی رات کو نفل۔ باقی پورے سال میں کوئی ایسا مہینا نہیں ہے کہ جس میں پورے دن روزہ فرض ہو اور رات تراویح کی طرح نماز ضروری ہو، ایسا کوئی مہینا نہیں ہے۔

”مَنۡ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصۡلَةٍ مِنَ الۡخَيۡرِ كَانَ كَمَنۡ أَدّٰى فَرِيۡضَةً فِيمَا سِوَاهُ وَمَنۡ أَدّٰى فِيۡهِ فَرِيۡضَةً كَانَ كَمَنۡ أَدّٰى سَبۡعِيۡنَ فَرِيۡضَةً فِيمَا سِوَاهُ“ اگر کوئی شخص اس مہینے میں نیک عمل کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرے تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے غیر رمضان میں فرض کو ادا کیا ہو اور جس نے اس میں ایک فرض ادا کیا ہو تو ایسے ہے جس طرح اس نے ستر فرضوں کو غیر رمضان میں ادا کیا ہو۔

نفل کا فرض کے برابر ہونا اور فرض کا ستر فرائض کے برابر ہونا... اب فرض کا ستر فرائض کے برابر ہونا یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ برکت ہے اور نفل کا فرض کے برابر ہونا یہ سمجھ نہیں آتا، یہ سمجھ تب آئے گا کہ پہلے یہ پتا چلے کہ فرض اور نفل میں فرق کیا ہے؟

اگر کوئی شخص ایک فرض ادا نہ کرے اور اس کے بدلے میں پوری زندگی نوافل پڑھتا رہے تو اس فرض کا تدارک نہیں ہو سکتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ایک فرض ہزاروں نوافل سے افضل ہے اور اس مہینا کا نفل فرض کے برابر ہو گا، تو اب سمجھ آئے

گی کہ اس میں برکت کتنی ہے!

”وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ“ اس مہینے میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔

تو میں آپ کو لفظ برکت سمجھا رہا تھا، کبھی آپ رمضان کے آغاز پر تقریر کریں اور حدیث یہی پڑھیں لیکن سمجھائیں ایسے جیسے میں آپ کو سمجھا رہا ہوں تو پھر بیان کرنے کا بھی لطف آتا ہے اور سننے کا بھی۔

حدیث استقبال رمضان؛ بیس رکعات تراویح کی دلیل:

میں اسی حدیث کو بیس تراویح پر بطورِ دلیل کے پیش کرتا ہوں۔ پتا نہیں آپ نے کبھی سنا ہے یا نہیں، اور بیس رکعات تراویح پر یہ ایسی دلیل ہے جو میں نے کہیں نہیں پڑھی لیکن آپ عوام کو سمجھائیں تو یہ فوراً دماغ میں اترتی ہے۔ آپ یہ سمجھیں کہ بیس رکعات تراویح پر یہ دلیل کیسے بنتی ہے؟

◆ پہلی بات یہ سمجھیں کہ حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے فرائض کا حساب ہو گا، اگر فرائض میں کمی رہ جائے تو نوافل دیکھیں گے اور نفلوں سے فرضوں کی کمی کو پورا فرما دیں گے۔ یہ حدیث ذہن میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

◆ دوسری بات یہ سمجھیں کہ ہم جو روزانہ فرض پڑھتے ہیں ان کی تعداد بیس بنتی ہے؛ فجر کے دو فرض، ظہر کے چار فرض، عصر کے چھ فرض، مغرب کے تین فرض، عشاء کے چار فرض اور تین رکعت وتر۔ یہ کل بیس رکعات ہو گئیں۔ اس پر پہلے لوگوں کو سمجھائیں کہ بھائی جو ہم روزانہ فرائض پڑھتے ہیں ان کی تعداد بیس ہے۔ پھر اس پر خود سوال اٹھائیں کہ آپ کے ذہن میں آئے گا کہ وتر تو واجب ہیں، فرض نہیں ہیں تو پھر فرض بیس کیسے بنے؟ پھر اس کا جواب سمجھائیں کہ اگر ایک شخص کی ایک دن کی پانچ نمازیں قضا ہو جائیں تو جب دوسرے دن قضا پڑھے گا تو وتر پڑھے گا یا نہیں؟

پڑھے گا، اس کا معنی ہے کہ وتر؛ فرض کی طرح ہیں۔ آدمی سفر میں جائے تو سنتیں معاف ہو جاتی ہیں لیکن فرائض معاف نہیں ہوتے۔ کیا وتر بھی معاف ہوتے ہیں؟ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وتر فرض کی طرح ہیں۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کی نمازیں رہ جائیں، آپ اس کا فدیہ ادا کریں تو روزانہ کے حساب سے جو فدیہ ادا کریں گے وہ پانچ نمازوں کا کریں گے یا چھ کا؟ چھ کا، تو وتر کا مستقل فدیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرض کی طرح ہے۔

اب پھر سوال اٹھائیں کہ دیکھو! ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر فرض ہیں جبکہ علماء تو لکھتے ہیں کہ وتر واجب ہیں۔ پھر آپ بات سمجھائیں کہ جو ہم کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہے اور جو علماء کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہے، کیونکہ وتر کی دو حیثیتیں ہیں: ایک ہے اعتقادی اور ایک ہے عملی۔ اعتقاداً وتر واجب ہیں اور عملاً فرض ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں کہ وتر فرض ہیں تو وہ اعتقاداً نہیں بلکہ عملاً فرض ہیں۔ واجب وہ ہوتا ہے کہ جس کا انکار کفر نہیں ہوتا لیکن اس کا ترک فسق ہوتا ہے فرض کی طرح۔

◆ تیسری بات اس حدیث کو دیکھیں کہ رمضان میں جو شخص ایک نفل پڑھے تو وہ فرض کے برابر ہے۔

تو اب ان تین باتوں کو آپ جمع کر لیں:

نمبر 1 ... روزانہ جو ہم فرائض پڑھتے ہیں ان کی تعداد بیس ہے۔

نمبر 2 ... قیامت کے دن فرائض کی کمی پوری ہو گی نوافل سے۔

نمبر 3 ... رمضان کا نفل ثواب میں فرض کے برابر ہے۔

تو روزانہ جو ہم فرائض پڑھتے ہیں ان کی رکعات بیس ہیں۔ اب نوافل سے فرائض کی کمی پوری ہو گی اور ایسا نفل جس سے فرائض کی کمی جلدی پوری ہو وہ نفل ایسا ہونا چاہیے جو فرض کے برابر ہو۔ اب ایسا نفل جو فرض کے برابر ہو وہ رمضان میں

ہوتا ہے غیر رمضان میں نہیں ہوتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ روزانہ کے فرائض میں ہونے والی کمی نوافل سے پوری ہوگی اور بطورِ خاص رمضان کے نوافل سے جو فرض کے برابر ہیں۔ تو جو لوگ روزانہ آٹھ فرائض پڑھتے ہیں تو وہ رمضان میں اضافی نوافل بھی آٹھ پڑھیں اور ہم چونکہ روزانہ بیس رکعات فرائض پڑھتے ہیں تو رمضان میں اضافی نوافل بھی بیس پڑھتے ہیں۔

اب دیکھو! عوام کو بات سمجھ آرہی ہے کہ نہیں؟ (آرہی ہے۔ سامعین)
اس لیے میں پھر کہتا ہوں کہ ہماری بیس رکعات عقل کے بھی موافق ہیں اور نقل کے بھی موافق ہیں۔ نقل یعنی حدیث کے موافق۔ نصوص کا تقاضا بھی ہے کہ بیس ہونی چاہییں اور عقل کا تقاضا بھی ہے کہ بیس ہونی چاہییں۔ تو جو آٹھ کے قائل ہیں وہ نقل کے بھی دشمن ہیں اور عقل کے بھی دشمن ہیں۔

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ آپ پوری دنیا میں دیکھ لیں ... وہ ہیں ہی ایسے کہ ان میں عقل نہیں ہے، پھر عقل نہ ہونے پر عوام کو دو چار لطیفے سنا دیں تو خود ہی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

مجھ سے ایک بندہ پوچھتا ہے کہ غیر مقلد اپنے سر پر ٹوپی کیوں نہیں رکھتا؟ میں نے کہا کہ ٹوپی یا پگڑی سر پر وہی رکھتا ہے کہ جس کے پاس عقل ہو اور وہ ٹوپی پہن کر اس کی حفاظت کرتا ہے، جب عقل ہی نہ ہو تو پھر ٹوپی کی کیا ضرورت ہے؟ جب آدمی کے پاس پیسے ہوں تو جیب میں بٹوا بھی رکھے گا، جب پیسے نہ ہوں تو وہ بٹوے کو کیا کرے گا؟! عقل اور دماغ نہ ہو تو ٹوپی اور پگڑی کو کیا کرنا ہے؟ جب عقل ہے ہی نہیں تو اس کو سنبھالنا کیا ہے؟ اس لیے ان کو ٹوپی اور پگڑی کے بغیر رہنا چاہیے، یہ ٹوپی اور پگڑی پہنیں گے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہاں پر آپ ایک آدھ لطیفہ سنا دیں تو لوگ ہنستے ہنستے آپ کے دلائل سنیں گے۔

میں نے تو بہت مختصر وقت میں بیان کیا ہے۔ آپ اس کو تھوڑا سا کھولیں گے تو آدھا پونا گھنٹا لگے گا اور بیس رکعات تراویح پر بہترین دلائل آپ کے سامنے آجائیں گے۔

لیلہ مبارکہ سے مراد کیا ہے؟

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ ۝۳﴾

قرآن کریم کو ہم نے برکت والی رات میں نازل فرمایا ہے کیونکہ ہم لوگوں کو ڈرانے والے ہیں۔

لیلہ مبارکہ؛ برکت والی رات سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ صراحت کے ساتھ قرآن کا لیلۃ القدر میں نازل ہونا منقول ہے: ﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾ تو اس سے لیلہ مبارکہ کی تعین ہو رہی ہے۔

"دخان" سے کیا مراد ہے؟

﴿فَارۡتَقِبۡ يَوۡمَ تَاۡتِى السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيۡنٍ ۝۱۰﴾

اے پیغمبر! اس دن کا انتظار کریں جس دن آسمان سے ایک کھلا دھواں آئے گا۔

دخان مبین سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں پہلا قول یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے۔ آپ نے قریش کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کی تو مکہ پر سخت قحط پڑا اور قحط اتنا شدید تھا کہ لوگ ہڈیاں اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے۔ لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تو بھوک کی وجہ سے انہیں دھواں نظر آتا تھا۔ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اگر

آپ دعا کریں اور قحط ختم ہو جائے تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو قحط ختم ہو گیا لیکن وہ ایمان پھر بھی نہیں لائے۔

اب اس قحط کو "دخان" یعنی دھوئیں سے تعبیر کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی کو سخت بھوک اور پیاس لگی ہو تو آنکھیں دھندلا جاتی ہیں، اسے ہر طرف دھواں نظر آتا ہے۔ اس لیے اس کو دخان سے تعبیر کیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ایک خاص نشانی ہے کہ قربِ قیامت میں دھواں نمودار ہو گا جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا۔

دخان مبین کے دونوں معنی ٹھیک ہیں، ان میں کوئی منافات نہیں۔ مکہ مکرمہ میں جو قحط آیا تھا وہ مراد لیں تو بھی ٹھیک ہے اور جو قربِ قیامت میں دھواں نمودار ہو گا وہ بھی ٹھیک ہے۔

﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿١٦﴾﴾

اور جس دن جب ہم ان کو سخت گرفت میں لیں گے تو ان سے انتقام لیں گے۔

اس سے مراد بدر کے دن کا عذاب ہے جب بدر میں کفار گرفت میں آئے تھے۔ اس کا ایک معنی یہ بھی ہے اور ایک معنی یہ ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔

فرعون کی پکڑ:

﴿وَ لَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿١٧﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٨﴾ وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٩﴾﴾

اور ہم نے اس سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمایا تھا، ان کے پاس ہمارے ایک معزز رسول آئے تھے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام، انہوں نے فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل کو میرے حوالے کر دو، میں امانت دار نبی ہوں۔ یعنی میں خیانت کی بات نہیں کروں گا۔ یہ حکم تو دیا اور ایک حکم یہ بھی دیا کہ اللہ کے سامنے سرکشی مت دکھاؤ، میں تمہارے پاس واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔

اللہ رب العزت نے یہاں فرعونیوں کے بارے میں بتایا کہ دیکھو! یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آئے ہیں تو تباہ و برباد ہو گئے۔ اللہ نے انہیں کتنی نعمتیں دی تھیں!

﴿كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿٢٥﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿٢٦﴾ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿٢٧﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿٢٨﴾﴾

ان لوگوں نے کتنے باغات اور چشمے چھوڑے، کئی کھیت چھوڑے اور کئی رہنے کی اچھی اچھی جگہیں چھوڑیں، عیش و عشرت کی جس زندگی میں وہ جی رہے تھے انہوں نے وہ بھی چھوڑی۔ ان سب چیزوں کا وارث ہم نے ایک اور قوم کو بنا دیا۔

نہ آسمان رویا نہ زمین روئی کا مطلب:

﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿٢٩﴾﴾

قرآن کریم اکثر محاورات استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک محاورہ ہے کہ ان پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین روئی اور نہ ان کو کوئی مہلت دی گئی۔

اس کا معنی یہ تھا کہ ان کے جانے سے کچھ فرق نہیں پڑا۔ یہ محاورہ ہے کہ فلاں کے جانے پر آسمان بھی رو رہا تھا یعنی اس کے جانے سے فرق پڑا ہے، لیکن یہ فرعونی تو خس و خاشاک کی طرح تھے، ان کے جانے سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ واقعتاً ایسا

ہے کہ مسلمان کا نیک عمل اوپر جاتا ہے، تو جب نیک عمل اوپر جانا بند ہو تو آسمان روتا ہے، جس جگہ انسان نیک عمل کرتا ہے تو جب وہاں عبادت بند ہو جائے تو پھر زمین روتی ہے۔ ان فرعونیوں کے جانے پر نہ آسمان رویا نہ زمین روئی، کیونکہ ان کے نہ نیک اعمال زمین پر تھے کہ ان کے مرنے پر زمین روتی، نہ ان کے نیک اعمال آسمان پر جاتے تھے کہ ان کے مرنے پر آسمان روتا۔ اللہ ہم سب کو ایسی زندگی عطا فرمائیں کہ آدمی کے جانے پر آسمان بھی روئے اور زمین بھی روئے۔

جب انسان دنیا میں آتا ہے تو روتا ہے اور دوسرے اس کی آمد پر ہنس رہے ہوتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں اور جب انسان دنیا سے جائے تو یہ ہنسے اور دوسرے روئیں۔ یہ ہے زندگی! اگر خدانخواستہ ایسا ہو کہ جب آیا تب بھی رو رہا تھا اور جب گیا تب بھی رو رہا تھا تو یہ بڑی ناکامی کی زندگی ہے۔ آنے پر یہ روئے اور جانے پر ہنسے تو یہ کامیابی کی زندگی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ کسی کو جاتے ہوئے روتا ہوا دیکھ لیں تو کہیں کہ یہ تو غلط تھا! ایسا نہیں ہے بلکہ یہ جو رو رہا ہے تو یہ اللہ کے خوف کی وجہ سے رو رہا ہے کہ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہو گا؟! لیکن مؤمن کے لیے موت تحفہ ہے، مومن جیسا کیسا بھی ہو گا بہر حال وہ موت سے کسی درجے میں محبت ضرور کرے گا، وہ سمجھتا ہے کہ میں نے مرنا ہے تو مجھے نعمتیں ملنی ہیں، جتنا بھی کمزور مؤمن ہو گا اس کو بہر حال موت سے ایک گونہ محبت ضرور ہوتی ہے، اس کو موت سے بالکل نفرت ہو ایسا نہیں ہوتا۔

﴿وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ہم نے فرعونیوں کو ایسی نشانیاں دیں جن

میں ان کے لیے واضح انعام تھا، یہ پھر بھی بات نہیں مانتے تھے، کہتے تھے کہ بس ہم نے ایک ہی بار مرنا ہے، اس کے بعد دوبارہ ہم تھوڑا ہی اٹھیں گے۔ یہ لوگ پیغمبر سے کہتے: اگر تم سچے ہو کہ دوبارہ اٹھنا ہے تو ہمارے باپ دادا جو مر گئے ہیں ان کو اٹھاؤ!

تبع اور اس کی قوم کا تذکرہ:

﴿اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں ان سے پوچھو کہ کیا اسباب اور طاقت میں تم بڑھ کر ہو یا قومِ تبع تم سے بڑھ کر تھی؟!

"تبع" شاہِ یمن کو کہتے ہیں۔ جس طرح شاہِ مصر کو فرعون کہتے ہیں، شاہِ روم کو قیصر کہتے ہیں، شاہِ ایران کو کسریٰ کہتے ہیں، شاہِ حبشہ کو نجاشی کہتے ہیں اسی طرح شاہِ یمن کو تبع کہتے ہیں۔ تبع ان کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ تو ان بادشاہوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ تمہارے پاس طاقت اور قوت زیادہ ہے یا تبع کے پاس زیادہ تھی؟

تُبَّع کا واقعہ:

یہاں "تبع" سے مراد خاص تبع بادشاہ ہے یا مطلق شاہِ یمن مراد ہے؟ جس طرح فرعون؛ شاہِ مصر کو کہتے ہیں لیکن جب ہم فرعون کہتے ہیں تو اس سے خاص فرعون مراد ہوتا ہے عام نہیں، اس طرح ہم کسریٰ کہتے ہیں تو عام کسریٰ مراد نہیں ہوتا بلکہ وہ مراد ہوتا ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خط لکھا تھا اور اس بدبخت نے خط پھاڑ دیا تھا العیاذ باللہ، جب ہم نجاشی کہتے ہیں تو ہماری مراد وہ خاص نجاشی ہے جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت؛ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام کیا تھا۔

شاہِ حبشہ؛ حضرت نجاشی

یقین کریں بندہ جب ایسے خوش بخت لوگوں کو دیکھتا ہے تو برداشت نہیں کر سکتا، بس خوشی سے رونا آجاتا ہے۔ دیکھیں! کتنی بڑی سعادت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت ان کے پاس گئی ہے تو انہوں نے ان کا اکرام کیا ہے، اس اکرام کا صلہ اللہ نے ایمان کی دولت کی صورت میں دیا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا قریش کی خاتون ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت کی دوسرے ملک حبشہ میں اور شوہر نے ساتھ چھوڑ دیا، اب یہ کتنا بڑا دکھ ہے تو اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغامِ نکاح بھیج دیا، اب بتاؤ ان کی خوشی کا کیا عالم ہوگا کہ جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا شوہر مل جائے اور نجاشی نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح پڑھایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حق مہر خود ادا کیا، پھر ساتھ ہدیہ دے کر روانہ کیا ہے۔

یہ تب ہے جب عظمت ذہن میں ہو، یہ باتیں پھر سمجھ میں آتی ہیں کہ کتنی بڑی سعادت ہے! اور پھر جب نجاشی فوت ہوا تو جنازہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تھے تو نکاح نجاشی نے پڑھا اور جب نجاشی کی باری آئی تو جنازہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا۔ ادلا بدلا ہو گیا۔ اس نے خوشی دی ہے تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بدلے میں خوشی عطا فرمائی ہے۔

تُبَّع بادشاہ کی مدینہ منورہ میں آمد:

﴿اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ﴾... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قباء میں قیام فرمایا۔ پھر قباء سے روانہ ہوئے تو مدینہ شہر میں گئے. حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انصارِ مدینہ میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ اللہ کے نبی ہمارے مہمان

بنیں، ہر ایک کا جی چاہتا کہ آپ کی اونٹنی کی مہار کو پکڑ لیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دَعُوهَا فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ" میری اونٹنی کو چھوڑ دو یہ اللہ کے حکم سے چلی ہے، اللہ کے حکم سے رکے گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے سسرال بنی نجار کا قبیلہ مدینہ میں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی خواہش یہ تھی کہ میں اپنے دادا کے سسرال کے ہاں ٹھہروں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں نہیں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انصارِ مدینہ میں سے ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار کرتا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات نہیں بتائی تاکہ کسی کا دل نہ ٹوٹ جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں چھوڑ کر وہاں کیوں گئے؟ تو اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو کس طرح معجزے کے انداز میں پورا کیا کہ آپ کا معجزہ بھی ظاہر ہو گیا اور اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مزید خوشی پیدا ہو گئی، یوں ایک کے پاس جانے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو طبعًا تکلیف نہیں ہوئی۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی رکی۔ اللہ آپ سب کو مدینہ منورہ لے جائے (آمین۔ سامعین) مسجد نبوی میں آپ جب داخل ہوں اور صلوٰۃ وسلام پڑھ کر باہر نکلیں تو مسجد نبوی کے موجودہ نقشہ میں جو دایاں کونہ ہے تقریباً یہی جگہ ہے جہاں پر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان تھا، اونٹنی وہاں رک گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان میں ٹھہر گئے۔ دو منزلہ مکان تھا۔ مدینہ کے مکانات عام طور پر ایک منزلہ تھے اور یہ دو منزلہ تھا۔

تُبَّع کا حضور علیہ السلام کی خدمت میں ہدیہ:

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکان بھی پیش کیا اور آپ کی خدمت میں ایک خط بھی پیش کیا۔ یہ خط اور

یہ مکان کون سا تھا؟ اصل میں تبع یمن کا بادشاہ یہاں سے گزرا، اس کے ساتھ چار سو علماء تورات کے ماہر تھے۔ جب وہ واپس جانے لگا تو ان علماء نے کہا کہ آپ ہمیں اسی جگہ پر چھوڑ دیں۔ تبع نے پوچھا: کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ آخری نبی جو آئے گا یہ زمین اس کی دار الهجرت ہو گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کریں۔ یہ تبع بہت علم دوست آدمی تھا۔ تو اس نے چار سو علما کے لیے مکانات بنائے، ان سب کے وہاں نکاح کروائے، ان کو رہنے کے لیے سامان دیا اور ایک مکان دو منزلہ بنایا۔ اس نے کہا کہ جب وہ آخری نبی آئیں تو یہ مکان میری طرف سے ان کے لیے ہدیہ ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اسی مکان میں رہتے تھے۔ یہ جو دو منزلہ مکان تھا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بنا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان میں آ گئے۔ پھر اس تبع بادشاہ نے کہا تھا کہ ایک خط میری طرف سے ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کر دینا۔ نسل در نسل حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس وہ خط چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے وہ خط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا۔ اس خط میں تبع بادشاہ نے کہا تھا:

تبع کے اشعار:

شَهِدْتُ عَلٰى أَحْمَدَ أَنَّهُ رَسُوْلٌ مِنَ اللهِ بَارِی النَّسَمْ

میں گواہی دیتا ہوں کہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برحق رسول ہیں۔

فَلَو مُدَّ عُمْرِیْ إِلٰى عُمْرِهٖ لَكُنْتُ وَزِيْرًا لَهٗ وَابْنُ عَمْ

اگر مجھے خدا نے موقع دیا اور میری عمر لمبی ہوئی اور میں نے ان کا زمانہ پا لیا تو میں ان کا سپاہی بنوں گا اور ان کے چچا کا بیٹا بنوں گا۔ "ابن عم" اس وقت چچا کے بیٹے کو کہتے تھے کہ جو معاون بنے۔ تو یہ کہہ رہے تھے کہ میں ان کا معاون بنوں گا اور ان کا وزیر بن جاؤں گا۔

وَجَاهَدْتُ بِالسَّيْفِ أَعْدَاءَهُ وَفَرَّجْتُ عَنْ صَدْرِهِ كُلَّ غَمٍ

اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے تلوار سے ایسا ٹکراؤں گا کہ آپ کے دل کو ٹھنڈا کر دوں گا۔

تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے یہ مکان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور یہ والا خط بھی دیا۔

میں یہ باتیں اس لیے بار ہا کہتا ہوں کہ آپ لوگ اپنا ایک ذہن بنائیں، اب قیامت تک کوئی نیا نبی تو آنا نہیں، نبی تو پیدا ہونا نہیں، آپ نبی کے وارث ہیں اور کسی جگہ پر بندے کو صحیح وارث مل جائے تو اپنی زندگی کھپا دو، اپنا سب کچھ لٹا دو، پھر آپ اس کی بہاریں دیکھنا! یہ جو ہمارا ذہن ہوتا ہے نا کہ میں کروں، اس سے بہتر ہوتا ہے کہ انسان کرنے والے پر فدا ہو جائے، پھر ایک وقت آئے گا کہ آپ بھی کریں گے!

یہ جلد بازی انسان کو بہت خراب کرتی ہے۔ میں اکثر ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ آپ آئے اور چلے گئے، اس طرح کام نہیں ہوتا، آپ متخصصین ہیں، آپ میں سے ایسے بندے تیار ہو جائیں جو دس سال یہاں پڑے رہیں، اور میں کہتا ہوں کہ دس سال لگاؤ، اور کچھ بھی نہ کرو، صرف مطالعہ کرو اور ذکر کرو... مطالعہ کرو اور ذکر کرو... اور خدمت کرو، پھر اپنے علاقوں میں جا کر کام کرو، یہ کام صدیوں میں ختم نہیں ہو گا۔ یہ جو دھیما دھیما کام ہوتا ہے تقویٰ کے ساتھ اس کی مدت بہت لمبی ہوتی ہے اور جو کام بغیر تقویٰ کے تیز رفتاری سے ہوتا ہے وہ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔

جہنمیوں کا کھانا؛ زقوم

﴿إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْأَثِيمِ ﴿٤٤﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿٤٥﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ﴿٤٦﴾﴾

یہاں پہلے اللہ تعالیٰ نے اہلِ جہنم کا تذکرہ کیا۔ فرمایا: زقوم کا درخت نافرمانوں

کا کھانا ہو گا، اس کی شکل ہو گی تلچھٹ جیسی، جیسے تیل ہو تا ہے جو گاڑیوں میں استعمال ہو کر پھر پرانا ہو جاتا ہے، استعمال شدہ تیل۔ اس کو کھائیں گے تو آدمی کے پیٹ میں ہنڈیا کی طرح ابال شروع ہو جائے گا، یہ درخت شکل سے بھی بے کار ہو گا اور ذائقہ کے اعتبار سے بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔

﴿خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿٤٨﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿٤٩﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿٥٠﴾﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کو پکڑ کے جہنم کے درمیان میں لے جاؤ، پھر ان کے سروں پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ڈال دو، اس سے کہا جائے گا کہ چکھو اس کو! تم خود کو بڑا معزز سمجھتے تھے۔ اسی چیز میں تم شک کیا کرتے تھے۔

متقین کو ملنے والے انعامات:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿٥١﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۚ ﴿٥٢﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۚ ﴿٥٣﴾ كَذٰلِكَ ۟ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٥٤﴾﴾

یہاں سے متقین کا ذکر فرمارہے ہیں۔ فرمایا: متقین ایسی جگہ پر ہوں گے جو امن والی ہو گی، باغات میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے۔ باریک ریشم بھی پہنیں گے اور موٹی ریشم بھی پہنیں گے، آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ خوب صورت آنکھوں والی حوروں سے ہم ان کی شادیاں کرائیں گے۔

﴿يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَ وَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿٥٦﴾﴾

ہر قسم کے پھل منگوا کر کھائیں گے اور امن کے ساتھ رہیں گے۔ بس جو موت دنیا میں آنی تھی وہ آگئی اب یہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہوں گے، اللہ انہیں جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھیں گے۔

﴿فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۵۷﴾

یہ اللہ کا خاص کرم ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

واقعی یہ اللہ کا فضل ہے ورنہ ہمارے اعمال اس قابل نہیں ہیں کہ اس پر یہ نعمتیں ملیں، یہ خدا ہی کا احسان ہے۔

انسانی ضروریاتِ زندگی:

اب دیکھو درمیان میں جتنی باتیں ہیں یہ ساری آدمی کی ضرورتیں ہوتی ہیں:

[1]: مکان بندے کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ﴾ کہ ہم ان کو گھر بھی دیں گے۔

[2]: آدمی کی ضرورت ہے لباس، فرمایا: ﴿يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ﴾ کہ لباس ہم ریشم کا دیں گے۔

[3]: آدمی کی ضرورت ہوتی ہے نکاح، فرمایا: ﴿وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ﴾ ہم وہ بھی ان کو دیں گے۔

[4]: آدمی کی ضرورت ہوتی خوراک، فرمایا: ﴿بِكُلِّ فَاكِهَةٍ﴾ کہ ہم یہ بھی دیں گے۔

رہائش، لباس، خوراک اور نکاح یہ بنیادی ضرورتیں ہیں اللہ یہ بھی دیں گے اور ان کے ساتھ مزید دو چیزیں اہم ہوتی ہیں:

[5]: کہ چیزیں ملیں اور امن کے ساتھ ملیں، فرمایا: ﴿اٰمِنِيْنَ﴾ کہ امن کے

ساتھ ملیں گی۔

[6]: چیزیں ملیں اور پھر آدمی سے نا چھوٹیں، فرمایا: ﴿لَا يَذُوۡقُوۡنَ فِيۡهَا الۡمَوۡتَ اِلَّا الۡمَوۡتَةَ الۡاُوۡلٰى﴾ کہ ہم یہ بھی دیں گے۔

نعمتوں کا استحضار کیجیے!

اب دیکھیں! مکان بھی دیں گے، بیوی بھی دیں گے، لباس بھی دیں گے، کھانا پینا بھی دیں گے، امن بھی دیں گے اور ہمیشہ کے لیے دیں گے، کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ اللہ ہمیں اس کا استحضار عطا فرما دیں۔ بس تھوڑی سی مدت ہے اور یہ تھوڑی سی مدت عمل کی ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں آپ کو اپنے دل کی بات نہیں سمجھا سکتا۔ میں تو اپنی بات کہتا ہوں - آپ تو بڑے ہیں آپ کی بات نہیں کرتا - سچی بات ہے میں تو کبھی رو پڑتا ہوں جب خلوت میں بات آتی ہے کہ اگر اللہ ہمیں کسی کافر کے گھر پیدا کرتے تو کیا ہوتا! بتاؤ ایمان میں ہمارا کیا دخل ہے؟ کس قدر خدا نے کرم کیا ہے کہ ایمان کی دولت دی... کسی جاہل کے گھر پیدا کرتے اور جاہل بنا دیتے تو کیا ہوتا! خدا کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ اللہ نے علم کے لیے منتخب کیا ہے۔ ہم لوگ جیسے کیسے بھی ہیں علم ہی پڑھتے ہیں، قرآن و حدیث ہی پڑھتے ہیں، علومِ نبوت ہی پڑھتے ہیں، کہیں دائیں بائیں تو ہم نہیں جاتے... یہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اللہ ہمیں ان چیزوں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔

قرآن آسان ہے نصیحت کے لیے:

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ۝۵۸﴾

ہم نے قرآن کریم کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات کی وجہ سے بعض لوگ دھوکہ دیتے ہیں۔ دھوکہ کیا دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ﴾[138] کہ ہم نے قرآن کو آسان بنادیا ہے، ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ﴾ ہم نے قرآن کو آپ کی زبان پر آسان بنایا ہے... تو قرآن آسان ہے اور مولوی لوگ کہتے ہیں کہ قرآن بہت مشکل ہے، خود نہ پڑھنا، خود مطالعہ نہ کرنا بلکہ کسی عالم سے پڑھنا، دیکھو! قرآن کہتا ہے کہ بہت آسان ہے اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ بہت مشکل ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ سمجھیں کہ قرآن کریم جو کہتا ہے وہ بھی ٹھیک ہے اور جو ہم کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہے۔ یہاں دو چیزیں ہیں؛ ایک یہ کہ قرآن کریم ہے تو بہت آسان لیکن اس آدمی کے لیے جس نے سیکھا ہو، اگر نہ سیکھا ہو تو پھر بہت مشکل ہے۔ آدمی چلانا جانتا ہو تو جہاز چلانا بھی بہت آسان ہے اور نہ جانتا ہو تو سائیکل چلانا بھی بہت مشکل ہے، اب کوئی بندہ کہے کہ جہاز چلانا بہت آسان ہے، دوسرا کہتا ہے کہ بہت مشکل ہے تو دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں کیونکہ جو کہہ رہا ہے کہ آسان ہے تو اس کے لیے آسان ہے جس نے سیکھا ہو اور جو کہہ رہا ہے کہ مشکل ہے تو اس کے لیے جس نے نہ سیکھا ہو۔ تو قران کریم بہت آسان ہے اس کا معنی ہے کہ جس نے سیکھا ہو اور بہت مشکل ہے اس کے لیے جس نے نہ سیکھا ہو۔

اور دوسرا اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے قرآن کریم کا بطورِ وعظ و نصیحت ہونا اور ایک ہے قرآن کریم کا علمی مضامین کا حامل ہونا۔ پورے قرآن میں یہ نہیں ہے کہ قرآن پاک کے مضامین بہت آسان ہیں، جہاں بھی ﴿يَسَّرْنَا﴾ کا لفظ آیا ہے تو وہاں لفظ ہے ﴿لِلذِّكْرِ﴾ یعنی بطور وعظ و نصیحت کے قرآن بہت آسان ہے یعنی اتنا

138۔ القمر 17:54

آسان ہے کہ اگر سامع توجہ اور ادب کے ساتھ قرآن کریم سنے اور اس کا معنی بھی سمجھ نہ آئے تب بھی قرآن اثر شروع کر دیتا ہے لیکن یہ ہے وعظ ونصیحت، اور ایک ہیں قرآن کے علمی مضامین تو بطور علمی مضامین کے قرآن کریم آسان نہیں اور بطور وعظ ونصیحت کے بہت آسان ہے۔

اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ الجاثیۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِی
السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ﴿۳﴾﴾

دلائل توحید:

یہاں شروع میں اللہ تعالیٰ نے دلائلِ توحید بیان فرمائے ہیں اور طرز میں تنوع رکھا ہے، الگ الگ طرز اختیار ہے۔ فرمایا: حٰمٓ، یہ کتاب اس اللہ کی جانب سے نازل کردہ ہے جو غالب حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے دلائل ہیں۔

﴿وَ فِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَ مَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾﴾

اور تمہیں پیدا کرنے میں اور جانوروں کے پیدا کرنے میں دلائل ہیں ان کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔

﴿وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ
فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۵﴾﴾

دن اور رات کے آنے جانے میں اور جو رزق خدا نے آسمان سے اتارا اور

اس کے ذریعے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا، اور ہواؤں کے چلنے میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

یہاں یہ سمجھیں کہ تین لفظ الگ الگ لائے ہیں:

﴿لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ .... اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ... اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ طبقات تین ہیں:

پہلا طبقہ: بعض وہ لوگ ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں سب سے زیادہ دلائل تو ان کے لیے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں، یعنی اصل فائدہ ان کو ہے۔

دوسرا طبقہ: جو ایمان تو نہیں لایا لیکن اس کو یقین ہے کہ یہ دلائلِ توحید ہیں، اس کو بھی نفع ہو گا کہ وہ ایمان لے آئے گا۔

تیسرا طبقہ: وہ ایمان بھی نہیں لایا اور یہ دلائل توحید ہیں اس پر یقین بھی نہیں رکھتا لیکن اس کے پاس عقلِ سلیم موجود ہے، ایک وقت آئے گا کہ وہ یقین بھی کرے گا اور ایمان بھی لائے گا۔

اور وہ بندہ جو ایمان بھی نہیں لایا، جس کو یقین بھی نہیں ہے اور جس کے پاس عقلِ سلیم بھی نہیں ہے تو یہ شخص گمراہ ہے۔ آگے اس کا ذکر فرمایا:

﴿فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

کہ اس کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔

قرآن کریم سے فائدہ کب ہو گا؟

تو اس قرآن کریم سے فائدہ کب ہے؟ جب اس پر ایمان لائے یا ایمان تو نہیں لایا لیکن اس کو یقین ہے کہ دلائلِ توحید ہیں، یہ یقین اس کو ایمان پر لے آئے گا، اور اگر ایمان بھی نہیں اور یقین بھی نہیں ہے لیکن عقل سلیم ہے، وہ سمجھتا ہے اور غور

کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا کہ وہ یقین بھی کرے گا اور ایمان بھی لائے گا۔

ایام اللہ کا معنی:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾﴾

فرمایا: ان ایمان والوں سے کہہ دو کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے یعنی قیامت کے دن کو نہیں مانتے۔

یہاں لفظ ہے "اَيَّامَ اللّٰهِ"... ایام کا معنی ہمیشہ دن نہیں ہوتا بلکہ محاورات میں ایام، معاملات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں اس سے وہ معاملات مراد ہیں جو قیامت کے دن اللہ اپنے بندوں سے فرمائیں گے۔ مؤمنین کے ساتھ ایک معاملہ اور کفار کے ساتھ دوسرا معاملہ، مؤمنین کے ساتھ رحمت والا معاملہ اور کفار کے ساتھ عذب والا معاملہ۔

یہاں یہ بات بھی فرمائی جاسکتی تھی کہ ایمان والے ان لوگوں سے درگزر کریں جو ایمان نہیں لائے، لیکن اس طرز کے بجائے یہ طرز اختیار کیا کہ ایمان والے ان لوگوں سے درگزر کریں جو آخرت کی امید نہیں رکھتے، جو قیامت کے دن کو نہیں مانتے... اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص امید نہ رکھتا ہو اور اچانک اس پر تکلیف آئے تو تکلیف بہت سخت ہوتی ہے اور اگر کسی تکلیف کے لیے بندہ پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہو تو وہ اتنی سخت نہیں ہوتی۔ تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے لیے عذاب بہت سخت ہو گا جس کی ان کو توقع بھی نہیں ہے، ان کو امید بھی نہیں ہے، جب اچانک پکڑے جائیں گے تو پھر یہ کہیں گے کہ ہمارے ساتھ یہ کیا ہوا؟

کسی بندے سے آپ کو توقع ہو کہ میں اس کے پاس جاؤں گا اور وہ مجھے برا

بھلا کہے گا تو آپ ذہنی طور پر تیار ہو کر جائیں گے۔ اب اگر وہ برا بھلا بھی کہے گا تو آپ کو تکلیف تو ہو گی لیکن کم ہو گی کیونکہ آپ پہلے سے ذہنی طور پر تیار گئے ہیں اور اگر یہ ذہن میں ہو کہ میں جاؤں گا تو جاتے ہی وہ کھانا کھلائے گا لیکن آپ گئے تو اس نے گالی دے کر آپ کو باہر پھینک دیا تو بتائیں کتنی تکلیف ہو گی کہ یار ہم نے کیا سوچا تھا اور یہ کیا ہوا؟ اس لیے یہاں فرمایا: "لَا يَرْجُوْنَ"

آیت کا شانِ نزول:

یہ آیت ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ﴾ کب نازل ہوئی؟ اس بارے میں بعض کہتے ہیں کہ مکہ میں نازل ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مکہ میں کسی نے بہت سخت باتیں کیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جی چاہا کہ میں اس سے انتقام لوں تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ تم انتقام نہ لو بلکہ تم درگزر کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس واقعے کے مطابق یہ آیت مکی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔ غزوہ بنی مصطلق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ایک کنویں کے قریب پڑاؤ ڈالا جس کا نام مریسیع تھا۔ عبد اللہ بن ابی بن سلول منافق بھی اس لشکر کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے غلام کو بھیجا کنویں پر پانی لینے کے لیے، وہ دیر سے آیا تو اس نے پوچھا کہ دیر سے کیوں آیا ہے؟ اس نے کہا کہ وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غلام موجود تھا اور اس نے کسی کو بھی پانی بھرنے نہیں دیا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مشکیزے نہیں بھرے گئے۔ مجھے اس وجہ سے دیر ہو گئی۔

اس پر عبد اللہ بن ابی ابن سلول بدبخت نے بہت سخت جملہ کہا تھا، اس نے کہا کہ ہم پر اور ان پر یہ مثال سچی آتی ہے ”سَمِّنْ کَلْبَکَ یَأْکُلْکَ“ العیاذ باللہ، العیاذ باللہ، ہمیں تو اس کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے، اس نے کہا کہ اپنے کتے کو خوب موٹا کرو کیونکہ یہ کل تجھے ہی کھائے گا۔ اس نے کتنا غلط یہ محاورہ استعمال کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس کی گردن اڑاتا ہوں۔ جبرائیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گئے یہ آیت لے کر ﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ﴾

بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہے؛ ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں۔

نزولِ مکرر کا معنی:

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں؛ اسے کہتے ہیں نزول مکرر کہ آیت مکہ میں بھی نازل ہوئی اور مدینہ میں بھی نازل ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ آیت تو ایک بار نازل ہو گئی، دوبار نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دو مرتبہ نزول کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آیت نازل تو ہوتی ہے ایک مرتبہ، دوسری مرتبہ نازل نہیں ہوتی البتہ دوسری مرتبہ ایک موقع ایسا آتا ہے کہ جو اس آیت کے عمل کا ہوتا ہے تو جبرائیل امین علیہ السلام اس نازل شدہ آیت کو لے کر آتے ہیں کہ اس آیت پر عمل کرنے کا یہ موقع ہے اور مفسرین اسی کو نزولِ مکرر سے تعبیر فرمادیتے ہیں کہ یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی ہے۔

یہ اصول ذہن میں رکھیں گے تو بہت سارے مقامات پر الجھن ختم ہو جائے گی۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا تھا کہ میں اس منافق کی گردن اڑادوں تو جبرائیل امین آ گئے یہ آیت لے کر۔ اب یہ آیت نازل تو مکہ میں ہوئی تھی لیکن

حضرت جبرائیل علیہ السلام مدینہ میں اس وقت لے کر آ گئے کہ حضور! حضرت عمر کو بتائیں کہ اس آیت پر عمل کا یہی موقع ہے... اور مفسرین اس کو تعبیر کرتے ہیں نزول مکرر سے کہ آیت دوسری مرتبہ نازل ہوئی ہے۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝١٨﴾

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سمجھائی ہے کہ بنی اسرائیل تھے ہم نے ان کو کتاب بھی دی، احکام کا علم بھی دیا، ان میں نبی بھی بھیجے، ان کو نفیس قسم کے رزق بھی دیے خاص رزق من اور سلویٰ جو بنی اسرائیل کو ملا ہے وہ کسی اور کو نہیں ملا، یہ آسمانی دستر خوان ان کی خصوصیت ہے، اور بعض معاملات میں ہم نے ان کو جہاں والوں پر فضیلت دی ہے، پھر دلائل بھی دیے ہیں لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے پھر بھی اختلاف کیا ہے ضد کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں گے۔ تو یہ بنی اسرائیل کا معاملہ تھا۔

اب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اے پیغمبر! ہم نے آپ کو خاص شریعت دی ہے، آپ اسی کی اتباع کریں اور جو جاہل ہیں ان کی باتوں کی پروانہ کریں۔

اس سے اب صاف پتا چلتا ہے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی شرائع اور تھیں اور ہمارے پیغمبر کی شریعت اور ہے۔

شریعت؛ عقائد اور مسائل کا نام

شریعت میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک ہیں عقائد اور ایک ہیں مسائل۔

عقائد میں گزشتہ انبیاء علیہم السلام اور ہمارے نبی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں البتہ مسائلِ شریعت ان کے الگ تھے اور ہمارے الگ ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شریعت کا جو مسئلہ ہوتا ہے وہی مسئلہ ہماری شریعت کا بھی ہوتا ہے۔ تو اس کے لیے تو ضابطہ موجود ہے: "شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا شَرِيْعَتُنَا مَا لَمْ تُنْسَخْ" کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی شریعت ہماری بھی شریعت ہے، ان کے مسائل ہمارے بھی مسائل ہیں، ہاں اگر ان کو منسوخ کر دیا جائے تو پھر ان کے مسائل ہمارے مسائل نہیں رہتے، اور نسخ مسائل میں ہوتا ہے، نسخ عقائد میں نہیں ہوتا۔ کل عقیدہ اور ہو اور آج عقیدہ اور ہو ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے عقائد میں اختلاف نہیں ہے، صرف مسائل میں ہے۔

سبب بندہ اختیار کرتا ہے:

﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو خدا بنا لیا اور خدا نے اس کو گمراہ کیا اور اللہ کے علم میں ہے کہ اس شخص نے اپنی خواہشات کو خدا بنالیا تھا۔

اب یہاں دیکھو! ﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ﴾ پہلے ہے اور ﴿وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ﴾ بعد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کے لیے گمراہی کا فیصلہ اس وقت کرتے ہیں جب بندہ گمراہی کا راستہ پسند کرتا ہے۔ اس سے تقدیر کا اہم مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ اللہ رب العزت بندے کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا

ہے، وہ جس راستہ کا انتخاب کرتا ہے اللہ اس میں اس کو اسباب دے دیتے ہیں۔ تو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا نے اس کو گمراہ کیا ہے، حالانکہ خدا نے گمراہ نہیں کیا ہوتا بلکہ خدا نے بندے کے کسب کے مطابق فیصلہ کیا ہوتا ہے۔

میں اس کی مثال دوں گا تو بات جلدی سمجھ آئے گی۔ ہم کہتے ہیں: بھائی! آپ کا جو تخصص ہے یہ شعبان تک ہے، یہ ہماری طرف سے فیصلہ ہے۔ ایک بندہ رجب میں آکر ہمیں کہتا ہے کہ میں نے گھر جانا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ چلے جاؤ۔ اس کے گھر والے پوچھیں کہ تو واپس کیوں آیا ہے؟ وہ کہے کہ مجھے استاد جی نے خود بھیجا ہے۔ بھائی ہم نے تو کہا تھا کہ آپ کا تخصص شعبان تک ہے لیکن ہم نے بیڑیاں نہیں لگائیں، زنجیر نہیں لگائی، تالا نہیں لگایا کہ آپ جانا چاہیں تو جا ہی نہیں سکتے، نکلنا چاہیں تو نکل ہی نہیں سکتے بلکہ آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ خیر اور شر کے دو راستے دکھاتے ہیں اور بندے کو اختیار دیتے ہیں کہ یہ راستہ لو یا یہ راستہ لو! چاہو تو خیر کا راستہ لو اور چاہو تو شر کا راستہ لو، خیر کا لوگے تو جنت ملی گی اور شر کا لوگے تو جہنم ملے گی۔ اب پسند بندہ اپنی مرضی سے کرتا ہے شر کا راستہ تو اللہ اس کو شر کے راستے کی طاقت دے دیتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ نہ چاہیں تو بندہ شر کے راستے کی طرف نہیں جا سکتا! نہ چاہیں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ طاقت نہ دیں تو نہیں جا سکتا لیکن اللہ طاقت ہی نہ دیں تو امتحان کیسے ہو گا؟ اب اس راستے کو چاہتا بندہ ہے اور طاقت خدا دے دیتے ہیں۔

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾[139]

تو مشیتِ عبد پر مشیتِ معبود غالب ہوتی ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ

139۔ التکویر 29:81

آدمی گناہ اللہ کی رضا سے کر رہا ہے، اللہ کی مشیت کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ ارادہ فرما دیتے ہیں لیکن اللہ اس پہ راضی نہیں ہوتے۔ تو خدا کا ارادہ اور بات ہے اور رضا اور بات ہے۔

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾﴾

کفار یہ کہتے تھے کہ ہماری زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، یہی مرنا اور جینا ہے، اور یہ جو ہم پر موت آتی ہے تو اللہ نہیں مارتے بلکہ ہمیں زمانہ مارتا ہے۔ زمانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے جو طبعی اعضاء ہیں ان اعضاء میں قوت ہے وہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتے رہتے ہیں اور جب بالکل کمزور ہو جاتے ہیں تو بندہ مر جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی بھی چیز ہے مثلاً اب یہ سپیکر ہے تو یہ چلتے چلتے گھس جائے گا اور ختم ہو جائے گا، تو وہ بھی یہی کہتے کہ اسی طرح ہمارے جسم کے اعضاء ہیں، اس میں بچپن ہے، جوانی ہے، بڑھاپا ہے، مدت پوری ہوتی ہے تو ختم ہو جاتے ہیں، یہ تھوڑا ہے کہ اللہ مارتا ہے۔

زمانے کو گالی مت دو!

﴿قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل جھوٹ بولتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ فرمایا: آپ فرما دیں کہ اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور اللہ ہی مارتا ہے۔ اصل میں دہر کہتے ہیں ازل تا ابد کے زمانے کو۔ پورے وقت کا نام دہر ہے لیکن مجازاً دہر کا اطلاق مخصوص وقت پر بھی ہوتا ہے۔ تھوڑے وقت کو بھی دہر کہہ دیتے ہیں۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللهَ هُوَ الدَّهْرُ.[140]

دہر یعنی زمانے کو گالی مت دو اس لیے کہ اللہ ہی دہر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا؟ دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی ہے کہ یہ جاہل لوگ جس کام کو دہر کا کام کہتے ہیں تو وہ حقیقت میں اللہ ہی کی قدرت اور طاقت کا نام ہے۔ اصل طاقت تو اللہ کی ہے کہ مارتے بھی اللہ ہیں، زندہ بھی اللہ کرتے ہیں۔ جو لوگ دہر کو برا کہتے ہیں تو اس کا نتیجہ تو اللہ تعالیٰ تک جا پہنچتا ہے۔ اس لیے سمجھایا کہ زمانے کو گالی کبھی نہ دینا۔

جاثیہ سے کیا مراد ہے؟

﴿وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾﴾

قیامت کے دن آپ ہر جماعت کو دیکھیں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل پڑے ہوں گے اور ہر جماعت کو ان کے نامہ اعمال کی طرف بلایا جائے گا اور یہ کہا جائے گا: آج تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ یہ ہماری لکھوائی ہوئی کتاب ہے جو تمہارے بارے میں حق سچ بولے گی۔ ہم دنیا میں لکھواتے تھے جو کام تم کرتے تھے۔

”جَاثِيَةً“ جُثُوٌّ سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے گھٹنے ٹیکنا یعنی اس طرح بیٹھنا کہ آدمی کے گھٹنے اور پاؤں کے پنجے زمین پر لگیں۔ قیامت کے دن ہر بندہ اس طرح ہو

140۔ صحیح مسلم، رقم:2246

گا۔

اس پر اشکال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور بہت سارے صلحاء رحمہم اللہ ایسے ہیں جن کو قیامت کے دن خوف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اللہ ان کو محفوظ رکھیں گے۔ پھر اس کا مطلب کیا ہوا؟ جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ معاملہ سب کے ساتھ ہو گا لیکن ان کے ساتھ یہ معاملہ اتنی کم مدت کے لیے ہو گا کہ اس کو اگر شمار کریں تو گویا ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہی نہیں ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ جاثیہ سے مراد گھٹنے کے بل نہیں ہے بلکہ جاثیہ کا معنی کہ جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں یوں سب بیٹھے ہوں گے اور یہ بیٹھنا خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ عظمت کی وجہ سے ہو گا۔ اب اس پر کوئی اشکال ہی نہیں۔

قیامت کے دن اللہ بھلا دیں گے کا معنی:

﴿وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾

قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا کہ آج ہم تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دیں گے، کیونکہ دنیا میں تم نے اس سے ملاقات کو بھلا دیا تھا، تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔

تو یہاں "نَنْسٰىكُمْ" کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ ان کو بھول جائیں گے بلکہ معنی یہ ہے کہ ان کو نظر انداز کر دیں گے یعنی ان کی طرف دھیان نہیں فرمائیں گے۔ جیسے دنیا میں کوئی بندہ کسی کو سزا دیتا ہے اور بھول جاتا ہے اور بعد میں یاد ہی نہیں رہتا کہ اس کو چھوڑنا بھی تھا۔ تو اللہ تعالیٰ ایسا کریں گے تو نہیں لیکن معاملہ ایسا ہو گا جیسا اللہ کسی کو سزا دے کر بھول جائیں۔

﴿ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ

فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿٣٥﴾

اس وجہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق بناتے تھے، دنیا کی زندگی نے تمہیں دھوکہ دیا ہوا تھا۔ آج قیامت کے بعد نہ تو ان کو جہنم سے نکالا جائے گا اور نہ ہی ان کو کوئی موقع دیا جائے گا۔ تدارک کی ان کے پاس کوئی صورت نہیں ہو گی۔

اللہ رب العزت ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الاحقاف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳﴾﴾

دلائل توحید کا بیان:

یہاں اللہ رب العزت نے توحید پر دلائل بیان فرمائے ہیں اور دلائل کی جتنی قسمیں ہیں ساری بیان فرمائی ہیں۔ دلائل کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

1: دلیل عقلی 2: دلیل نقلی

اور دلیل نقلی میں پھر دو قسم کی دلیلیں ہوتی ہیں؛ ایک دلیل وہ جو آسمانی کتاب میں ہو اور ایک دلیل وہ جو پیغمبر کی زبان سے ہو۔ تو یہاں تینوں قسم کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔

﴿قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَہُمۡ شِرۡکٌ فِی السَّمٰوٰتِ﴾

اے پیغمبر! آپ ان سے فرمائیں کہ یہ جو تم اللہ کے علاوہ اوروں کی عبادت

کرتے ہو تو یہ بتاؤ کہ جن کو تم خدا بناتے ہو کیا انہوں نے زمین کی کوئی چیز پیدا کی ہے؟ یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ یہ عقلی دلیل ہے۔

﴿اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ﴾

تمہارے اس دعوے پر اگر اس سے پہلے کسی کتاب: تورات، انجیل، زبور یا کسی آسمانی صحیفے میں کوئی بات درج ہے تو میرے پاس لاؤ! یہ دلیل نقلی ہے۔

﴿اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

یا کسی پیغمبر کی زبان سے کوئی بات نکلی ہو، کوئی علمی بات ہو تو بتاؤ اگر تم سچے ہو تو۔ یہ بھی دلیل نقلی ہے۔ "اَثٰرَةٍ" یہ مصدر ہے سخاوۃ کے وزن پر۔

تو اللہ نے تینوں قسم کے دلائل یہاں بیان فرمائے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن سلام کا اسلام:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠﴾﴾

یہاں یہ بات بنی اسرائیل کو سمجھائی ہے۔ فرمایا: یہ بتاؤ کہ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو- قرآن تو ہے ہی اللہ کی طرف سے، چونکہ وہ اس کا انکار کرتے تھے اس لیے ان کو سمجھانے کے لیے یہ بات کہی ہے- تو اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو اور تم لوگوں نے اس کا انکار کر دیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک صاحب علم اس کے حق میں گوہی دے اور اس پر ایمان لے آئے اور تم تکبر میں پڑے رہو تو پھر تمہاری بات مانی جائے یا ان کی مانی جائے؟ اس پیغمبر پر ایمان تو بنی اسرائیل کے بڑے بڑے لوگ بھی لا چکے ہیں۔

اب ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ یہ عام ہے، رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی آمد سے پہلے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے تھے تو وہ بھی شامل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے وقت کے جو لوگ ہیں جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وہ بھی شامل ہیں کیونکہ انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے لوگ بھی شامل ہیں جو آپ کی تصدیق کریں گے، آپ پر ایمان لائیں گے۔ تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے، حضور کی موجودگی میں اور حضور کے بعد کے لوگ سب شامل ہیں۔

بہت سارے مفسرین نے "شاہد" سے مراد حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو لیا ہے حالانکہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اسلام لائے ہیں اس آیت کے نازل ہونے کے بعد لیکن جب شاہد کو عام مان لیا جائے تو اگر آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی اسلام لے آئیں تو پھر بھی اشکال نہیں ہے۔

یہودیوں کا دوہرا معیار:

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ یہودی ان کو اپنا بڑا عالم سمجھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن سلام نے جب اسلام قبول کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ لوگ مجھے اچھا سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں ابھی یہ نہیں پتا کہ میں نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔ آپ ان سے میرے بارے میں رائے معلوم کریں تو پتا چل جائے گا کہ میرے بارے میں یہ کیا کہتے ہیں؟ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار چند یہود کو بلا کر پوچھا کہ عبد اللہ بن سلام تم میں کیسے آدمی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ جی بڑے آدمی ہیں، بڑے باپ کے بیٹے ہیں، اچھے آدمی ہیں، اچھے باپ کے بیٹے ہیں۔ فرمایا کہ اگر وہ کلمہ پڑھ لیں تو....؟ یہودیوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا! عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اس قت

پردے میں چھپے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عبد اللہ بن سلام ذرا سامنے آؤ! تو انہوں نے آکر سب کے سامنے کلمہ پڑھا تو یہودیوں نے کہا کہ یہ بہت گندا آدمی ہے، گندے باپ کا بیٹا ہے۔ فوراً تبدیل ہو گئے۔ اسے کہتے ہیں ضد۔

سلام کو رواج دو!

اور عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سب سے پہلے میں نے جو حدیث سنی تھی وہ یہ تھی:

أَيُّهَا النَّاسُ، أَفْشُوا السَّلَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ.[141]

اے لوگو! السلام علیکم کو پھیلاؤ، لوگوں کو کھانا کھلاؤ، رشتہ داری کا خیال کرو اور رات کو نماز پڑھو جب لوگ سوئے پڑے ہوں، تم امن کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اب دیکھو! اس کھانے میں غریب امیر کا تذکرہ نہیں کہ مالدار کو کھلاؤ یا غریب کو کھلاؤ بلکہ فرمایا کہ کھانا کھلاؤ، امیر غریب سب اس میں شامل ہیں۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں چار باتیں ارشاد فرمائی ہیں؛ ایک دوسرے کو سلام کہنا۔ ہمیں اس چیز کا خیال کرنا چاہیے، اللہ آپ کو مقام عطا فرمائے، اللہ آپ کو عزت دے، اچھی مسند عطا فرمائے، آپ کسی جگہ پر جائیں اور بچے آپ کے استقبال میں کھڑے ہوں تو سلام آپ کو کرنا چاہیے، ایسا کبھی نہ کریں کہ جائیں اور بچے کہیں السلام علیکم، یہ خلافِ سنت ہے، جو جاتا ہے اس کا حق ہے کہ وہ سلام کرے اور بچے "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" جواب دیں۔

141۔ سنن ابن ماجۃ، رقم: 3251

حضرت عبد اللہ بن سلام کے تین سوالات:

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال کیے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ سے ایسے تین سوال کرتا ہوں جن کے جوابات اللہ کے نبی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، آپ ان کے جوابات دیں تو میں اسلام قبول کروں گا!

1: پہلا سوال یہ تھا: "مَا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ" کہ علاماتِ قیامت میں سب سے پہلی علامت کون سی ہے؟ اس سے مراد اس وقت کی علامت ہے جب قیامت بالکل قریب ہو گی۔

2: دوسرا سوال یہ تھا: "وَمَا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ" جنت میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے اہل جنت کون سا کھانا کھائیں؟

3: تیسرا سوال یہ تھا: "وَمِنْ أَيِّ شَيْءٍ يَنْزِعُ الْوَلَدُ إِلٰى أَبِيهِ وَمِنْ أَيِّ شَيْءٍ يَنْزِعُ إِلٰى أَخْوَالِهِ" کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو کبھی وہ باپ کے مشابہ ہوتا ہے اور کبھی اس کی شکل اپنے ماموں کی طرح ہوتی ہے یعنی کبھی وہ اپنی ماں کے مشابہ ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں سوالوں کا جواب دیا:

- علاماتِ قیامت میں سب سے پہلی علامت کون سی ہے؟ فرمایا: "أَمَّا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ فَنَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ إِلَى الْمَغْرِبِ" پہلی علامت ایک آگ ہو گی جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف جمع کرے گی۔
- اہلِ جنت کا پہلا کھانا کون سا ہو گا؟ فرمایا: "وَأَمَّا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَزِيَادَةُ كَبِدِ حُوتٍ" کہ اہلِ جنت کو جنت میں سب سے پہلے مچھلی کے جگر پیش

کیے جائیں گے۔ دعا کریں اللہ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائیں۔ آمین

◆ بچہ کبھی باپ کے مشابہ کبھی ماں کے مشابہ تو اس کی وجہ؟ فرمایا: "وَأَمَّا الشَّبَهُ فِي الْوَلَدِ فَإِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَشِيَ الْمَرْأَةَ فَسَبَقَهَا مَاؤُهُ كَانَ الشَّبَهُ لَهُ وَإِذَا سَبَقَ مَاؤُهَا كَانَ الشَّبَهُ لَهَا" کہ کبھی ماں کا پانی سبقت لے جاتا ہے تو ماں کی طرح ہوتا ہے اور کبھی باپ کا پانی سبقت لے جاتا ہے تو باپ کی طرح ہوتا ہے۔[142]

اللہ سے عافیت مانگیے!:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٣﴾﴾

جو لوگ کہتے ہیں "رَبُّنَا اللَّهُ" کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ جاتے ہیں تو نہ ان پر خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ڈٹ جانے کا معنی ہوتا ہے کہ ایک تو ایمان پر قائم رہتے ہیں اور دوسرا ایمان کے مقتضیات پر عمل کرتے ہیں، یہ استقامت ہے۔ استقامت، شریعت کا اعلیٰ درجہ ہے جسے عزیمت کہتے ہیں، رخصت، ادنیٰ درجہ ہے۔ آدمی کو استقامت مانگنی نہیں چاہیے لیکن اگر آ جائے تو اختیار کرنی چاہیے، اللہ تعالی سے عافیت مانگیں اور رخصت پر عمل کرنے کا مزاج بنائیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ جب بھی آپ کو دو چیزوں کے بارے میں اختیار دیا جاتا تو آپ جو چیز آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے، اس کی وجہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود تو صاحبِ استقامت اور صاحبِ

142۔ صحیح البخاری، رقم:3329

عزیمت تھے لیکن امت کے لیے ایسا کیا تا کہ امت کے لیے آسانی پیدا ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں تھے اور جیل میں قیدی نے خواب دیکھا، آپ علیہ السلام نے تعبیر بتائی تو قیدی بری ہو گیا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ بادشاہ سے میرا تذکرہ کرنا یعنی بادشاہ سے ذکر کرنا کہ جیل میں ایک ایسا شریف بندہ بھی ہے۔ وہ تذکرہ کرنا بھول گیا۔ کچھ عرصے بعد بادشاہ کو خواب آیا، اس نے تعبیر پوچھی تو تعبیر دینے والوں نے معذرت کی کہ یہ خیالات ہیں، ان کی تعبیر نہیں ہوتی۔ وہ بندہ جو یوسف علیہ السلام کے ساتھ قیدی رہ چکا تھا اس نے کہا کہ جی جیل میں ایک آدمی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے پوچھوں۔ یہ وہاں گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے یوسف علیہ السلام سے پوچھا کہ میرے دوست! اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔ آپ علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بتائی۔ جب بادشاہ نے خواب کی تعبیر سنی تو اس نے کہا کہ ان کو بلا کر لاؤ! جب بلانے کے لیے گئے تو انہوں نے فرمایا:

﴿فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ﴾[143]

کہ میں بعد میں آؤں گا پہلے اس واقعے کی تحقیق تو کرو کہ جب ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، ان سے پوچھو کہ انہوں نے ہاتھ کیوں کاٹے تھے! تا کہ صفائی ہو تو پھر باہر جاؤں، میں الزام لے کر باہر نہیں جانا چاہتا۔

یوسف علیہ السلام نے جب یہ فرمایا تو بادشاہ نے عورتوں کو بلا کر پوچھا:

﴿قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ﴾[144]

143۔ یوسف 50:12

144۔ یوسف 51:12

کہ تمہارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی تھی؟ تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ہمارا قصور ہے، یہ ہم نے کیا تھا، یوسف بالکل بری ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یوسف علیہ السلام کی جگہ میں ہوتا تو میں فوراً باہر آجاتا۔[145]

اللہ کے نبی نے امت کو یہ تعلیم دی ہے۔ چونکہ پہلے صفائی ہو اور پھر باہر آئیں تو یہ عزیمت کا راستہ ہے اور جب بادشاہ نے رہائی دی ہے تو اس کو قبول کرو یہ رخصت کا راستہ ہے۔ تو یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کا مزاج بنایا ہے۔ اس لیے صاحبِ عزیمت دنیا میں بہت کم لوگ ہوا کرتے ہیں، یہ ہر آدمی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس لیے رخصت پہ گزارا کرو کہ اس میں آسانی بہت ہے۔ عزیمت اگر اختیار کرنی ہے تو سوچ سمجھ کر اختیار کرنی ہے، بس پھر واپس نہیں آنا چاہیے، آدمی جب عزیمت کے راستے سے واپس آتا ہے تو پھر ہزاروں لوگوں کا ایمان تباہ ہو جاتا ہے۔ میں بطورِ خاص طلبہ سے کہتا ہوں کہ فراغت کے بعد آپ نے راستہ اختیار کرنا ہے تو سوچ سمجھ کر کرنا!

ہدف کے انتخاب میں دو چیزوں کا خیال کریں!

بس خلاصہ ذہن میں رکھیں! آپ نے کام کیا کرنا ہے اسے ہدف کہتے ہیں۔ جب آپ ہدف کا تعین کرلیں تو پھر اس ہدف تک پہنچنے کے لیے بندے کا انتخاب کریں اور بندے کا انتخاب کرنے کے لیے دو چیزیں ہیں:

[1]: استشارہ

ایک تو اپنے ساتھ محبت کرنے والے سمجھدار آدمی سے مشورہ کریں کہ میں

145۔ صحیح البخاری، رقم:4694

فلاں سے تعلق رکھوں یا نہیں؟مشورہ جس سے کرنا ہے اس میں دو صفتیں ہونی چاہییں:

ایک یہ کہ وہ آپ کا خیر خواہ ہو اور دوسرا یہ کہ وہ عقلمند ہو، سمجھدار ہو۔

جبکہ ہماری حالت یہ ہوتی ہے کہ ہم اس سے مشورہ کرتے ہیں جو کبھی سمجھدار نہیں ہوتا اور جو سمجھدار ہوتا ہے تو کبھی وہ خیر خواہ نہیں ہوتا۔

[2]: استخارہ... استخارہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سے خیر کو طلب کرنا۔

استشارہ لوگوں سے ہوتا ہے اور استخارہ اللہ سے ہوتا ہے۔ استشارہ؛ استخارہ سے زیادہ مفید ہوتا ہے، کیونکہ جب ہم کسی سے مشورہ لیتے ہیں تو وہ جو بھی مشورہ دیتا ہے وہ ہمیں سمجھ آجاتا ہے، اور ایک بندے نے استخارہ کیا، اللہ سے خیر طلب کی، اب اللہ نے کیا فیصلہ کیا ہے یہ ہمیں پتا نہیں چلتا، تو اصل استشارہ ہوتا ہے اور استخارہ کرنا ہے تو وہ کرے جس کا اپنا کام ہوتا ہے، لوگوں کی عجیب حالت ہوتی ہے کہ کام اپنا ہوتا ہے او استخارہ دوسروں سے کراتے ہیں۔

میرا ایک مرید ہے، میں اس کے گھر رات ٹھہرا تو مجھے وہ صبح کہنے لگا: مولانا صاحب! استخارہ کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ کرتا ہوں۔ اب مجھے پتا تھا کہ اس کے بعد اس نے کیا کہنا ہے؟ کہتا ہے کہ میں نے شادی کے لیے استخارہ کرانا ہے۔ میں نے کہا کہ میں استخارہ تو کرتا ہوں لیکن اپنے کام کے لیے، شادی تو نے کرنی ہے اور استخارہ میں کروں؟! اگر میں نے استخارہ کیا اور میرے خواب میں وہ آگئی اور مجھے پسند آگئی تو پھر اب میں تیرے لیے اللہ سے مانگوں گا یا اپنے لیے اللہ سے مانگوں گا؟ (مسکراہٹ از سامعین) اس لیے اپنا استخارہ خود کرتے ہیں۔

تو یہ باتیں طے کرو! نمبر 1 کہ ہدف کا تعین اور نمبر 2 کہ ہدف تک پہنچنے کے لیے فرد کا تعین... اور فرد کے تعین میں جلدی نہ کرو، استشارہ کرو... استخارہ کرو! جب فرد کا تعین ہو جائے تو پھر سب کچھ اس پہ لٹا دو۔ کبھی ہدف متعین نہیں کرتے اور کبھی

فرد کے تعین میں جلد بازی کرتے ہیں، اس لیے پھر زندگی بھر الجھن رہتی ہے، کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر پھسل جاتے ہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد:

﴿وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ﴾ [146]

یہاں اللہ رب العزت نے بطورِ خاص حقوق العباد کا ذکر کیا ہے۔ بنیادی حقوق دو ہیں؛ ایک حق اللہ اور دوسرا حق العبد۔ پہلے حقوق اللہ کا ذکر کیا ہے کہ توحید کا خیال کرو اور شرک سے بچو، اپنے اعمال کا خیال کرو اب اس کے بعد حق العبد آرہا ہے اور حقوق العباد میں سب سے اہم حق والدین کا ہے، اس لیے اس کا تذکرہ فرمایا اور والدین میں سب سے اہم حق ماں کا ہے، اس لیے اس کا ذکر فرمایا۔

ایک شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے یہ بتائیں کہ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری ماں، پھر فرمایا: تمہاری ماں، پھر فرمایا: تمہاری ماں، اور چوتھی مرتبہ فرمایا: تمہارا باپ۔ [147]

تو ماں کا ذکر تین بار فرمایا اور پھر والد کا ذکر فرمایا۔ اس لیے ماں کا حق سب سے زیادہ ہے۔

تو اللہ نے فرمایا: ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، اس کی ماں اسے مشقت برداشت کرتے ہوئے اپنے پیٹ میں اٹھائے

146۔ الاحقاف 15:46

147۔ صحیح البخاری، رقم: 5971

رکھتی ہے، اور مشقت برداشت کر کے اس بچے کو جنتی ہے، پھر بچے کو گود میں رکھتی ہے، دودھ پلاتی ہے اور پھر اس کا دودھ چھڑاتی ہے اور اس میں تیس ماہ لگا دیتی ہے۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾﴾

یہاں تک کہ جب یہ اپنی بھرپور جوانی کو پہنچا ہے اور بعد میں مزید بڑھتا ہوا چالیس سال کی عمر میں پہنچتا ہے تو اللہ سے دعائیں مانگتا ہے کہ اے اللہ! مجھے توفیق دیں کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا جو آپ نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی ہیں میں ان پر آپ کا شکر ادا کروں، میں ایسے نیک اعمال کروں جن سے آپ راضی ہو جائیں اور آپ میری اولاد کو بھی نیک بنا دیں۔ اے اللہ! میں آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔

شانِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

بہت سارے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے اول مصداق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عمر اٹھارہ سال تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بیس سال تھی۔ تو یہ اکٹھے تجارت کے لیے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مال کا مضارب بن کر تجارت کی۔ مال اُن کا تھا اور محنت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اور پرافٹ آدھا آدھا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس سفر میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت متاثر ہوئے۔ بس پھر آپ کی یاری لگ گئی اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معتقد بن گئے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال ہوئی تو

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا، صدیق اکبر نے کلمہ پڑھ لیا۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ" کہ جب خوب جوانی کو پہنچے اٹھارہ سال کے ہو کر تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب ہو گئے اور "وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً" کہ جب چالیس سال کے ہو گئے تو صدیق اکبر نے یہ دعا مانگی تھی۔ یہ جو فرمایا: "وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ" کہ مجھے توفیق دے کہ میں نیک عمل کروں جس سے اللہ تو راضی ہو جائے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بارہ غلام آزاد فرمائے۔ اور فرمایا: "وَ اَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ" کہ میری اولاد کو بھی نیک کر۔ تو صدیق اکبر وہ واحد صحابی ہیں کہ جن کے والدین اور اولاد سب کو صحابیت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی چار پشتیں صحابی ہیں، صدیق اکبر کے والد ابو قحافہ اور والدہ ام رومان، خود صدیق اکبر، پھر آپ کی بیٹیاں اور بیٹے اور آگے آپ کے نواسے۔ رضی اللہ عنہم

وجوہِ فضیلت صدیق اکبر:

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ انبیاء علیہم السلام کے بعد امت میں سب سے افضل شخص ہیں۔ افضلیت کی وجہ صحابیت ہے، اعمال نہیں۔

[1]: اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وہ واحد شخص ہیں جن کو قرآن نے صحابی کہا ہے ﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾[148]، اس لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے افضل ہیں۔

148۔ التوبۃ 40:9

[2]: صدیق اکبر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور صحابی کی وجہ فضیلت صحابیت ہے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جن کی چار پشتیں صحابی ہیں، اس لیے آپ تمام صحابہ سے افضل ہیں۔

[3]: صحابی کی وجہ فضیلت صحابیت ہے اور صحابیت صحبت سے ہے، اس کا مطلب جس کو صحبت جتنی زیادہ ملی ہے اتنا افضل ہے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سب سے زیادہ ملی ہے حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو اتنی صحبت نہیں ملی جتنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ملی ہے۔ کیونکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تو دس سال کے بعد انتقال فرما گئی تھیں، باقی ازواج مطہرات جو آئی ہیں سب ان کے بعد کی ہیں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو پہلے دن کے ساتھی ہیں، تیئیس سالہ صحبت اور پھر سفر اور حضر کے ساتھی ہیں۔

[4]: میں چوتھی وجہ فضیلت پیش کرنے لگا ہوں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں کہ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی خلوت کی صحبت ملی ہے جو کسی اور کو میسر نہیں۔ غارِ ثور میں تین دن اور تین راتیں یہ واحد ابو بکر صدیق تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور اس کا ذکر قرآن نے کیا ہے ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾[149] ایسا شخص دنیا میں کوئی نہیں جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی صحبت ملی ہو۔

صدیق اکبر کی پسند تین چیزیں:

اور بندہ حیران ہوتا ہے کہ اللہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کیسی صحبت

149۔ التوبۃ 40:9

عطا کی تھی۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنیَا ثَلَاثٌ.

کہ میری محبوب ترین چیزیں تین ہیں۔

[۱]: ان میں پہلی چیز "اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِ رَسُوْلِ اللہِ" تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو دیکھنا۔ اللہ نے صدیق کی یہ خواہش کیسے پوری کی کہ تین دن غار میں ہیں اور سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے اور کام بھی کوئی نہیں ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار میں صدیق اکبر ایسے مگن تھے کہ سانپ نے ڈس لیا، شدت سے تکلیف ہوئی، آنکھ سے آنسو نکلا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور پر گرا۔ اس کا معنی یہ تھا کہ صدیق اکبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت میں اس قدر محو تھے کہ آپ کو احساس ہی نہیں ہوا کہ میری آنکھ کا آنسو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر گر رہا ہے۔ احساس ہوتا تو صدیق اکبر کبھی نہیں گرنے دیتے۔ جو شخص سانپ کا زہر برداشت کر رہا ہے اور ران کو حرکت نہیں دے رہا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر آنسو کیسے گرائے گا؟! کیسی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی۔

[۲]: اور فرمایا: "اُنْفِقُ مَالِیْ عَلٰی اَمْرِ رَسُوْلِ اللہِ" کہ حضور کی خواہش ہو اور مال میرا ہو۔ آپ نے خرچ کیا اور مثال قائم کر دی۔

[۳]: "اَنْ تَکُوْنَ بِنْتِیْ تَحْتَ رَسُوْلِ اللہِ" کیسے الفاظ ہیں! فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ میری بیٹی ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ بنے۔

نکاحِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا:

پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی نو سال کی بیٹی حضرت امی عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح میں دی ہے۔

میں کئی بار یہ باتیں عرض کرتا ہوں کہ ہم چونکہ شادی کو شہوت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے کوئی شاگرد اپنے استاد کو کبھی اپنی بہن نکاح میں نہیں دے گا، کوئی مرید اپنے پیر کو کبھی اپنی بیٹی کا نکاح نہیں دے گا۔ اس کی وجہ کہ دماغ میں شہوت ہے، اور اگر یہ بات ہو کہ اللہ نے قرآن میں بیوی کو سکون کا ذریعہ فرمایا ہے:

﴿وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا﴾[150]

کہ اللہ نے تمہی میں سے یعنی تمہاری جنس انسان میں سے تمہاری بیویوں کو پیدا ہے تاکہ تم کو ان سے سکون ملے۔

﴿هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ جَعَلَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا لِیَسۡکُنَ اِلَیۡہَا﴾[151]

کہ اللہ نے تمہیں ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا اور اسی سے اس کی بیوی کو بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے!

اب آپ دیکھ لیں کہ اللہ نے جب بیوی کا ذکر کیا تو فرمایا کہ میں نے عورت کو پیدا فرمایا تاکہ مرد کو سکون ملے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر مرید کے دل میں ہو کہ اس سے میرے شیخ کو سکون ملے گا، شاگرد کے دل میں ہو کہ میرے استاذ کو سکون ملے گا تو پھر مزاج الگ ہوتا ہے۔ یہ چونکہ ہمارے ذہن میں تصور ہی نہیں ہے اس لیے یہ مزاج پھر نہیں بن پاتا۔ میں بارہا عرض کرچکا ہوں کہ ہم دوسری شادی اور تعددِ نکاح کے بارے میں اس لیے صحیح رخ پر نہیں آرہے کہ ہمارے ہاں نکاح کا معنی سمجھ میں

150۔ الروم 21:30

151۔ الاعراف 189:7

نہیں آ رہا۔ ہم نکاح کو شہوت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں جبکہ شریعت نکاح کو سکون کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خواہش کیا تھی کہ بیٹی میری ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راحت ملے اور بیوی سے بڑھ کر کوئی کسی کو راحت نہیں دے سکتا اگر بیوی اچھی مل جائے تو... اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ راحت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اپنی نو سال کی بیٹی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دی اور اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر باون سال تھی۔

مجھے ایک سفر میں ایک ساتھی نے کہا کہ مولانا صاحب! باقی تو ٹھیک ہے لیکن اتنی چھوٹی عمر اور اتنا بڑا شوہر... بات دل کو نہیں لگ رہی۔ میں نے کہا کہ آپ کے دل کو نہیں لگ رہی کیونکہ آپ صرف پڑھتے ہیں اور میرے دل کو لگتی ہے کیونکہ میں نے اس عمر میں چھوٹی لڑکی سے شادی کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح نکاح کامیاب ہوتا ہے اور یہ نکاح کتنا اچھا ہوتا ہے! آپ لوگوں کی محض تھیوریاں ہوتی ہیں اور ہمارا پریکٹیکل ہے۔ اس لیے صوفیاء ذوقی لوگ ہوتے ہیں، وہ اپنے ذوق اور وجدان سے چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، اس لیے دلائل ان پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

حضرت رائے پوری رحمہ اللہ اپنے خلیفہ سے فرمانے لگے کہ ذکر کبھی نہ چھوڑنا، مولوی فتویٰ دیں پھر بھی نہ چھوڑنا۔ اب جس بندے نے ذکر کی حلاوت کو چکھا ہی نہیں ہے، ذکر کے فوائد کو دیکھا ہی نہیں ہے، ذکر کی حقیقت سے واقف ہی نہیں ہے وہ تو پریشان ہو گا کہ لوگ کیا کہیں گے! اس لیے حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ کامیاب مناظر وہ ہوتا ہے کہ جو دلائل کے ساتھ ساتھ طریقت کو بھی جانتا ہو، جو طریقت کو نہیں سمجھتا وہ کامیاب مناظر نہیں ہو سکتا۔

اس لیے کہ وجدان طریقت سے آتا ہے اور یہ آتا ہے صحبت سے۔ تو جب

ایک شخص کا ذوق صحیح نہیں ہے، وجدان کی کیفیت اس کے پاس نہیں ہے، کیفیات اس پر نہیں آتیں تو وہ کیا سمجھے گا کہ شیخ کی توجہ کا مرید کی توجہ میں کیا دخل ہوتا ہے اور شیخ کے خیال کو مرید کے خیال میں کیا دخل ہوتا ہے۔ جو ان مراحل سے گزرا نہیں ہے وہ تو اس کو شرک کہہ کر ٹال دے گا، کبھی اس کو ہندوانہ چیزیں کہہ دے گا۔ وہ شخص جو کسی خانقاہ میں رہا ہو، کسی شیخ کے پاس بیٹھا ہو، شیخ کی مجلس سے مستفید ہوا ہو، شیخ کا عکس اس کے قلب پر آیا ہو تو اس کو یہ بات سمجھ آئے گی۔

اس لیے کہتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عکسِ رسول ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں اور عجیب بات ہے کہ جتنی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اتنی عمر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے اور دو سال بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جا ملے۔

صحابہ میں آئیڈیل شخصیت:

سارے صحابہ رضی اللہ عنہم ہمارے لیے آئیڈیل ہیں۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو حضرات صحابہ میں سے میرے آئیڈیل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں۔ صدیق اکبر سے زیادہ جری اور شجاع کوئی نہیں ہے اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے پوچھا:

أَخْبِرُوْنِيْ مَنْ أَشْجَعُ النَّاسِ؟

بتاؤ! لوگوں میں سب سے زیادہ دلیر شخص کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: امیر المؤمنین آپ ہیں۔ فرمایا: نہیں بلکہ دلیر آدمی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔[152]

152۔ کنز العمال: ج12 ص235 رقم الحدیث 35685

پہلا مسئلہ: حمل کی کم از کم مدت

یہاں ایک بات سمجھیں۔ یہاں فرمایا:

﴿وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾

ایک مسئلہ چلتا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت کیا ہے؟ تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی آیت سے استدلال فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اللہ نے یہاں فرمایا: ﴿وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ کہ حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾[153]

کہ دودھ پلانے کی مدت تو دو سال ہے۔

اور یہاں کل مدت بتائی ہے اڑھائی سال۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مدت رضاعت تو ہوتی ہے دو سال، باقی بچیں گے چھ ماہ، تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوا چھ ماہ کے بعد۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس پر حد جاری کرو! کیونکہ عام عادت یہ ہوتی ہے کہ بچہ نو ماہ کے بعد پیدا ہوتا ہے اور کم از کم سات ماہ بعد پیدا ہوتا ہے، عام عادت یہی ہوتی ہے۔ تو یہ چھ ماہ بعد کیسے پیدا ہوا؟ اس پر حد جاری کرو! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، اس پر حد جاری نہ کرو، اس لیے کہ قرآن مجید میں حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر تیس ماہ بتائے گئے ہیں اور دوسری آیت میں رضاعت کی مدت چوبیس ماہ ہے۔ تیس سے چوبیس نکالیں تو باقی چھ ماہ بچتے ہیں۔ اس لیے اقل

153۔ البقرۃ 233:2

مدت حمل چھ ماہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔[154]

تو حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت کتنی ہو سکتی ہے؟ تو بعض کے ہاں یہ دو سال ہے، بعض کے ہاں چار سال ہے۔ حنفیہ کے ہاں حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔

دوسرا مسئلہ: مدتِ رضاعت

دوسرا مسئلہ ہے مدتِ رضاعت کہ ماں بچے کو کتنے سال تک دودھ پلا سکتی ہے؟ تو قرآن کریم میں ہے کہ مدت رضاعت دو سال ہے۔

باقی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر یہ ایک الزام ہے کہ آپ اکثر مدت رضاعت اڑھائی سال مانتے ہیں اور یہ قرآن کریم کی آیت ﴿وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ﴾ کے خلاف ہے۔

اس کا جواب اچھی طرح سمجھیں۔ حضرت امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ یہ جو آیت کریمہ ہے ﴿وَ الْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ﴾ جس سے آپ استدلال کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اکثر مدت رضاعت دو سال ہے اگر اس آیت میں غور کیا جائے تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ مدتِ رضاعت اس کے بعد بھی ہے، کیونکہ اللہ رب العزت نے آگے اسی آیت میں فرمایا ہے:

﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا﴾

کہ مدتِ رضاعت دو سال ہے۔ پھر یہ "فا" تعقیب مع الوصل کے لیے ہے۔

154۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2ص2816

اب یہاں ''فا'' کا معنی ''پس'' نہیں کرنا۔ ہر جگہ اس کا معنی ''پس'' نہیں کرتے۔ کبھی ''فا'' تعلیلیہ ہوتا ہے تو وہاں معنی ہوتا ہے ''اس لیے''... اور کبھی ''فا'' تعقیب مع الوصل کے لیے ہوتا ہے تو وہاں اس کا معنی ہوتا ہے ''بعد میں''... اب یہاں چونکہ ''فا'' ہے اس لیے اس آیت کا معنی ہو گا کہ ''اس کے بعد اگر وہ دودھ چھڑانا چاہیں آپس کی رضامندی اور باہمی مشاورت سے تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

تو اگر مدتِ رضاعت ہے ہی دو سال تو اب دو سال کے بعد مشورے کی کیا ضرورت ہے؟ مشورہ تب ہی ہو گا کہ جب اس کے بعد دودھ پلانے کی گنجائش ہو گی۔ تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ مدتِ رضاعت دو سال سے زائد بھی ہو سکتی ہے۔

اس کی مثال دوں گا تو بات زیادہ سمجھ آئے گی۔ مثلاً ہمارے ہاں نمازِ ظہر ہوتی ہے پونے دو بجے اور عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے ساڑھے تین بجے۔ اب ہم پونے دو بجے نماز نہیں پڑھتے کیونکہ سبق ہو رہا ہے یا بیان ہو رہا ہے اور کہتے ہیں کہ مؤخر کرو! ہم کہتے ہیں کہ ہماری نماز تو ہے پونے دو بجے لیکن اگر مشورے کے ساتھ اڑھائی بجے پڑھ لو تو بھی ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کب ہو گا کہ جب پونے دو بجے کے بعد نماز کا وقت باقی ہو گا۔ اگر نماز کا وقت ہے تو پونے دو بجے لیکن مشورے کے ساتھ اڑھائی بجے بھی کرانا چاہیں تو صحیح تب ہی ہو گا جب پونے دو بجے کے بعد نماز کی گنجائش ہو گی، گنجائش نہ تو پھر کیسے کہیں گے کہ مشورے سے اڑھائی بجے کر دو؟! اب ہمارے ہاں ساڑھے تین بجے نماز کا وقت ختم ہو رہا ہے تو اگر ساڑھے تین کے بعد مشورے کے ساتھ پونے چار بجے ظہر کی نماز پڑھیں تو کیا ٹھیک ہے؟ نہیں، کیونکہ اب وقت ختم ہو گیا ہے۔ تو اس آیت میں ''فا'' بتا رہا ہے کہ دو سال کے بعد بھی گنجائش ہے۔

اور دوسری یہی آیت ہے:

﴿حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّ وَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَ حَمۡلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ﴾

"حَمَلَتْهُ" سے مراد ہے بچے کا ماں کے پیٹ میں ہونا۔ "وَضَعَتْهُ" سے مراد ہے بچے کو جننا۔ آگے "حَمْلُهٗ" ہے۔ اب اس حمل سے کیا مراد ہے؟ یا تو حمل کا معنی ہے کہ بچے کا ماں کے پیٹ میں ہونا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ ہو تو اسے بھی حمل کہتے ہیں اور اگر ماں کی گود میں بچہ ہو تو اسے بھی حمل کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾[155]

اب ان بنی اسرائیل کے پیٹ میں تو کتابیں نہیں ہیں بلکہ باہر ہیں تو اس کو بھی حمل کہتے ہیں۔

اب حمل کے دو معنی ہو گئے۔ یہاں حمل کا معنی کون سا ہو گا؟ تو اگر یہاں حمل کا معنی یہ ہو کہ ماں کا بچے کو پیٹ میں رکھنا۔ تو اب اس کا معنی ہو گا کہ بچے کا پیٹ میں رکھنا، پھر جننا اور پھر گود میں رکھنا ان سب کی مدت ہے اڑھائی سال۔ اب یہاں مدت رضاعت دو سال ہی ہو گی، کیونکہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے تو اکثر مدت رضاعت دو سال ہو گی... اور اگر حمل سے مراد ہو ماں کا بچے کو گود میں اٹھانا تو اب اس کا معنی ہو گا کہ ماں نے بچے کو پیٹ میں رکھا، پھر ماں نے بچے کو جنا، پھر اپنی گود میں اٹھایا اور دودھ پلاتی رہی تیس ماہ۔ اب اکثر مدت رضاعت اڑھائی سال ہو گی۔

اب یہاں معنی کون سا لیں۔ تو امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ قرینہ یہاں اس بات پر ہے کہ یہاں حمل سے مراد گود اٹھانا ہو کیونکہ یہاں پر ماں کی تین مشقتیں بیان کی جا رہی ہیں۔ اگر حمل سے مراد ہو ماں کا بچے کو پیٹ میں رکھنا وہ تو پہلے آ چکا ہے "حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ" میں تو اب یہاں حمل سے مراد بچے کا پیٹ میں ہونا نہیں ہے بلکہ گود

155۔ الجمعة 5:62

میں ہونا ہے۔

اب اس آیت کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مدتِ رضاعت اڑھائی سال ہے لیکن وہ جو آیت ہے: ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ اس میں "كَامِلَيْنِ" اور "اَنْ يُّتِمَّ" یہ دو لفظ ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مدت رضاعت صرف دو سال ہے۔ اب اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال ہے۔ اس لیے امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ اکثر مدت رضاعت تو ہے دو سال لیکن اگر کوئی بچہ دو سال کے بعد اور اڑھائی سال میں دودھ پی لے تو ہم رضاعت کی مدت تو اسے نہیں کہتے لیکن چونکہ اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے اس لیے جب مسئلہ حرمت رضاعت کا آجائے گا تو وہاں مدت اڑھائی سال بتائی جائے یعنی اگر کوئی پوچھے کہ فلاں لڑکی ہے اس نے فلاں عورت کا دودھ پیا ہے اور میں نے بھی اس عورت کا دودھ پیا ہے تو حرمتِ رضاعت کب تک ہو گی؟ تو اس سے پوچھا جائے کہ اس وقت تمہاری عمر کتنی تھی؟ کہا کہ جی! سوا دو سال، تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ مدت رضاعت تو گزر گئی ہے لہذا نکاح حلال ہونا چاہیے تھا لیکن چونکہ اڑھائی سال کی ایک شق بھی نکلتی ہے اس لیے احتیاط یہی ہے کہ وہاں مدتِ رضاعت اڑھائی سال مان لو تاکہ حرمتِ رضاعت میں احتیاط ہو جائے۔ تو امام صاحب اکثر مدت رضاعت دو سال ہی مانتے ہیں اور اڑھائی سال یہ مدتِ رضاعت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ حرمتِ رضاعت کے مسئلہ میں اڑھائی سال کو احتیاطاً استعمال فرماتے ہیں۔

کُرْهًا اور کَرْهًا میں فرق:

یہاں لفظ ہے "کُرْهًا"، جو شخص از خود مشقت برداشت کرے اسے کُرْهًا کہتے ہیں۔ ماں جو مشقت برداشت کرتی ہے وہ کسی کے مجبور کرنے سے نہیں بلکہ بذات خود برداشت کرتی ہے، اور جو شخص کسی کے مجبور کرنے کی وجہ سے مشقت برداشت

کرے تو اسے کَرْھًا کہتے ہیں۔ جیسے "لَآ اِکْرَاهَ فِي الدِّيْنِ"[156] یہ کَرْھًا سے ہے۔

جنات کا مسلمان ہونا:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾﴾

اور جب ہم نے جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا تھا تاکہ وہ آپ سے قرآن سنیں۔ جب جنات آپ کے پاس آئے تھے تو آپس میں کہنے لگے کہ خاموش رہو۔ جب تلاوت مکمل ہو چکی تو یہ جنات اپنی قوم کے پاس چلے گئے انہیں ڈراتے ہوئے۔

نزولِ قرآن سے پہلے جنات اوپر جاتے تھے اور کچھ خبریں سنتے تھے۔ پھر اس میں جھوٹ ملا کر کاہنوں کو بتاتے تھے۔ نزولِ قرآن کے بعد جب وہ اوپر جاتے تو ان کو شہاب ثاقب لگے اور خبریں آنا بند ہو گئیں۔ انہوں نے بیٹھ کر مشورہ کیا کہ وجہ کیا بنی ہے؟ تو مشرق، مغرب، شمال، جنوب تمام اطراف میں جنات دوڑے کہ پتا تو چلے اس کا سبب کیا ہے؟! اسی تلاش میں تھے کہ ان کی ایک جماعت بطنِ نخلہ میں تلاش کرتے کرتے آ پہنچی۔ اس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چند صحابہ کو بطن نخلہ میں فجر کی نماز پڑھائی۔ بطن نخلہ سے آگے مقام عکاظ میں ایک میلہ لگتا تھا جس میں دکانیں بھی تھیں اور لوگ دور دراز سے اس بازار میں آتے اور خرید و فروخت کرتے تھے۔ غالباً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کے اس بازار میں دعوت دینے کے لیے جانا چاہتے ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے تو جنات کی جو جماعت شہابِ

156۔ البقرۃ 256:2

ثاقب لگنے کی وجہ تلاش کر رہی تھی اس نے قرآن سن لیا۔ اس وقت ان کو سمجھ آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن اتر رہا ہے، جو وحی آرہی ہے اسی وجہ سے ہمیں اوپر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ یہ جنات قرآن سننے کے بعد واپس چلے گئے۔ جا کر اطلاع دی اور یہ مسلمان ہو گئے۔ ابھی تک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں نہیں تھا۔ جب سورۃ الجن نازل ہوئی تو پھر پتا چلا کہ میرے قرآن سننے کی وجہ سے بہت سارے جنات مسلمان ہو چکے ہیں۔

جنات کی دعوت:

ان جنات نے واپس جا کر اپنے لوگوں کو دعوت دی، کہا:

﴿يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣١﴾﴾

اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلانے والے کی بات کو مان لو، اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں کو معاف فرمادے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔

یہاں "يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ" نہیں فرمایا بلکہ "يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ" فرمایا ہے۔ یہ "مِنْ" تبعیضیہ ہے، یہ بتانے کے لیے کہ سارے گناہ ایمان لانے سے معاف نہیں ہوتے، حقوق العباد باقی رہ جاتے ہیں، حقوق اللہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد ایمان لانے سے بھی معاف نہیں ہوتے بلکہ ان کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ ہاں صرف شہید کے بارے میں ایک حدیث میں ہے کہ اگر بندہ شہید ہو جائے اور اس پر کوئی حق ہو تو اللہ اپنے خزانے سے وہ حق ادا فرمائیں گے اور شہید کی خلاصی ہو جائے گی۔ یہ ایک روایت میں موجود ہے۔

اولو العزم انبیاء علیہم السلام کی طرح صبر کیجیے!

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے فرمایا: آپ ان کی تکلیفوں پر صبر کریں اور ایسے صبر کریں جیسے اولو العزم انبیاء علیہم السلام نے صبر کیا تھا۔

یہاں "مِنَ الرُّسُلِ" میں مِنْ تبعیضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے کیونکہ جتنے انبیاء علیہم السلام ہیں سارے اولو العزم ہیں، کوئی نبی ایسا نہیں جو صاحبِ عزیمت نہ ہو۔ ہاں عزیمت کے درجات ہیں، اس لیے انبیاء کے بھی درجات ہیں۔ عام طور پر جب فن تفسیر میں اولو العزم انبیاء علیہم السلام کہا جائے تو ان سے مراد وہ پانچ نبی ہوتے ہیں جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾[157]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ تو یہاں بھی اس کا معنی یہی ہے کہ جیسے یہ انبیاء علیہم السلام صاحبِ عزیمت تھے تو آپ بھی اسی طرح رہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں قرآن سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

157۔ الاحزاب 7:33

سورۃ محمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ﴿۱﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۙ کَفَّرَ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ اَصۡلَحَ بَالَہُمۡ ﴿۲﴾﴾

سورت محمد کا ایک نام سورت قتال بھی ہے کیونکہ اس میں جہاد کا تذکرہ بہت زیادہ ہے۔

کفار اور مؤمنین کا انجام:

فرمایا: جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکا تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ نازل ہوا اس پر ایمان لائے، ﴿وَّ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ﴾ اور جو کچھ رب کی طرف سے نازل ہوتا ہے وہ برحق ہے۔ تو ان ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں کے اللہ گناہ معاف فرما دیتا ہے اور ان کے احوال کو بھی ٹھیک کر دیتا ہے۔

﴿وَ اَصۡلَحَ بَالَہُمۡ﴾.... محاوراتِ عرب میں بال حالت کو بھی کہتے ہیں اور

دل کو بھی کہتے ہیں۔ اگر بال سے مراد دل ہو تو معنی یہ ہو گا کہ اللہ ان کے دلوں کی اصلاح فرماتے ہیں اور اگر بال سے مراد احوال ہوں تو پھر معنی ہو گا کہ اللہ ان کے حالات کو درست فرمادیتے ہیں۔

جنگی قیدیوں کا حکم (ایک تعارض کا حل:)

﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا﴾

یہاں اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ جب جنگ ختم ہو جائے اور لوگ قید ہو جائیں تو پھر ان کے بارے میں دو اختیار ہیں؛ چاہیں تو ان قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کر دیں اور اگر چاہیں تو بغیر فدیہ لیے آزاد کر دیں۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے لیکن سورۃ الانفال کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی نہیں بلکہ ان کو قتل کرنا ہے۔

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰي حَتّٰي يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ﴾

جب بدر کے قیدی گرفتار ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کیا کہ ان کا کیا کریں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے رشتہ دار میرے حوالے کریں، صدیق کے رشتہ دار ان کے حوالے کریں، عثمان کے رشتہ دار ان کے حوالے کریں کہ اپنے اپنے رشتہ دار کو لیں اور ان کی گردنیں کاٹ دیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ ان کو آزاد کر دینا چاہیے شاید یہ کلمہ پڑھ لیں اور ان کی نسلیں آگے اسلام قبول کر لیں۔ باقی جو شہید ہو گئے ہیں تو وہ جنت میں جائیں گے، یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مزاج تھا۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا۔ اس پر قرآن کریم کی یہ

آیات اتریں ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾﴾ اور تنبیہ کی گئی کہ پیغمبر کو یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کا عذاب آ جاتا تو حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذ کے علاوہ کوئی نہ بچتا۔ اللہ نے کرم کیا کہ خدا کا عذاب نازل نہیں ہوا۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ قیدی کو آزاد کرنا جائز نہیں بلکہ اسے قتل کیا جائے۔ تو بظاہر ان دونوں آیت میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ حاکم وقت کو چار اختیار ہیں:

1: جب لوگ قیدی ہو جائیں چاہے تو ان کو قتل کر دے۔

2: ان کو غلام بنا دے۔

3: فدیہ لے کر ان کو آزاد کر دے، اور فدیہ میں پیسے بھی ہیں اور قیدیوں کا تبادلہ بھی ہے یا فدیہ میں کوئی بھی چیز رکھ لیں۔

4: فدیہ کے بغیر آزاد کریں اور کچھ بھی نہ لیں۔

حاکم کو یہ چار اختیار ہیں۔ جنگِ بدر کے موقع پر یہ بات سخت اس لیے تھی کہ ابھی مسلمان کمزور تھے، طاقت میں نہیں تھے اور طاقت ور کفر گرفتار ہوا تھا۔ منشا یہ تھی کہ ان کو قتل کریں تاکہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے اور جب اسلام طاقت میں ہو تو پھر اہلِ اسلام کو پورا اختیار ہے کہ جو بھی صورت اختیار کریں جائز ہے۔ تو حاکمِ وقت کو چاروں اختیار ہیں۔ دو وہاں سے ثابت ہیں اور دو یہاں سے ثابت ہیں۔

مشروعیتِ جہاد کی حکمت:

﴿وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ﴾

یہاں اللہ رب العزت نے جہاد کی ایک حکمت بیان فرمائی ہے۔ پہلی قوموں پر عذاب آجاتا تو وہ قومیں تباہ ہوجاتیں۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم آج بھی چاہیں تو عذاب دے کر تباہ کر سکتے ہیں لیکن ان کو عذاب دے کر تباہ کرنے کے بجائے ہم نے جہاد کا حکم دے دیا ہے ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ﴾ یہ بھی عذاب کی ایک شکل ہے لیکن اس میں حکمت کیا ہے؟ اس میں حکمت یہ ہے ﴿وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ﴾ کہ اللہ امتحان لیتا ہے مسلمانوں کا کہ یہ اپنا مال اور جان اللہ کے راستہ میں پیش کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر مجرمین پر خدا کا عذاب آسمان سے آتا اور وہ تباہ ہوجاتے تو مسلمانوں کا یہ امتحان نہ ہوتا۔ ایک مقصد تو مسلمانوں کا امتحان ہے۔

دوسرا فائدہ کہ اس میں کافر کا امتحان ہے کہ کافر میدانِ جنگ میں فتوحات کو دیکھ رہا ہے، اللہ کی مدد مسلمانوں کے ساتھ دیکھ رہا ہے، اب اس مدد کو دیکھ کر وہ کلمہ پڑھتا ہے یا نہیں؟ تو اس میں ہم نے دونوں کا امتحان رکھنا تھا۔

شہداء کے انعامات:

﴿وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝﴾

پھر وہ مسلمان جو میدانِ جنگ میں قتل ہوجائیں تو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ نے یہاں پر ان کے انعامات کا ذکر کیا ہے:

[1]: ﴿فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ﴾ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ فاتح بننا اور قاتل بننا اصل ہے اور مقتول ہوجائے تو بندہ ختم ہوگیا۔ فرمایا: اس نے جہاد کیا ہے اور مقتول ہوا ہے تو ہم اس کا اجر اس کو دیں گے اور ان کے اعمال کو ضایع نہیں کریں گے۔

[2]: ﴿سَيَهْدِيْهِمْ﴾ اور ان کی رہنمائی جنت کی طرف کریں گے کہ یہ بندہ جنت میں جائے گا۔

[3]: ﴿وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ﴾ کہ ان کے دل یا ان کے احوال کی اصلاح کر دیں گے۔

[4]: ﴿وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ﴾ کہ اللہ انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے۔

پہلے جو گزرا ﴿سَيَهْدِيْهِمْ﴾ تو اس کا معنی بھی جنت کا راستہ ہے اور یہاں ﴿وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جنت میں داخل کرنے کے بعد مزید انعام بھی عطا فرمائیں گے۔ اور فرمایا: ﴿عَرَّفَهَا لَهُمْ﴾ کہ جنت میں جانے والا ہر چیز کو ایسے پہچانے گا جیسے دنیا میں رہ کر اپنے گھر کو پہچانتا ہے۔

اب دیکھو! ایک آدمی کی سو حوریں ہیں اور اچانک اسے دی جائیں تو اس کو تو نام ہی نہیں آتے لیکن اللہ ماحول ایسا بنا دیں گے کہ وہ سمجھے گا کہ یہ میرا مکان ہے، یہ میرا گھر ہے جس طرح آدمی دنیا میں رہتے ہوئے اپنی بیوی کو پہچانتا ہے، اپنے گھر کو پہچانتا ہے، اپنا مقام سمجھتا ہے، اسی طرح جب جنت میں جائے گا تو اپنا گھر، اپنا مکان اور اپنی بیوی ہر چیز کو پہچانتا ہو گا۔ ﴿وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ﴾ کا معنی یہی ہے۔

اللہ ایمان والوں کا دوست ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے کہ یہ دیکھ لیتے کہ

ان سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کا انجام کیسا ہوا؟! اللہ نے ان کو تباہ کر دیا اور ان کافروں کے لیے بھی اسی طرح کا عذاب ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت ایمان والوں کے مولیٰ ہیں اور کفار کا کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

یہاں یہ فرمایا کہ اللہ ایمان والوں کا مولیٰ ہے، کفار کا مولیٰ نہیں ہے حالانکہ دنیا میں کفار کے بھی مولیٰ ہوتے ہیں۔ دراصل یہاں مولیٰ حقیقی مراد ہے کہ حقیقی مالک اور مولیٰ مسلمان کو ملا ہے اور حقیقی مالک اور مولیٰ کفار نے چھوڑ دیا ہے، اس لیے اللہ کو چھوڑ کر ان کفار کے پاس کوئی مولیٰ نہیں ہے۔

عالم کو "مولانا" کہنا درست ہے:

یہاں جو بات سمجھنی ہے وہ صرف یہ کہ ابھی ایک نیا فتنہ رونما ہوا ہے، بات چل رہی ہے کہ کسی عالم کو "مولانا" کہنا ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ "مولا" تو کہتے ہیں اللہ کو جیسے یہاں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ تو عالم کیسے "مولانا" ہو گیا؟ اس لیے عالم کو مولانا نہیں کہنا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "مولا" کا معنی ایک نہیں ہے، مولا کے چھبیس کے لگ بھگ معانی ہیں اور خود قرآن کریم نے مولا کے لفظ کو کئی معنوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ جس قرآن کی آیت آپ پیش کرتے ہیں کہ اس میں "مولا" اللہ کو فرمایا گیا ہے اسی قرآن کریم میں "مولا" کا لفظ اللہ کے علاوہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

- آپ دیکھیں کہ سورۃ التحریم میں ہے: ﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ﴾[158] کہ

158۔ التحریم 4:66

پیغمبر کا مولا اللہ ہے، "وَ جِبْرِيْلُ" اور جبرائیل بھی نبی کا مولا ہے، "وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ" اور نیک صالح مومنین بھی نبی کے مولا ہیں، "وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ" اور اس کے علاوہ باقی ملائکہ بھی نبی کی مدد کے لیے موجود ہیں۔

تو اس آیت میں تو "مولا" جبرائیل علیہ السلام کو بھی کہا گیا ہے، ایمان والوں کو بھی فرمایا گیا ہے اور "مولا" بھی نبی کا فرمایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا کا معنی صرف آقا نہیں ہوتا بلکہ مولا اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

♦ جس طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ"[159]

اب دیکھو! یہاں "مولا" کا لفظ دوستی کے معنی میں ہے لیکن بعض لوگوں نے یہاں "مولا" کا معنی خلیفہ لے لیا ہے حالانکہ یہاں "مولا" کا معنی دوستی ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھانا چاہتے ہیں کہ جو مجھ سے محبت کرنا چاہتے ہیں وہ میرے علی سے محبت کریں، جو مجھ سے دوستی رکھتا ہے تو وہ علی سے بھی دوستی رکھے، علی میرا محبوب ہے۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں یہ بات سمجھائی۔

خلاصہ یہ ہے کہ "مولا" کا ایک معنی نہیں ہے، مولا کے کئی معانی ہیں۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ "مولا" اضداد میں سے ہے یعنی "مولا" ایسا لفظ ہے کہ جس کے متضاد معانی ہیں۔ مولا کا معنی آقا بھی ہے اور مولا کا معنی غلام بھی ہے۔ یہ جو ایک لفظ "موالی" ہے یہ مولا کی جمع ہے اور مولا مالک کو بھی کہتے ہے اور غلام کو بھی کہتے ہیں۔

تو ہمارے ہاں جو اہلِ علم کے لیے "مولانا" کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اصل لفظ

159۔ سنن الترمذی، رقم: 3713

ہے ”مولوی“ یہ نسبت مولا حقیقی کی طرف ہے کہ یہ اللہ والا ہے اور جب ہم کسی کو کہیں ”مولانا“ تو یہاں مولانا کا معنی یہ نہیں ہے کہ یہ اللہ ہے، بلکہ ہمارے ہاں مولانا کا لفظ عزت کا لفظ سمجھا جاتا ہے اور علماء کرام کے لیے یہ لفظ ہمارے معاشرے کی ایک اصطلاح بن چکا ہے۔ آپ دیکھیں کہ ایک بندہ ہمارا مخالف ہوتا ہے اور ہم اسے بھی مولانا کہہ رہے ہوتے ہیں، اس کو عزت ہم اس معنی میں تھوڑا دیتے ہیں کہ ہمارا سردار ہے، ایسا نہیں ہوتا لیکن چونکہ عرف میں یہ ایک محاورہ بن گیا کہ مولوی کے لیے مولانا کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اہلِ حق ہو تو اسے بھی مولانا کہہ دیتے ہیں اور اہلِ باطل ہو تو اسے بھی مولانا کہہ دیتے ہیں جس سے مقصود کوئی خاص معنی نہیں ہوتا، صرف اتنا مقصد ہوتا ہے کہ یہ لفظ ”مولانا“ عالم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور عرف میں یہ بات آ گئی ہے۔

جنت کی نہریں:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۥ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ﴾

یہاں اللہ رب العزت نے جنت کی چار نہروں کا ذکر فرمایا ہے:

[1]: پانی کی نہر جو بالکل صاف ہو گی۔

[2]: دودھ کی نہر جس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہو گا۔

[3]: شراب کی نہر جو لذت والی ہو گی، کڑوی نہیں ہو گی، بدبودار نہیں ہو گی۔

[4]: شہد کی نہر جو بالکل صاف ستھری ہو گی۔

یہ نہریں جنت میں جاری فرمائیں گے۔ وہ جنت کا ماحول ہو گا، دنیا میں تھوڑی

دیر دودھ پڑا رہے تو پھٹ جاتا ہے، فرمایا وہاں ایسا نہیں ہو گا، اور یہاں دنیا میں شہد نکالتے ہیں تو کبھی شہد میں کوئی چھتا ملا ہوتا ہے، کبھی کوئی اور چیز ملی ہوتی ہے لیکن جنت کے شہد کے بارے میں فرمایا کہ وہاں کا شہد بالکل خالص ہو گا، ایسا شہد نہیں ہو گا جیسا ہم دنیا میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں دنیا میں شراب ہوتی ہے تو شراب میں بو بھی ہوتی ہے اور کڑواہٹ بھی ہوتی ہے، لوگ پھر بھی پیتے ہیں لیکن وہاں کی شراب کڑوی نہیں ہو گی، اس میں بدبو نہیں ہو گی، وہاں صرف لذت ہی لذت ہو گی۔ دنیا میں جو پانی ہے کبھی اس کا رنگ بدل جاتا ہے، کبھی ذائقہ بدلتا ہے لیکن وہاں کا پانی ایسا ہو گا کہ جس میں یہ تبدیلیاں نہیں ہوں گی، بالکل صاف اور شفاف پانی ہو گا۔ اللہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ آمین

علاماتِ قیامت کا بیان:

﴿فَهَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنۡ تَاۡتِيَهُمۡ بَغۡتَةً ۚ فَقَدۡ جَآءَ اَشۡرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمۡ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ ذِكۡرٰىهُمۡ ﴿۱۸﴾﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ قیامت کے منتظر ہیں کہ قیامت آئے گی تو پھر بات مانیں گے؟! اگر یہی بات ہے تو سن لیں کہ قیامت ضرور آئے گی لیکن علاماتِ قیامت تو آچکی ہیں اور جب خود قیامت آئے گی تو ان کو نصیحت حاصل کرنے کا موقع کہاں ملے گا؟ اس وقت تو انہیں نصیحت سے کوئی نفع نہیں ملے گا۔

علاماتِ قیامت میں سب سے بڑی علامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف لانا ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، بس قیامت تک کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آجانا علامت ہے کہ اب قیامت آئے گی۔ اس لیے قیامت کا انتظار نہ کرو بلکہ قیامت کی علامات دیکھ کر راہِ راست پر آجاؤ اور آخرت کی

تیاری کرلو۔

سورۃ القمر میں ہے:﴿اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انۡشَقَّ الۡقَمَرُ ۝۱﴾[160] کہ قیامت قریب آگئی ہے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ چاند کے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ایک نشانی تو قرآن میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ قیامت کی اور بھی علامات ایسی ہیں جو قرآن کریم میں ہیں اور بہت ساری علامات ایسی ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔

صحیح البخاری کتاب النکاح میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ کہ علاماتِ قیامت میں سے ہے کہ علم اٹھ جائے گا، "وَيَكْثُرَ الْجَهْلُ" اور جہل بہت زیادہ ہو جائے گا، حقیقی علم ختم ہو جائے گا اور جہالت عام ہو جائے گی، "وَيَكْثُرَ الزِّنَا" زنا بہت ہو گا، "وَيَكْثُرَ شُرْبُ الْخَمْرِ" اور لوگ شراب بہت زیادہ پئیں گے، "وَيَقِلَّ الرِّجَالُ" مرد بہت قلیل ہوں گے، "وَيَكْثُرَ النِّسَاءُ" عورتیں بہت زیادہ ہوں گی، "حَتَّى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ" پچاس عورتوں کا کفیل ایک مرد ہو گا۔[161]

یعنی ایک آدمی کی کفالت میں پچاس عورتیں ہوں گی؛ بیٹیاں ہیں، نواسیاں ہیں، بھانجیاں ہیں اس طرح کر کے پچاس پچاس عورتوں کا کفیل ایک مرد ہو گا۔ یہ علاماتِ قیامت میں سے ہیں۔

سنن الترمذی ابواب الفتن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت

160۔ القمر 1:54

161۔ صحیح البخاری، رقم: 5231

ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"إِذَا اتُّخِذَ الْفَيْءُ دُوَلًا" جب غنیمت کے مال کو اپنا ذاتی مال سمجھ لیا جائے، "وَالْأَمَانَةُ مَغْنَمًا" اور امانت کو غنیمت سمجھ کر اس کو اپنے لیے حلال سمجھنا شروع کر دیا جائے، "وَالزَّكٰوةُ مَغْرَمًا" اور زکوٰۃ کو ٹیکس کی طرح بوجھ سمجھنا شروع کر دیا جائے، "وَتُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّينِ" دین پڑھا جائے دنیا کے لیے، مال کمانے کے لیے، عزت حاصل کرنے کے لیے، "وَأَطَاعَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهٗ وَعَقَّ أُمَّه" آدمی بیوی کی باتیں مانے اور ماں کی نافرمانی کرے، "وَأَدْنٰى صَدِيْقَهٗ وَأَقْصٰى أَبَاهُ" بندہ اپنے والد کو دور کرے اور دوستوں کو قریب کرے، "وَظَهَرَتِ الْأَصْوَاتُ فِي الْمَسَاجِدِ" اور مساجد میں اونچی آواز سے باتیں شروع ہو جائیں، "وَسَادَ الْقَبِيْلَةَ فَاسِقُهُمْ" اور قوم کا سردار ان میں بدترین فاسق آدمی ہو، "وَكَانَ زَعِيْمُ الْقَوْمِ أَرْذَلَهُمْ" قوم پر کمینہ آدمی مسلط ہو جائے، "وَأُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ" کسی آدمی کی عزت اس وجہ سے کی جائے کہ عزت نہ کریں تو یہ ہمیں نقصان دے گا، اس کے شر سے بچنے کے لیے اس کی عزت کی جائے، "وَظَهَرَتِ الْقَيْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ" گانے والی عورتیں بہت ہو جائیں اور گانے کے آلات؛ ڈھول، سرنگی وغیرہ عام ہو جائیں، "وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ" اور شراب بہت زیادہ پی جانے لگے، "وَلَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَوَّلَهَا" بعد کے لوگ پہلے والے لوگوں پر لعنتیں بھیجیں، "فَلْيَرْتَقِبُوْا عِنْدَ ذٰلِكَ رِيْحًا حَمْرَآءَ" اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو فرمایا کہ پھر تم انتظار کرو سرخ آندھیوں کا، "وَزَلْزَلَةً وَخَسْفًا وَمَسْخًا وَقَذْفًا" زلزلے کا، زمین میں دھنس جانے کا، شکل بدلنے کا، آسمان سے پتھر برسنے کا، "وَآيَاتٍ تَتَابَعُ كَنِظَامٍ بَالٍ قُطِعَ سِلْكُهٗ فَتَتَابَعَ" اور اس طرح کی نشانیوں کا جو اس ہار کی لڑی کی طرح مسلسل ظاہر ہوں گی جس کا دھاگہ ٹوٹ جائے اور اس کے دانے

مسلسل گرنے لگیں، یعنی ان حالات کے بعد علامت پہ علامت یوں ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔[162]

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

بد بختی کی انتہا:

بعض لوگ دنیامیں اتنے بدبخت ہیں کہ ان کی بد بختی کی بھی انتہا ہے یعنی بندے کو ان کی باتیں سن کر افسوس ہوتا ہے۔لوگ غلط کام کرتے ہیں جب پوچھا جائے کہ یہ کام کیوں کرتے ہیں؟ تو جواب پتاہے کیا دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم یہ کام اس لیے کرتے ہیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سچی ہو جائے کیونکہ اللہ کے نبی نے فرمایا کہ قیامت کے قریب ایسے ایسے کام ہوں گے۔ العیاذ باللہ، ان لوگوں کی جرأت کی بھی انتہا ہے۔

میں نے کہا: پیغمبر کے ارشادات ہیں کہ جو ایسے کام کریں گے وہ جہنم میں جائیں گے تو کیا آپ جہنم والے کام بھی کریں گے کہ جن سے بندہ جہنم میں جائے گا تاکہ پیغمبر کی حدیث سچی ہو جائے؟! عجیب باتیں کرتے ہیں بھائی! اگر علاماتِ قیامت میں سے یہ علامت ہے کہ لوگ زنا کریں گے تو یہ بھی تو ہے نا "لَنْ تَزَالَ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ عَلٰى مَنْ نَاوَأَهُمْ "[163]

کہ قیامت تک مسلمانوں کا ایک طبقہ حق پر قائم ہو کر باطل سے لڑتا رہے گا۔ تو آپ برے کام کرنے کے بجائے نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ! شامل ہونا ہے تو ہم اس میں شامل ہو جائیں تاکہ ہم اچھی علامت والوں میں شامل ہوں، بری

162۔ جامع الترمذی، رقم: 2211

163۔ مسند احمد: ج15 ص69 رقم الحدیث: 19781

علامات میں ضرور شامل ہونا ہے؟!

آپ بد بختی کی انتہا دیکھیں اور اس پر شیطان نے کیسے ان کو مطمئن کر رکھا ہے کہ ہم اس لیے یہ کام کرتے ہیں کہ ہمارے نبی نے فرمایا۔

سلسلہ چشتیہ کے ذکر پر اشکالات کے جوابات:

﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعۡلَمُ مُتَقَلَّبَكُمۡ وَ مَثۡوٰىكُمۡ ﴿۱۹﴾﴾

اے پیغمبر! آپ کو اس بات کا علم ہونا چاہیے!- نبی کو خطاب کر کے ہمیں بتایا کہ یہ بات تمہارے بھی علم میں ہونی چاہیے- کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

یہاں یہ بات سمجھیں! ہمارے ہاں جو سلسلہ چشتیہ میں ذکر ہوتا ہے وہ بارہ تسبیحات پر مشتمل ہے:

- دو تسبیحات ذکر نفی و اثبات یعنی "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ"
- چار تسبیحات ذکر اثبات یعنی "إِلَّا اللّٰهُ"
- چھ تسبیحات ذکرِ اسم ذات دو ضربی یعنی "اللّٰهُ اللّٰه"
- اور پھر ایک تسبیح اسم ذات یک ضربی "اللّٰهُ"

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ بظاہر یہ تیرہ تسبیحات بنتی ہیں لیکن کہتے بارہ ہیں، یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی حافظ تراویح میں قرآن مجید ختم کرتا ہے، قرآن مجید "وَ النَّاسِ" پہ ختم ہوتا ہے تو وہ پھر شروع کرتا ہے اور ﴿الٓمّٓ ﴿۱﴾﴾ سے ﴿وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ تک پڑھتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ حافظ صاحب نے قرآن کریم ختم کیا ہے، کبھی کوئی کہتا ہے کہ حافظ صاحب نے قرآن مجید بھی ختم کیا ہے اور سورۃ البقرۃ کا پہلا رکوع بھی ختم کیا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) کوئی بھی نہیں

کہتا۔ تو وہاں کہتے یہی ہیں کہ قرآن ختم کیا ہے حالانکہ ایک رکوع مزید بھی پڑھا ہوتا ہے۔ یہ جو ایک رکوع مزید پڑھتے ہیں یہ تفاؤلاً ہوتا ہے کہ میں نے دوبارہ پھر پڑھنا ہے۔ تو سلسلہ چشتیہ میں بارہ تسبیحات کے بعد جو ایک سو مرتبہ پھر اللہ اللہ کہتے ہیں تو یہ بھی تفاؤلاً ہوتا ہے کہ میں نے اللہ اللہ کو بڑھانا ہے۔ اللہ توفیق عطا فرمائے تو اس تسبیح کو جتنا بڑھانا چاہیں ایک ہزار دو ہزار جتنا بڑھا سکیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس پر ایک اعتراض یہ ہے کہ تم نے کلمہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ" کو کاٹ دیا ہے اور یہ جائز نہیں ہے۔ یہ آج ایک معروف اعتراض چل رہا ہے۔ میں اس بار جب ملائیشیا کے دورہ پر تھا تو باضابطہ انہوں نے مجھ سے ریکارڈنگ کروائی کہ اس اعتراض کا جواب دیں دلائل کی روشنی میں۔ میں نے کہا کہ اس کی تقطیع ہم نے نہیں کی یہ تو خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اب دیکھو کلمہ ہے: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ" یہاں سورۃ محمد کی اس آیت میں ہے: ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ﴾ اور سورۃ الفتح میں ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ﴾ تو کلمہ کے دو شق تو قرآن میں موجود ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں ہے: ﴿قُلِ اللهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾﴾[164] یہاں صرف لفظ "اللہ" ہے، اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہے۔

اور حدیث پاک میں ہے:

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اَللّٰه اَللّٰه.[165]

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہا جائے گا!

164۔ الانعام 91:6

165۔ سنن الترمذی، رقم: 2207

یہاں دیکھو! اللہ اللہ ہے۔ تو مختلف انداز سے تقطیع تو قرآن کریم اور احادیث میں موجود ہے، یہ ہم نے نہیں کی اور دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح قاری صاحب بچے کو قرآن کریم پڑھانے کے لیے ایک لفظ بار بار یاد کراتے ہیں مثلاً ”ذٰلِكَ الْكِتٰبُ .... ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ... ذٰلِكَ الْكِتٰبُ“ تو کوئی بھی نہیں کہتا کہ اس نے تقطیع کی ہے وہ سمجھتا ہے کہ بچے کو ہم نے ایک ایک حرف یاد کرانا ہے تو پوری آیت آسان ہو جائے گی۔ اسی طرح مکمل کلمہ کا نقشہ ذہن میں بٹھانے کے لیے بسا اوقات سالک کو تقطیعِ کلمہ کر کے کچھ اجزاء بتا دیتے ہیں، پھر دوسرا اجزء، پھر تیسرا اجزء... تاکہ اچھی طرح ایک ایک جزء اس کے دل میں پیوست ہو جائے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پوری صحیح البخاری میں تقطیعِ حدیث کرتے ہیں، کوئی بھی ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ اعتراض صرف اس پر ہے کہ تم نے کلمہ کے کئی حصے کیوں کیے؟ اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائے۔

عصمت انبیاء پر اشکال کا جواب:

﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾

اے پیغمبر! آپ اللہ سے معافی مانگیں اپنے ان معاملات کی جو آپ کی شان کے لائق نہیں تھے اور ایمان والے مردوں کے لیے اور ایمان والی عورتوں کے لیے۔

اس پر میں نے تفصیل سے بات کی ہے کہ جب ذنب کا لفظ نبی کے لیے استعمال ہو تو معنی اور ہوتا ہے اور ذنب کا لفظ جب امتی کے لیے استعمال ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی معصوم ہے۔ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم گناہ کرتے ہیں تب ہی تو اللہ فرما رہے ہیں: ﴿وَاسْتَغْفِرْ

لِذَنْۢبِكَ﴾ کہ اپنے گناہ کی معافی مانگیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح لفظ محبت کی نسبت اور اضافت سے معنی بدل جاتا ہے کہ محبت ماں سے ہو تو معنی اور ہے، محبت بہن سے ہو تو معنی اور ہے، محبت بیٹی سے ہو تو معنی اور ہے، محبت بیوی سے ہو تو معنی اور ہے، اور اگر محبت نامحرم عورت سے ہو تو معنی اور ہے اسی طرح ذنب کی نسبت جب امت کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے اور جب پیغمبر کی طرف ہو تو معنی اور ہوتا ہے۔

پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنب کی نسب ہو تو اس کا ایک معنی یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اجتہادات کہ جن پر بعد میں وحی آجاتی ہے کہ یہ اجتہاد ٹھیک نہیں تھا تو اس اجتہادی خطا کو بسا اوقات ذنب کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی سمجھ لیں کہ کبھی صواب کے مقابلہ میں خطا آتا ہے اور کبھی صواب کے مقابلہ میں باطل آتا ہے۔ جب صواب بمقابلہ باطل ہو تو صواب پر اجر ہے اور باطل پر اجر نہیں اور اگر صواب بمقابلہ خطا ہو تو اب صواب کا معنی ہے ڈبل جنت اور خطا کا معنی ہے سنگل جنت۔ صواب کا معنی بڑی جنت اور خطا کا معنی چھوٹی جنت۔ تو نبی سے جب اجتہادی خطا ہو جائے تو اس اجتہادی خطا کو بسا اوقات ذنب سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

نبی اور امتی کے اجتہاد میں فرق:

اب ایک خطا وہ ہے جو مجتہد امتی کی ہے اور ایک خطا وہ ہے جو مجتہد نبی کی ہے۔ پیغمبر کی اجتہادی خطا اور مجتہد امتی کی اجتہادی خطا میں فرق ہے کہ مجتہد امتی سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ خطا پر باقی رہتا ہے اور پیغمبر سے اجتہاد میں خطا ہو بھی جائے تو پیغمبر کو اللہ خطا پر باقی نہیں رہنے دیتے، وحی کے ذریعہ اس خطا کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے کہ جیسے ایک آیت پہلے اور ایک بعد میں ہو، پہلی منسوخ اور دوسری ناسخ۔ ایک حدیث پہلے کی منسوخ اور ایک بعد کی ناسخ۔ تو پیغمبر کی اجتہادی

خطا یہ حدیثِ منسوخ کی طرح ہے اور بعد کی جو احادیث آتی ہیں وہ اس کے لیے ناسخ بن جاتی ہیں۔

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ذنب کا معنیٰ گناہ نہیں ہے بلکہ ذنب کی نسبت نبی کی طرف ہو تو اس کا ایک معنیٰ ایسا اجتہاد ہے کہ جس میں خطا واقع ہوئی ہو تو آپ اس پر بھی اللہ سے معافی مانگیں۔

علمِ باری تعالیٰ:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ۝۱۹﴾

اس میں بندے کے سارے احوال اور سارے افعال اور سارے مقام آ گئے۔ اللہ جانتے ہیں تمہاری ان جگہوں کو جو عارضی ہیں اور ان جگہوں کو جو مستقل ہیں، اللہ جانتے ہیں ان حالات کو جو عارضی ہیں اور جانتے ہیں ان حالات کو جو مستقل ہیں۔ تو ساری چیزیں؛ احوال واعمال اور مقامات سب اس میں آ گئے ہیں۔

﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝۲۰﴾

اور جو لوگ اہلِ ایمان ہیں وہ کہتے رہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی تاکہ ہمارا ایمان تازہ ہو اور نئے احکام آئیں تو ان کا ثواب بھی حاصل کریں لیکن جب کوئی ایسی سورت نازل ہوتی ہے جس کے معنیٰ واضح ہوں اور اس میں جہاد کا بھی ذکر ہو تو اے پیغمبر! اس سورت کے نازل ہونے پر منافقین آپ کی طرف اس طرح تکتے ہیں جیسے وہ شخص تکتا ہے جس پر موت کی بیہوشی طاری ہو رہی ہو۔ بڑی خرابی ہے ان منافقین کے لیے۔

کفار کے لیے وعید:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدٰی ۙ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیۡئًا ؕ وَ سَیُحۡبِطُ اَعۡمَالَہُمۡ ﴿۳۲﴾﴾

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا اور ہدایت کا راستہ واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کی تو ایسے لوگ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ایسے لوگوں کے اعمال تباہ ہو جائیں گے۔

اس وعید کا مصداق ہر وہ کافر ہے جو شریعت کے راستے سے روکتا ہے لیکن بطور خاص اس سے مراد بنو قریظہ اور یہود ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے جنگِ بدر کے موقع پر مشرکین مکہ کی بہت مدد کی، ان میں بارہ لوگ ایسے کھڑے ہو گئے کہ جنہوں نے کہا کہ ہر روز تمام کفار کا کھانا ہم پکائیں گے، ایک آدمی نے پورے دن کا کھانا اپنے ذمے لیا۔

جائز اور ناجائز صلح جائز کی تفصیل:

﴿فَلَا تَہِنُوۡا وَ تَدۡعُوۡۤا اِلَی السَّلۡمِ ٭ۖ وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ ٭ۖ وَ اللّٰہُ مَعَکُمۡ وَ لَنۡ یَّتِرَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ ﴿۳۵﴾﴾

یہاں مسلمانوں سے خطاب کیا کہ تم کمزوری نہ دکھاؤ، صلح کی طرف مت بلاؤ، تم ہی غالب ہو گے۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے، وہ تمہارے اعمال ضائع نہیں فرمائے گا۔

سوال یہ ہے کہ یہاں منع کیا جا رہا ہے کہ تم صلح نہ کرو اور دوسری آیت میں ہے: ﴿وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَہَا﴾[166]

166۔ الانفال 8:61

کہ اگر وہ صلح کریں تو تم بھی صلح کرو۔ اس آیت میں اجازت دی جارہی ہے۔ تو بظاہر دونوں آیات میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ایک صلح وہ ہے جو دین کے فائدے کے لیے ہو وہ تو جائز ہے اور ایک صلح وہ ہے جو بزدلی کی وجہ سے ہو، یہ جائز نہیں ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ:

﴿وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا يُؤۡتِكُمۡ اُجُوۡرَكُمۡ وَلَا يَسۡـَٔلۡكُمۡ اَمۡوَالَكُمۡ ﴿۳۶﴾﴾

اگر تم ایمان لاؤ اور تقوی اختیار کرو تو اللہ تمہیں اجر دے گا اور اللہ تم سے تمہارے مال نہیں مانگے گا۔اس پر بھی سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں کتنی آیات ہیں جن میں حکم دیا جارہا ہے کہ مال خرچ کرو اور یہاں کہا جارہا ہے کہ اللہ تم سے مال کا مطالبہ نہیں کررہا!اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جہاں حکم ہے کہ مال خرچ کرو تو اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفع کے لیے خرچ کرو کیونکہ جب انسان اپنا مال اللہ کے دین کے لیے خرچ کرے گا تو اس کا نفع قیامت کے دن خود اسی کو ہو گا، اللہ اپنی ذات کے لیے تم سے مال نہیں مانگتے۔ تو پہلا مطلب تو یہ ہے۔

اور بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس آیت ﴿وَلَا يَسۡـَٔلۡكُمۡ اَمۡوَالَكُمۡ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے سارا مال نہیں مانگتا، اس پر دلیل ﴿اِنۡ يَّسۡـَٔلۡكُمُوۡهَا فَيُحۡفِكُمۡ تَبۡخَلُوۡا﴾ ہے کہ اللہ سارا مال تم سے نہیں مانگتا کیونکہ اگر تم سے سارا مال مانگ لیا تو تم بخل کرو گے۔ فرمایا: ﴿وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ﴾ کہ کچھ مال اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔

تذکرہ امام اعظم ابو حنیفہ:

﴿وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ ﴿۳۸﴾﴾

اللہ رب العزت اپنی شانِ بے نیازی کو بیان فرما رہے ہیں کہ ہمیں تمہارے اموال کی ضرورت نہیں بلکہ تم خود بھی اگر تبدیل ہو گئے تو تمہاری جگہ ہم اور لوگوں کو لائیں گے جو تمہاری طرح نہیں ہوں گے بلکہ وہ ہماری مکمل اطاعت کریں گے اور ہمارے حکموں کو مکمل مانیں گے۔

اس مقام پر تفسیر مظہری میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ ان کی اولاد؛ ابنائے فارس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے۔[167]

ایک حدیث ہے جس کے ایک طریق میں علم[168]، ایک میں دین[169] اور ایک میں ایمان[170] کے الفاظ ہیں کہ اگر یہ ثریا ستارے تک بھی پہنچ گیا تو فارس والے لوگ وہاں سے بھی اس کو لے کر آجائیں گے۔

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے "تبییض الصحیفۃ" میں لکھا ہے کہ "لَوْ كَانَ الْعِلْمُ بِالثُّرَيَّا لَتَنَاوَلَهُ رِجَالٌ مِنْ اَبْنَاءِ فَارِسٍ" والی حدیث کا مصداق امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔[171]

اللہ ہم سب کو یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

167۔ التفسیر المظہری: ج8 ص447

168۔ حلیۃ الاولیاء لابی نعیم الاصبہانی: ج6 ص64، 65

169۔ صحیح مسلم، رقم: 2546

170۔ صحیح البخاری، رقم: 4897

171۔ تبییض الصحیفۃ ص59، 60

سورۃ الفتح

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكَ وَ يَهۡدِيَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِيۡمًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَنۡصُرَكَ اللّٰهُ نَصۡرًا عَزِيۡزًا ﴿۳﴾﴾

شانِ نزول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہوئے اور عمرہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اس کا تذکرہ فرمایا۔ ہر ایک کا شوق بڑھا کہ ہمیں عمرے کے لیے جانا چاہیے۔ فطری شوق تو تھا کیونکہ مہاجرین صحابہ کو مکہ مکرمہ سے نکالا گیا تھا تو ان کا شوق زیادہ تھا۔ انصارِ مدینہ کا بھی شوق تھا کہ ہمیں بھی جانا چاہیے۔ تو سب پر شوق غالب آیا۔ آخر کار فیصلہ ہوا سن 6 ہجری کو مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے سفر کا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر جو دیہات تھے وہاں بھی آواز لگوائی کہ سب سے کہو کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ اس کی وجہ ان کے ذہن میں تھی کہ ہم عمرہ کرنے کے لیے جائیں گے تو مشرکینِ مکہ رکاوٹ پیدا کریں گے اور ممکن ہے کہ جنگ تک نوبت پہنچ جائے، اس لیے ہمیں اپنی طاقت کے ساتھ جانا

چاہیے، مکمل تو نہیں لیکن تلواریں وغیرہ ساتھ لے لیں اور چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغرضِ عمرہ مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔

ادھر جب مشرکینِ مکہ کو اطلاع ملی تو ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان کو عمرہ کرنے دینا چاہیے یا نہیں؟ بالآخر انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ ان کو عمرہ نہیں کرنے دینا چاہیے اور ان کو روکنا چاہیے، اگر ویسے نہیں رکتے تو ان کو طاقت کے ساتھ روکیں گے۔ خالد بن ولید ابھی صحابی نہیں بنے تھے یہ کام ان کے ذمے لگا کہ قریش کا ایک گروہ لے کر باہر نکلیں۔ جب یہ نکلے تو اور دیگر لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ مکہ مکرمہ سے باہر بَلْدَح ایک جگہ کا نام تھا وہاں پر حضرت خالد بن ولید اور ان ساتھ جو لشکر تھا ان لوگوں نے وہاں پڑاؤ ڈالا اور آپس میں عہد کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

عمرہ کا قصد اور مشرکینِ مکہ کی مزاحمت:

ادھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اطلاع ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ بھی گیا۔ تو ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے کہ ان کا اور خالد بن ولید کے قافلہ کا آمنا سامنا ہو گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بندے کو بھیجا اور ان سے بات چیت ہوئی کہ ہم صرف بغرض عمرہ آئے ہیں، ہمیں عمرہ کرنے دو، ہم واپس چلے جائیں گے لیکن انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بات سمجھائی کہ دیکھو! جنگیں کر کر کے تم تھک گئے ہو، مجھے چھوڑ دو، میں عمرہ کروں گا اور واپس جاؤں گا۔ باقی عرب قبائل سے مجھے نمٹنے دو، اگر وہ مجھ پر غالب آ گئے اور میں قتل ہو گیا تو تمہارا مدعا پورا ہو جائے گا اور اگر میں زندہ رہا تو تمہیں مزید موقع مل جائے گا تیاری کرنے کا، تم اپنی بھڑاس نکال لینا، فی الحال ہمیں کچھ نہ کہو لیکن وہ پھر بھی آمادہ

نہ ہوئے۔

حضور علیہ السلام کا معجزہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو لیا اور خالد بن ولید کے لشکر کے دوسری جانب آپ نے پڑاؤ ڈال دیا۔ قریش کے لشکر نے پانی کی جو جگہ تھی اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جگہ وہ آئی جہاں پانی نہیں تھا، بس وہاں پانی کا ایک کنواں تھا وہ بھی تقریباً خشک ہو چکا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک اس میں ڈالا اور ایک تیر بھی دیا کہ اس کو اس کنویں میں گاڑ دو۔ تیر کا گاڑنا تھا کہ کنویں کے اوپر کے کنارے تک پانی اُمڈ آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے پاس پانی جمع ہو گیا۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واضح معجزہ دیکھا۔

اہلِ مکہ کو سمجھانے کی کوششیں:

خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کو کوشش کی سمجھانے کی لیکن وہ نہیں مانے۔ اہلِ مکہ میں سے ایک شخص تھے بدیل بن ورقاء جو بعد میں مسلمان بھی ہو گئے تھے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ واپس چلے جائیں، عمرہ نہ کریں! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی بات سمجھائی کہ ہم عمرے کے لیے آئے ہیں، ہماری کوئی اور غرض نہیں ہے، ہم لڑائی کے لیے نہیں آئے، جنگ ہمارا مقصد نہیں ہے۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری سمجھائی جو بات حضرت خالد بن ولید کو سمجھائی تھی وہ بات پوری دوہرا دی۔

بدیل بن ورقاء نے بات سمجھی اور واپس جا کر قریش کو بات سمجھائی لیکن قریش نے کہا کہ ہم تو لڑیں گے۔ پھر عروہ بن مسعود ثقفی یہ اپنے طور پر آئے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور بات کی۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی سمجھائی تو ان کو بھی سمجھ آ گئی۔ انہوں نے واپس جا کر اہلِ مکہ کو سمجھایا لیکن وہ اپنی

ضد پر اڑے رہے اور کہا کہ ہم تو لڑیں گے، ہم تو قتل کریں گے۔ جب قریش نے عروہ بن مسعود کی بات نہ مانی تو وہ اپنی جماعت کو لے کر ان سے الگ ہو گئے۔

پھر حلبیس بن علقمہ جو اَعراب کے سردار تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اپنے کچھ آدمی لے کر، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی پوری بات سمجھائی جو بدیل بن ورقاء اور عروہ بن مسعود کو سمجھائی تھی، ان کو بھی سمجھ آگئی۔ انہوں نے بھی واپس جاکر قریش مکہ سے بات کی لیکن وہ تو ضد پر اڑے ہی رہے اور کہا کہ ہم تو لڑیں گے۔ جب حلبیس بن علقمہ کی بات بھی انہوں نے نہ مانی تو وہ بھی اپنی جماعت لے کر قریش سے الگ ہو گئے۔

ایک شخص اور بھی آیا، اس نے بھی بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی یہی بات سمجھائی۔ اس کو بھی بات سمجھ آگئی۔ اس نے بھی جاکر قریش کو سمجھایا لیکن وہ ضد پر اڑے رہے۔ یہ بھی اپنی جماعت لے کر ان سے الگ ہو گیا۔

مکہ کے جو قریشی تھے ان کے ذہن میں یہ تھا کہ اگر یہ لوگ آئے، عمرہ کیا اور عمرہ کرکے واپس چلے گئے تو ہمیں باقی عرب کہے گا کہ مسلمان تم پر غالب آگئے ہیں۔ طاقت کے بل بوتے پر آئے ہیں اور عمرہ کرکے واپس چلے گئے ہیں، اس سے تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، اس لیے ہم انہیں کسی بھی صورت میں عمرہ نہیں کرنے دیں گے۔

حضرت عثمان؛ نمائندہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم خود مکہ میں جاؤ اور ان کو سمجھاؤ! حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! میری خود ان سے جنگ ہے، میرے مزاج کی شدت کو بھی وہ لوگ سمجھتے ہیں، میرا وہاں پر کوئی حامی بھی نہیں کہ بات ان کو سمجھائے، اس لیے بہتر ہے کہ آپ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجیں، ان کا وہاں قبیلہ بھی ہے اور وہاں ان کی خاص عزت بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا، وہ چلے گئے۔ جب مکہ مکرمہ پہنچے تو ابان بن سعید سے ملے، ابان بن سعید بعد میں مسلمان بھی ہو گئے تھے، انہوں نے حضرت عثمان کو پناہ دی اور پھر ان کو لے کر تین دن تک قریش کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے سب سے ملاقاتیں کیں، حضرت عثمان نے قریشی سرداروں کو بہت سمجھایا کہ ہم عمرے کے لیے آئے ہیں، لڑائی ہمارا مقصد نہیں ہے لیکن انہوں نے کہا کہ کچھ بھی ہو جائے ہم ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ تین دن تک آپ وہاں ٹھہرے رہے۔ ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر آپ طواف کرنا چاہیں تو کر لیں، فرمایا کہ میں تو حضور کے بغیر طواف نہیں کر سکتا۔ بعض صحابہ نے کہا کہ عثمان کے تو مزے ہیں، وہ تو طواف کر رہے ہوں گے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عثمان میرے بغیر طواف نہیں کرے گا۔ اب دیکھو! اعتماد کی فضا کتنی ہے!

ادھر مشرکینِ مکہ نے اپنے پچاس آدمی بھیجے کہ جاؤ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو محافظ ہیں ان سے بچ کے ان کا کام تمام کرو۔ جب یہ لوگ آئے تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہرے پر مامور تھے انہوں نے ہمت کی، کچھ اور صحابہ ساتھ لیے اور مشرکین کے ان پچاس افراد کو گرفتار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ان کو قتل بھی کر سکتے تھے لیکن آپ نے ان کو قتل نہیں کیا۔ جب مسلمانوں نے ان کے پچاس بندے قید کر لیے تو انہوں نے حضرت عثمان کو وہاں روک لیا اور کہا کہ تم ان کو مارو گے تو ہم ان کو بھی قتل کر دیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پچاس کو چھوڑ دیا تاکہ وہاں پر قتل نہ ہو۔ انہوں نے بھی حضرت عثمان کو چھوڑ دیا لیکن ادھر خبر

پہنچی کہ حضرت عثمان کو شہید کر دیا گیا ہے۔

قتلِ عثمان کا بدلہ لینے پر بیعت:

اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم حضرت عثمان کا بدلہ لیں گے اور واپس نہیں جائیں گے۔ دیکھو ہم نے ان کے پچاس بندے چھوڑ دیے اور انہوں نے قتل کر دیا۔ تو یہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، اس لیے ہم بدلہ لیں گے۔ اس پر چودہ سو کے لگ بھگ جو صحابہ تھے ان سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی بدلہ لینے کے لیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیچے اپنا دایاں ہاتھ رکھا اور اس پر اپنا بایاں ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ اگر عثمان یہاں پر ہوتے تو وہ بھی موت کی بیعت کرتے۔ یہ میرا ہاتھ عثمان کا ہاتھ سمجھو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے بھی بیعت کر لی۔

مشرکینِ مکہ سے مذاکرات:

جب یہ خبر وہاں مکہ مکرمہ میں مشرکینِ مکہ کے پاس پہنچی تو ان کے ذہن کی فضا تو بالکل بدل گئی۔ وہی مشرکینِ مکہ جو بات ماننے کی لیے تیار نہیں تھے اللہ رب العزت نے ایسا رعب ان کے دلوں میں ڈالا کہ وہاں سے تین آدمیوں کا قافلہ سہیل بن عمرو کی قیادت میں آیا کہ ہم آپ سے مذاکرات کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بتاؤ! تم کیا چاہتے ہو؟ سہیل بن عمرو پہلے بھی مذکرات کے لیے آئے تھے اس وقت صرف اتنی بات تھی کہ پچاس بندے رہا کروا کر لے گئے تھے اور اب جب دوبارہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھتے ہی فرمایا کہ مجھے لگتا ہے کہ مکہ والے مذاکرات کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں۔ سہیل کے آنے سے محسوس کیا۔ جب وہ آیا تو پھر مذاکرات شروع ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ جی! آپ اس سال واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آپ عمرے کے لیے آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک

ہے، ہمیں یہ شرط منظور ہے، ہم اس سال واپس جاتے ہیں اور ہم آئندہ سال پھر آئیں گے عمرہ کے لیے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی شخص مسلمان ہو اور آپ کے پاس چلا جائے تو آپ لوگ اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے اور اگر آپ کا کوئی شخص ہمارے مذہب کی طرف واپس آ جائے -جس کو ہم مرتد کہتے ہیں- تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں منظور ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی شرائط تھیں جو آپ نے پڑھی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ اس پر بہت رنج ہوا کہ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں منظور ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اصرار کیا کہ حضور! آپ کس بات پر معاہدہ فرما رہے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہمیں چھوڑ کر ان کے پاس چلا جائے گا تو اس کی ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے، اس کو کیا کرنا ہے واپس لا کر، بس اسے جانے دو اس کو! صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات سمجھ میں آ گئی۔

معاہدہ کی شقوں پر فریقین کی گفتگو:

اسی طرح سہیل بن عمرو نے یہ بات بھی رکھی کہ ہمارا دس سال کا آپس میں معاہدہ ہے، ہم آپ سے جنگ نہیں کریں گے اور آپ بھی ہم سے جنگ نہیں کریں گے، جو قبیلہ آپ کے ساتھ ملنا چاہے اسے اختیار ہے کہ آپ کے ساتھ ملے اور جو ہمارے ساتھ ملنا چاہے وہ ہمارے ساتھ ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں منظور ہے۔ ان شرائط پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ فرمالیا۔

جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا کہ لکھو! "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

یہ سہیل بن عمرو اور محمد کے درمیان ہے تو آپ نے حضرت علی سے فرمایا کہ

لکھو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا

اس پر سہیل نے کہا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھیں، کیونکہ الرحمٰن اور الرحیم ہمارے ہاں نہیں لکھا جاتا، جو پہلے آپ لکھتے تھے "بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ" اب بھی وہی لکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی! یہی لکھو۔ یہ لکھ دیا گیا۔ پھر فرمایا: لکھو کہ یہ وہ معاہدہ ہے جس کا فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ اس پر بھی سہیل بن عمرو نے کہا کہ اگر ہم آپ کو رسول اللہ مان لیں تو جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا، یہی بات تو ہم نہیں مانتے اور معاہدے میں ایسی باتیں نہیں لکھتے جو فریقین میں اختلافی ہوں بلکہ وہ لکھتے ہیں جو اتفاقی ہوں، "رسول اللہ" یہ اختلافی نکتہ ہے اس لیے محمد بن عبد اللہ لکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی! یہ "رسول اللہ" کا لفظ کاٹ دو اور "محمد بن عبد اللہ" کا لفظ لکھو! انہوں نے عرض کیا: حضور! اسے کاٹنا میرے بس میں نہیں ہے۔ انہوں نے نہیں کاٹا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاغذ مجھے دو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ خود لے کر معاہدہ اپنے ہاتھ سے لکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو امی تھے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ امی ہونے کے باوجود یہ تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود لکھی ہے:

"هٰذَا مَا قَاضٰى مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ وَسُهَيْلُ بْنُ عَمْرٍو وَأَصْلَحَا عَلٰى وَضْعِ الْحَرْبِ عَنِ النَّاسِ عَشَرَ سِنِيْنَ يَأْمَنُ فِيْهِ النَّاسُ وَيَكُفُّ بَعْضُهُمْ عَنْ بَعْضٍ"[172]

کہ یہ معاہدہ محمد بن عبد اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان ہے، دونوں فریقوں نے اس بات پر صلح کی ہے کہ دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے، اس دوران سب لوگ امن کے ساتھ رہیں گے اور ایک دوسرے پر چڑھائی

172۔ التفسیر المظہری: ج9 ص15

کرنے سے رکے رہیں گے!

معاہدہ کی شرائط طے ہوئی ہی تھیں کہ ابو جندل؛ سہیل بن عمرو کے بیٹے کسی طریقے سے اپنی بیڑیاں کھلوا کر یہیں حدیبیہ ہی میں پہنچ گئے۔ ابو جندل مسلمان ہو چکے تھے تو ان کے والد سہیل بن عمرو نے ان کو بیڑیاں لگا دیں تھیں۔ تو وہ کسی طرح وہاں سے نکل کر یہاں آ گئے۔ سہیل نے کہا کہ یہ تو ہمارا معاہدہ ہے کہ اگر ہمارا بندہ ہمارے دین کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ جائے تو آپ واپس کرنے کے پابند ہیں، اس لیے ابو جندل کو واپس کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو جندل! واپس چلے جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ حضور! یہ بہت ظلم کرتے ہیں۔ فرمایا کہ بہت جلد اللہ اسباب عطا فرما دیں گے، تم واپس چلے جاؤ۔ یوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا۔

تو یہ تھا صلحِ حدیبیہ کا پس منظر جس پر معاہدہ ہوا تھا۔

حضرت عمر کی دربارِ نبوت میں حاضری:

جب وہاں سے واپس آنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: حضور! کیا آپ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ فرمایا کہ سچا نبی ہوں۔ کہا کہ ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں؟ فرمایا: ہم حق پر اور وہ باطل پر ہیں۔ کہا کہ کیا ہمارے مقتول جنت میں اور ان کے مقتول جہنم میں نہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں! کہا: یارسول اللہ! پھر آپ اتنا دب کے کیوں معاہدہ کرتے ہیں؟! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول ہوں، میں اللہ کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا، اللہ میری مدد ضرور کرے گا۔ عمر! اسی میں خیر ہے۔ حضرت عمر عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ! آپ نے ہمیں تو فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ میں جائیں گے، طواف کریں گے، عمرہ کریں گے! فرمایا کہ میں نے کہا تھا لیکن کیا یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال کریں گے؟ عرض کیا جی نہیں۔ فرمایا کہ میں

نے جس طرح کہا تھا ان شاء اللہ ایسے ہی ہو گا، ہم بیت اللہ کا طواف ضرور کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت خاموش تو ہو گئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے کہ کیا حضور سچے نبی نہیں ہیں؟ حق پر نہیں ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بالکل سچے ہیں، حق پر ہیں۔ کیا مشرکین باطل پر نہیں ہیں؟ فرمایا: باطل پر ہیں۔ تو پھر یہ معاہدہ ہم کیوں کرتے ہیں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہی جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اللہ کے حکم کے خلاف کبھی نہیں کریں گے اور اللہ ان کی مدد فرمائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں برابر صدقہ کرتا رہا، غلام آزاد کرتا رہا، توبہ واستغفار کرتا رہا کہ یا اللہ! یہ میں نے کیا کیا؟ میں کیوں جذبات میں آکر یہ بات کہتا تھا۔

اصل یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ میں صحابہ کے ساتھ بیت اللہ گیا ہوں اور ہم نے عمرہ کیا ہے لیکن اس میں وقت کا تعین نہیں تھا کہ اب کریں گے یا آئندہ سال کریں؟ شوق غالب تھا تو اسی سال روانہ ہو گئے۔ مقدر میں آئندہ سال لکھا تھا۔ جب وہاں سے واپس لوٹے تو پھر یہ سورت نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ مکمل سورت نازل ہوئی اور ایک روایت میں ہے کہ سورت کا کچھ حصہ ابھی نازل ہوا اور کچھ حصہ بعد میں نازل ہوا۔

"لِيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ" کا معنی:

﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾

ہم نے آپ کو کھلی فتح عطا کی ہے۔

کھلی فتح کیوں عطا کی ہے؟ اس کی ایک حکمت جو عام مفسرین نے تحریر فرمائی

ہے وہ یہ ہے کہ کھلی فتح اس لیے عطا کی ہے تاکہ آپ کی جو اجتہادی خطائیں ہیں، خلافِ اولیٰ کام ہیں ہم ان کو معاف کر دیں، "مَا تَقَدَّمَ "یعنی اعلانِ نبوت سے پہلے والی اور "وَ مَا تَاَخَّرَ "یعنی اعلانِ نبوت کے بعد والی۔ اب اس کا تعلق فتح کے ساتھ کیا ہو گا؟ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس کا فتح سے تعلق یہ ہے کہ جب ہم آپ کو فتح دیں گے، آپ کی فتح کو دیکھ کر لوگ مسلمان ہوں گے اور لوگوں کے اسلام میں آنے کی وجہ سے آپ کو ثواب ملے گا، ثواب اتنا زیادہ ملے گا کہ اس سے اجتہادی خطاؤں کا تدارک ہو جائے گا۔ تو "لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ" کا معنی یہ ہے۔

اور میں کئی بار کہہ چکا ہوں -شاید آپ کے علم میں ہو- کہ یہاں ذنب کا معنی اگر "گناہ" کریں گے تو آیت میں جوڑ ہی نہیں رہے گا کیونکہ اب معنی یہ ہو گا: "ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کے گناہ معاف کر دیں" تو سوال یہ ہو گا کہ فتح سے گناہ کی معافی کا کیا تعلق ہے؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم آپ کو فتح دیں گے تاکہ آپ ریاست قائم کریں، فتح دیں گے تاکہ آپ ظلم کا بدلہ لیں، فتح دیں گے تاکہ آپ احکام نافذ کریں، فتح دیں گے تاکہ اسلام کی عظمت نظر آئے... یہ بات تو سمجھ آتی ہے لیکن فتح دیں گے تاکہ آپ کے گناہ معاف کر دیں تو فتوحات کا گناہوں کی معافی سے کیا تعلق ہے؟

مثال کے ذریعے وضاحت:

جیسے آپ کے علاقے میں کوئی بندہ الیکشن لڑے اور ایم این اے بنے تو آپ کہیں مبارک ہو! وہ کہے کیوں؟ اس لیے کہ اللہ نے آپ کے گناہ معاف کر دیے؟ وہ پوچھے: کیوں گناہ معاف کر دیے؟ آپ فاتح نہیں ہوئے، آپ غالب نہیں آ گئے؟ تو غلبہ کے ساتھ گناہوں کی معافی کا اعلان تو نہیں ہوتا۔

ہاں اگر یہ ہوتا کہ ہم نے آپ کو توبہ کی توفیق دی تاکہ آپ کے گناہ معاف ہو جائیں تو یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے! لیکن ہم نے آپ کو فتح دی تاکہ آپ کے گناہ معاف ہو جائیں، بظاہر اس میں کوئی ربط محسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ یہاں تین باتیں سمجھنا ضروری ہے:

1: "غَفَرَ... یَغۡفِرُ... غُفۡرَانًا وَ مَغۡفِرَۃً" کا معنی

2: "مَا تَقَدَّمَ" اور "وَ مَا تَاَخَّرَ" کا معنی۔

3: ذنب کا معنی۔

◆ غفران کا معنی ہوتا ہے ڈھانپ لینا۔ اس لیے میدان جنگ میں جو لوہے کی ٹوپی سر پر پہنی جاتی ہے جسے اردو میں خَوُد کہتے ہیں، اسے عربی میں "مِغۡفَرۡ" کہتے ہیں یعنی ڈھانپ لینے والی چیز، ڈھانپ لینے والا آلہ۔ تو مغفرت کا معنی ہوا ڈھانپ لینا۔

◆ "مَا تَقَدَّمَ" سے مراد ہے مکی زندگی اور "وَ مَا تَاَخَّرَ" سے مراد ہے مدنی زندگی۔

◆ اور ذنب کا معنی صرف گناہ نہیں ہوتا بلکہ ذنب کا معنی الزام بھی ہوتا ہے۔ عربی میں ذنب کہتے ہیں دم کو، جس طرح دم جانور کے پیچھے ہوتی ہے اسی طرح الزام لگانے والے بھی عموماً الزام بندے کے پیچھے لگاتے ہیں۔ تو ذنب محاوراتِ عرب میں الزام کو بھی کہتے ہیں۔

اب اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکی زندگی اور مدنی زندگی میں لوگ الزام لگاتے تھے۔ مکی زندگی میں الزام یہ تھے کہ آپ شاعر ہیں، مجنون ہیں، ساحر ہیں.... اور مدنی زندگی میں الزام کیا تھے کہ آپ کو اقتدار کا شوق ہے، حکومت کا شوق ہے، لیڈر بننے کا شوق ہے... اور الزام کون لگاتا ہے جو مخالف ہو، وہ نہیں لگاتا جو عقیدت مند ہو۔ تو اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہم نے اتنی کھلی اور شاندار فتح

آپ کو دی ﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾ اب اس فتح کے نتیجے میں آپ کے جو مخالف تھے وہ موافق اور معتقد بنے ہیں، جو گالیاں دیتے تھے... الزام لگاتے تھے مخالفت کی وجہ سے وہ جب آپ کے غلام بن کر عقیدت مند ہو گئے تو اب یہ الزام نہیں لگائیں گے بلکہ آپ کی مدح کریں گے، آپ کی تعریف کریں گے۔ تو ہم نے فتح عطا فرما کر مکی اور مدنی زندگی میں جو لگنے والے الزامات تھے وہ سارے ہم نے صاف کر دیے ہیں، اب آپ پر الزام نہیں لگیں گے بلکہ اب آپ کی مدح ہو گی۔

اب اس تقریر کے بعد بات ایسی واضح ہو جاتی ہے کہ اب کوئی اشکال رہتا ہی نہیں ہے اور نہ ذنب کا معنی گناہ کرنا پڑتا ہے بلکہ بلا تاویل بات بالکل کھل کر سامنے آتی ہے، اس لیے بہتر ہے کہ تقریر یہاں پر یہ کر لی جائے۔

فتحِ مبین؛ اتمامِ نعمت کا ذریعہ

﴿وَ یُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَیۡكَ وَ یَهۡدِیَكَ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ۙ﴿۲﴾﴾

اللہ نے آپ کو نبوت بھی دی ہے، قرآن بھی دیا ہے اور ہم مزید لوگ حلقہ اسلام میں داخل کر کے آپ پر اپنی نعمت کو مزید مکمل کریں گے اور آپ پہلے بھی صراط مستقیم پر ہیں لیکن راستے میں رکاوٹیں ہیں، اب بغیر رکاوٹوں کے ہم آپ کو دین کے راستے پر چلا دیں گے۔ اب ہم نے کفر کی رکاوٹیں ختم کر دی ہیں، اب سہولت کے ساتھ ہم آپ کو اس راستے پر چلائیں گے۔

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ السَّكِیۡنَةَ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾

یہاں "السَّكِیۡنَةَ" سے مراد تحمل ہے۔ فرمایا: اللہ کی ذات وہ ہے جس نے مؤمنین کے دلوں میں تحمل پیدا فرما دیا۔ اگر اللہ کی طرف سے تحمل نہ ہوتا تو اس بات

کو برداشت کرنا کتنا مشکل تھا! ان شرائط کے ساتھ معاہدہ کرنا کتنا مشکل تھا! اللہ نے تحمل کی طاقت دی ہے۔

﴿لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ﴾ پہلے ایمان سے مراد ہے اصلِ ایمان اور مزید ایمان سے مراد ہے نور ایمان کہ ہم اس ایمان کے ساتھ مزید ایمان بڑھاتے ہیں، یوں وہ نورِ ایمان آپ پر آتا ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴﴾

آسمان اور زمین کے سارے لشکر اللہ ہی کے ہیں، اللہ جانتا بھی ہے اور حکمت والا بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فتح کس کو دینی ہے اور حکمت والا بھی ہے کہ یہ فتح کس وقت دینی ہے!

﴿لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۵﴾

یہ ہم نے جو آپ کو فتح عطا فرمائی اور ایمان والوں کو تحمل دیا یہ اس لیے دیا تاکہ یہ آپ کی بات کو مانیں تو اللہ اس کے بدلے میں ان ایمان والے مردوں اور عورتوں کو جنت میں داخل کریں جن میں نہریں جاری ہیں، ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان کے گناہوں کو معاف کردیں گے۔ اللہ کے ہاں یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

﴿وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۶﴾

اور اللہ نے یہ فتح اس لیے دی ہے تاکہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو

اللہ عذاب دیں، مشرک مردوں اور مشرک عورتیں کو بھی عذاب دیں، ان منافقوں اور مشرکوں کا بدعقیدہ ہونے کی وجہ سے اللہ کے بارے میں گمان اچھا نہیں تھا۔ انہی پر عذاب ہو گا، انہی پر اللہ کا غضب ہو گا، اللہ کی لعنت ہو گی اور پھر آخرت میں اللہ نے ان کے لیے جہنم کا عذاب بھی تیار کیا ہوا ہے اور جہنم واقعی بہت برا ٹھکانہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صفات:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝۸﴾

یہاں اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صفتیں بیان فرمائی ہیں:

[1]: آپ شاہد ہیں۔ شاہد کا معنی کہ آپ قیامت کے دن گواہی دیں گے۔ اللہ کے دربار میں گزشتہ انبیاء علیہم السلام کہیں گے یا اللہ! ہم نے اپنی امتوں کو آپ کی بات پہنچائی ہے لیکن ان کی امتیں کہیں گی کہ انہوں نے ہم تک دین کی بات نہیں پہنچائی۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ یا اللہ! انبیاء علیہم السلام نے دین کی بات پہنچائی تھی اور ان امتوں نے مانا نہیں تھا۔ تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ میرے پاس دلیل قرآن کریم ہے۔

یا اپنی امت پر گواہی دینا مراد ہے چونکہ ہر پیر اور جمعرات کو امت کے اعمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش ہوتے ہیں۔ تو قیامت کو اللہ کے نبی گواہی دیں گے۔

[2]: "وَمُبَشِّرًا" مؤمنین کو خوشخبری دیتے ہیں جنت کی۔

[3]: وَنَذِيرًا" کفار کو ڈراتے ہیں جہنم سے۔

﴿لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝۹﴾

ہم نے تم لوگوں کو فتح اس لیے دی تا کہ تم اللہ کی ذات پر ایمان لاؤ، اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا یقین اور بڑھ جائے اللہ کے رسول پر۔ ”وَ تُعَزِّرُوْهُ“ اور تم ان کی مدد کرو، ”وَ تُوَقِّرُوْهُ“ اور تم ان کی عظمت کے قائل ہو جاؤ یعنی ان کی مزید عظمت کرو، عزت کرو۔

یہاں دیکھو! ”وَ تُعَزِّرُوْهُ“ کا لفظ یہ تعزیر سے ہے۔ اس کا معنی ہے مدد کرنا اور جو مجرم کو سزا دیتے ہیں اس کو بھی تعزیر کہتے ہیں۔ جس جرم کی شریعت میں سزا متعین ہے اسے حد کہتے ہیں اور جس جرم کی سزا متعین نہیں ہے بلکہ حاکم یا قاضی کی صوابدید پر ہو اسے تعزیر کہتے ہیں۔ تو تعزیر میں مدد کیسے ہوتی ہے؟ اس کی وجہ لغات وغیرہ میں یہ لکھی ہے کہ اس سزا کو تعزیر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ مجرم کے ساتھ مدد ہے کہ آئندہ وہ یہ جرم نہیں کرے گا۔ یہ مجرم کی مدد کی جارہی ہے تا کہ وہ نیکیوں پر آئے اور گناہوں سے بچے۔ اس لیے اس سزا کو تعزیر کہتے ہیں۔

”ید“ صفت متشابہ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾

جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں تو یہ دراصل اللہ کی بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ”ید“ ہے۔

”ید“ اللہ کی صفت ہے جس کا معنی ہم نہیں جانتے اور ”ید“ متشابہات میں سے ہے۔ اصل معنی یہی ہے لیکن متأخرین حضرات فرماتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی یہاں قدرت ہے لیکن درجہ گمان میں ہے، درجہ یقین میں نہیں ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ”ید“ کا معنی قدرت ہے اور درجہ یقین میں ہے۔ اس لیے معتزلہ کا مذہب الگ ہے اور متاخرین کا مذہب الگ ہے۔

متقدمین اور متاخرین کے مذہب میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، یہ نزاعِ لفظی ہے نزاعِ حقیقی نہیں ہے۔ متقدمین کہتے ہیں کہ "ید" کا معنیٰ حقیقی اللہ کو معلوم ہے اور متأخرین کہتے ہیں کہ "ید" کا معنیٰ ہمیں معلوم ہے لیکن حقیقی نہیں بلکہ درجہ گمان میں۔ تو یہ نزاعِ لفظی ہوا، نزاعِ حقیقی نہ ہوا۔

﴿فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾﴾

جو شخص اس عہد کو توڑے گا تو اس عہد کے توڑنے کا نقصان اسی پر ہی ہو گا اور جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اس کو اجر عظیم دے گا۔

حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی عذر خواہی:

﴿سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾

فرمایا کہ جب آپ واپس جائیں گے تو وہ دیہاتی لوگ جو تمہارے ساتھ نہیں گئے تھے وہ اب اپنے عذر پیش کریں گے کہ ہمارے مال اور گھر کی کچھ مصروفیت تھی کہ ہم ساتھ نہیں جاسکے، اس لیے اے پیغمبر! آپ ہمارے لیے اللہ سے معافی مانگیں۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہہ رہے ہیں جو اِن کے دلوں میں نہیں ہیں۔

ان کے دل میں یہ تھا کہ اگر ہم عمرہ کے لیے مکہ گئے تو قتل ہو جائیں گے، واپس نہیں آسکتے اور زبان سے یہ کہتے ہیں کہ ہماری مجبوری تھی، کچھ مصروفیت تھی اس لیے ہم نہیں جاسکے۔ تو ان کی زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ اور ہے۔

﴿قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ

بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾

اے پیغمبر! آپ فرما دیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا تمہیں کوئی نفع دینا چاہے تو وہ کون ہے جو اللہ کے سامنے تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو؟ بلکہ اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔

یہ اعراب جو سوچ رہے تھے کہ ہم اگر اپنے گھروں میں رہیں گے تو نفع میں ہوں گے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جائیں گے تو نقصان میں ہوں گے تو ان کی یہ بات غلط ہے۔ نفع نقصان کا مالک اللہ ہے۔ جب اللہ تمہیں نفع یا نقصان دینے کا ارادہ کرلے تو کون بچا سکتا ہے؟! اس لیے تمہارے یہ عذر فضول ہیں۔

﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖۚ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۲﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ تمہارے عذر فضول ہیں، اصل بات یہ ہے کہ تمہارا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کبھی بھی مکہ سے واپس نہیں لوٹیں گے اور یہ بات تمہارے دل کو اچھی بھی لگتی تھی اور تم نے برے گمان قائم کیے تھے اور تم ہو ہی ایسی قوم جو تباہ اور برباد ہو جائے گی۔

منافقین کے خیبر جانے پر اصرار کی وجہ:

﴿سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ﴾

جب تم مالِ غنیمت کی طرف جاؤ گے تو وہ لوگ جو پیچھے رہ گئے تھے وہ کہیں گے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا - جیسا کہ آگے آ رہا ہے

"کَذٰلِکُمْ قَالَ اللّٰہُ مِنْ قَبْلُ"۔ کہ اللہ عنقریب تمہیں ایک فتح دیں گے اور اس فتح سے مراد فتحِ خیبر تھی تو اللہ تعالیٰ نے پہلے بتا دیا کہ جب تم واپس جاؤ گے تو یہ منافقین کہیں گے کہ ہم نے خیبر میں تمہارے ساتھ جانا ہے۔

منافق یہ بات کیوں کہہ رہے ہیں؟ حالانکہ وہ تو جہاد سے ڈرتے ہیں اسی وجہ سے تو مکہ نہیں جا رہے تھے تو پھر یہ لوگ خیبر جانے کی بات کیوں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مکہ سے مسلمانوں کو صحیح سلامت واپس ہوتے ہوئے دیکھا تو ان کو اندازہ تھا کہ خیبر بھی ایسے ہو گا، مسلمانوں کو فتوحات ملنے والی ہیں، لہٰذا وہاں سے غنیمت ملے گی۔ اس لیے ہم کہیں گے کہ جی ہم بھی خیبر میں ساتھ جائیں گے۔

﴿قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥﴾﴾

فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے کیونکہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے کہ جو لوگ بیعتِ رضوان میں شریک تھے غزوہ خیبر میں وہی شرکت کریں گے اور جو شریک نہیں تھے تو وہ یہاں بھی شرکت نہیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ اللہ کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ تم تو ہم سے جلتے ہو کہ کہیں ان کو مالِ غنیمت نہ مل جائے، حسد کی وجہ سے ایسی باتیں کرتے ہو۔ فرمایا کہ حسد نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تم بات کو سمجھتے نہیں ہو۔

حدیث حجت ہے:

اب سورۃ الفتح جو آپ نے دیکھی ہے اس میں تو یہ بات نہیں ہے کہ خیبر فتح ہو گا اور مال غنیمت ہو گا اور جو حدیبیہ والے ہیں صرف وہی اس میں جائیں گے۔ تو یہ بات کیسے فرما دی کہ ﴿كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ﴾

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہے وحیِ متلو اور ایک ہے وحیِ غیر متلو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو بات اللہ نے فرمائی تھی یہ قرآن کریم میں تو نہیں فرمائی بلکہ اللہ نے بات اپنے نبی کو بذریعہ وحیِ غیر متلو بتادی یعنی یہ بات حدیث پاک میں تھی۔ تو اس سے حدیث پاک کا حجت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہی بات جو صرف قرآن کریم میں ہو اور حدیث حجت نہ ہو تو پھر جب قرآن کریم کے اندر یہ بات موجود ہی نہیں ہے کہ جو حدیبیہ والے ہیں صرف وہی جائیں گے تو کیسے کہہ دیا کہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ حدیبیہ والے جائیں گے اور کوئی نہیں جائے گا، یہ قرآن میں تو نہیں ہے۔

تو اس سے ثابت ہوا کہ حدیث پاک حجت ہے۔ جس طرح قرآن کریم کو ماننا ضروری ہے اسی طرح حدیث پاک کو ماننا بھی ضروری ہے۔

پیچھے رہ جانے والوں کو خطاب:

﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٦﴾﴾

حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کو یہ بات فرمائی کہ دیکھو! یہ طے شدہ بات ہے کہ تم غزوہ خیبر میں تو شرکت نہیں کر سکتے۔ اس سے یہ ہوا کہ منافقین کو تو افسوس صرف یہ تھا کہ ہمیں مالِ غنیمت نہیں ملا اور جو منافقین نہیں بلکہ مخلص صحابہ تھے اور ان کی باتوں میں آ کر وہ حدیبیہ میں شرکت نہیں کر سکے اب ان کو بہت دکھ ہو رہا تھا کہ ہم حدیبیہ میں بھی نہیں جا سکے اور اس کے بعد ہم غزوہ خیبر میں بھی شرکت نہیں کر سکے، ہمارا کیا بنے گا؟ تو ان صحابہ سے فرمایا کہ ایک اور وقت آنے والا ہے اللہ تمہیں اس میں شرکت کی اجازت دیتے ہیں، تم وہاں پر اپنے جوہر دکھا لینا۔

اور اگر اس سے منافقین مراد ہوں تو پھر ان کو یہ کہا جارہا ہے کہ تم خیبر کے لیے پریشان کیوں ہو، یہ تو خدا کا فیصلہ ہے کہ جو حدیبیہ میں شریک تھے خیبر میں وہی جائیں گے، اس کے بعد آنے والی جنگیں ہیں تم ان میں شرکت کر لینا، وہاں پتا چل جائے گا کہ تم جاتے ہو یا نہیں جاتے!

﴿قُلۡ لِّلۡمُخَلَّفِيۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ﴾ ان پیچھے رہ جانے والے دیہاتیوں سے کہہ دو کہ عنقریب تمہارا واسطہ ایسی قوم سے پڑے گا جو سخت جنگجو ہے، تم ان سے لڑو گے حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائیں- جب تک کلمہ نہیں پڑھیں گے تمہاری لڑائی ان سے جاری رہے گی- اگر تم اللہ کی بات مانو گے تو اللہ بہترین اجر دیں گے اور اگر نہیں مانو گے جیسے تم نے پہلے نہیں مانی تو خدا دردناک عذاب دیں گے۔

﴿سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ﴾... اس کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے بعد کی جنگیں ہیں؛ خواہ وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور کا جہاد ہو جو مسیلمہ کذاب کے خلاف تھا خواہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور کا جہاد ہو جو ایرانیوں کے خلاف تھا۔ بہر حال یہ جنگیں بعد کی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس کے بعد کوئی ایسی جنگ پیش نہیں آئی کہ جس میں طاقتور قوم سے واسطہ پڑا ہو اور جنگ میں بڑی مشکل ہوئی ہو۔

پیچھے رہ جانے والے مخلصین کا حکم:

﴿لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ وَمَنۡ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبۡهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۷﴾﴾

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو مخلص تھے اور معذور تھے ان کو اور دکھ ہوا

کہ ہمارا کیا بنے گا؟ ہم حدیبیہ میں بھی نہیں جا سکے، خیبر جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی، آئندہ جب جنگیں ہوں گی تو ہم تو لڑ نہیں سکتے، ہمارا عذر ہے، اب ہمارا کیا بنے گا؟ فرمایا کہ اگر کوئی شخص نابینا ہو، لنگڑا ہو یا بیمار ہو اور وہ سفر جہاد کے لیے نہ جا سکے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ جو اللہ کی اطاعت کرے اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرے تو اللہ اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے منہ موڑے گا تو اللہ اسے دردناک عذاب دے گا۔

بیعت رضوان:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿١٨﴾﴾

جن لوگوں نے اس درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے رضا کا اعلان ہو گیا۔

اللہ ان ایمان والوں سے راضی ہے جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ ان کے دل کے اخلاص کو جانتے ہیں۔ اللہ نے ان پر اطمینان نازل فرما دیا یعنی وہ مطمئن ہو کر بیعت کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد اللہ بہت جلد انہیں فتح عطا کرنے والے ہیں۔

اس فتح کا مصداق غزوہ خیبر ہے۔ یہاں ایک اشکال اور اس کا جواب سمجھیں۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ غزوہ خیبر میں وہی جائیں گے جو حدیبیہ میں شریک تھے، جو حدیبیہ میں نہیں تھے وہ اس میں نہیں جائیں گے یہ بات قرآن کریم میں نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث حجت ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ ﴿وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ کے بارے میں تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ فتحِ قریب سے

مراد فتحِ خیبر ہے۔ تو اس کا تذکرہ تو قرآن میں آ گیا۔ تو یہ کیسے کہا کہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے؟

اس کے دو جواب سمجھیں:

[1]: اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ تو بتایا کہ اس کے بعد عنقریب ایک جہاد ہو گا جس میں اللہ تمہیں فتح نصیب فرمائے گا لیکن یہ تو نہیں بتایا کہ اس میں شریک کون ہوں گے اور کون نہیں ہوں گے؟ اس میں یہ تو ہے کہ اس جہاد میں حدیبیہ والے شریک ہوں گے لیکن جو حدیبیہ والے نہیں تھے وہ اس میں شریک نہیں ہوں گے، یہ بات تو اس میں نہیں ہے۔

[2]: دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں یہ تو فرمایا کہ فتح قریب ہو گی لیکن فتح قریب سے مراد خیبر کی فتح ہونا یہ تو قرآن کریم میں نہیں ہے، یہ تو احادیث سے پتا چل رہا ہے کہ فتحِ قریب سے مراد فتحِ خیبر ہے۔ تو اس سے پھر حدیث کا حجت ہونا ثابت ہو جائے گا۔

﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَ كَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَ لِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ يَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾﴾

اور اس فتح خیبر کے بعد اور بھی جہاد ہوں گے۔ اب فتوحات کا دور شروع ہو گیا ہے۔ فرمایا: اللہ نے تم سے اور بھی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جو تم حاصل کرو گے اور اللہ نے فوری طور پر یہ فتح تمہیں دی ہے اور اللہ نے دشمن کے ہاتھ کو تم سے روک دیا ہے تاکہ یہ بات مومنوں کے لیے تسلی کا سامان بن جائے اور اللہ تمہاری مزید رہنمائی فرمائیں گے اور مزید ہدایت کا اعلیٰ مقام عطا فرمائیں گے۔

یہ خیبر کا موقع ہے کہ یہودی طاقت میں بھی تھے، ان کے پاس وسائل بھی

تھے، اسباب بھی تھے لیکن ان کے باوجود مرحب کا قتل ہونا تھا کہ خدا نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کا اتنا رعب ڈال دیا کہ مسلمانوں کو زیادہ ہاتھ نہیں چلانے پڑے، بغیر لڑے خیبر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا۔

﴿وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾﴾

ابھی کتنی ہی جنگیں باقی ہیں جن کو کنٹرول کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے لیکن اللہ نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے یعنی اللہ تعالی آنے والی جنگوں میں تمہیں مزید فتوحات عطا فرمائیں گے۔ اللہ رب العزت ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

﴿وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾﴾

اور اگر کفار تم سے جنگ کرتے تو کافر ہی پیٹھ پھیر کر دوڑ جاتے، پھر ان کا کوئی ولی اور مددگار نہ ہوتا۔ یہی خدا کا طریقہ ہے جو پہلے تھا اور اللہ کا یہی طریقہ آئندہ بھی ہے جس کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

اب یہاں ایک بات سمجھیں۔ حدیبیہ کے موقع پر صلح ہوئی، جنگ نہیں ہوئی اور قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر جنگ ہو جاتی تو شکست کفار کو ہوتی اور مسلمان جیت جاتے تو سوال یہ ہے کہ پھر جنگ کیوں نہیں ہوئی؟ پھر صلح کی کیا ضرورت تھی؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر جنگ ہوتی تو فتوحات تو مسلمانوں کو ہی ہوتیں لیکن فتوحات کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی ہوتے کہ مکہ میں بعض مسلمان ایسے تھے جو کفار سے الگ نہیں تھے اور ایسے موقع پر الگ ہونا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اگر مسلمان مکہ پر چڑھائی کرتے تو کفر کی کمر توٹتی لیکن بہت سارے مسلمان بھی ساتھ شہید ہو جاتے اور بعد میں مسلمانوں کو دکھ ہونا تھا کہ یہ ہمارے ہاتھوں کیا ہو گیا ہے؟

اسی طرح اگر اس موقع پر جنگ ہوتی تو جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہو بھی جاتی لیکن مسلمانوں کا بھی نقصان ہوتا، ان کے بھی بہت سارے افراد شہید ہو جاتے۔ لیکن اس صلح کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سارے محفوظ ہوئے اور دعوت کے دروازے کھل گئے، باقی قبائل تک جانا آسان ہو گیا اور آئندہ پھر فاتح ہو کر مکہ میں داخل ہوئے ہیں۔ تو مسلمانوں کی طاقت بھی کمزور نہیں ہوئی اور اللہ نے مزید فتوحات کا دروازہ بھی کھول دیا۔ جنگ ہو کر اگرچہ فتح ہوتی لیکن جنگ نہ ہونے پر جو فتوحات ہیں وہ جنگ کی فتوحات سے بھی زیادہ ہیں۔

﴿وَ هُوَ الَّذِیۡ کَفَّ اَیۡدِیَهُمۡ عَنۡکُمۡ وَ اَیۡدِیَکُمۡ عَنۡهُمۡ بِبَطۡنِ مَکَّةَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ اَظۡفَرَکُمۡ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرًا ﴿۲۴﴾﴾

یہ جو میں نے پہلے کہا تھا کہ پچاس مشرک آئے تھے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کریں، آپ کو معاذ اللہ قتل کریں تو صحابی رسول محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ آیت ان کے بارے میں ہے کہ اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل نہیں کر سکے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا۔

﴿بِبَطۡنِ مَکَّةَ﴾.... اب بطنِ مکہ کا معنی یہ ہے کہ مکہ میں کا واقعہ ہے حالانکہ یہ مکہ میں کا واقعہ تو نہیں ہے، حدود حرم سے باہر کا واقعہ ہے لیکن حدودِ حرم کے قریب ہونے کی وجہ سے بطنِ مکہ کہہ دیا۔

احناف کی رائے یہ ہے کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ حدودِ حرم میں شامل ہے اور اس آیت سے احناف کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

﴿هُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡکُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَ الۡهَدۡیَ

مَعۡكُوۡفًا اَنۡ يَّبۡلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَ لَوۡ لَا رِجَالٌ مُّؤۡمِنُوۡنَ وَ نِسَآءٌ مُّؤۡمِنٰتٌ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡهُمۡ اَنۡ تَطَئُوۡهُمۡ فَتُصِيۡبَكُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ۚ لِيُدۡخِلَ اللّٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ﴾

یہی لوگ کافر ہیں جنہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا اور اس ھدی کو بھی روکا جس نے اپنے ذبح ہونے کی جگہ پر جانا تھا۔ اگر ایسے ایمان والے مرد اور ایسی ایمان والی عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم نہیں جانتے، اور تمہیں یہ خطرہ بھی نہ ہوتا کہ تم ان پر چڑھائی کر دو گے تو تمہارے اور مشرکین کے درمیان جنگ بپا ہو جاتی اور تمہاری فتح ہو جاتی لیکن بعد میں تمہیں افسوس ہونا تھا اس لیے اللہ نے جنگ کی نوبت آنے ہی نہیں دی۔ ایسا کیوں ہوا تاکہ یہ لوگ قتل نہ ہوں بلکہ زندہ رہیں اور اللہ کی رحمت میں داخل ہوں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے۔

﴿لَوۡ تَزَيَّلُوۡا لَعَذَّبۡنَا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۲۵﴾﴾

ہاں اگر مکہ میں رہنے والے مسلمان کفار سے بالکل الگ تھلگ ہوتے تو ہم کفار کو دردناک عذاب دیتے لیکن چونکہ مسلمان کفار کے ساتھ مکس تھے تو درمیان میں شہید ہو جاتے۔

﴿اِذۡ جَعَلَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الۡجَاهِلِيَّةِ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَاَلۡزَمَهُمۡ كَلِمَةَ التَّقۡوٰى وَكَانُوۡۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهۡلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴿۲۶﴾﴾

جب کفار نے اپنے دلوں میں جاہلیت والی حمیت کو جگہ دی تو اللہ نے کرم یہ کیا کہ اطمینان اور سکون اپنے رسول اور ایمان والوں کے دل میں ڈال دیا۔ مشرکین کتنی ضدی باتیں کر رہے ہیں کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہیں لکھنا! "رسول اللہ"

نہیں لکھنا! اس سال واپس چلے جاؤ آئندہ سال آنا! اللہ فرماتے ہیں کہ وہ جاہلیت کی باتیں کرتے ہیں اور خدا نے مسلمانوں کو تحمل عطا فرمایا کہ تم نے برداشت کرنا ہے۔

﴿وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ اور مسلمانوں کو خدا نے کلمہ تقویٰ یعنی کلمہ توحید عطا کیا اور دنیا میں مستحق بھی اس کے مسلمان ہی تھے، اور اس کے بدلے میں اللہ جو اجر دے گا یہ مسلمان اہل بھی اس کے ہیں۔

عمرہ کا خواب سچا ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾

اللہ نے اپنے پیغمبر کے خواب کو سچا کر دکھایا.

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ماضی تحقق کے لیے آتا ہے۔ یعنی جس بات کا آئندہ زمانے میں وقوع یقینی ہو تو اس بات کو ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا یہ بلاغت اور کلام عرب کا تقاضا ہے۔ تو چونکہ خواب نے سچا ہونا تھا تو فرمایا: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ﴾ کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کے خواب کو سچ کر دکھایا یعنی ضرور سچا ہو گا۔

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ﴾

تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے امن کے ساتھ، اپنے سروں کا حلق کراؤ گے یا سروں کا قصر کراؤ گے۔ اور تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

اس موقع پر یعنی سن 7 ہجری عمرۃ القضا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق نہیں کروایا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر کروایا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے بال مبارک قینچی سے کاٹے تھے۔

﴿فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾﴾

جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اللہ جانتے ہیں اس لیے اللہ نے خواب پورا ہونے سے پہلے ہی ایک قریب کی فتح تمہیں عطا فرما دی ہے۔

غلبہ برہانی اور غلبہ عملی:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾﴾

وہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے اور اس کی گواہی کے لیے اللہ ہی کافی ہے۔

غلبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے غلبہ برہانی اور ایک ہے غلبہ عملی۔ غلبہ برہانی یعنی تمام ادیان پر دینِ محمد کا غالب ہونا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہو چکا ہے اور غلبہ عملی یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں ہو چکا ہے اور پورے کرہ ارض پر غلبہ عملی یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہو گا ان شاء اللہ العزیز۔

اگر ہمارے دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئیں تو یہ دعا کریں کہ اللہ ہمیں ان کا ساتھی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین) فتنوں کا دور ہے اور ایمان ہمارا بہت ضعیف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آجائیں اور ہم ڈگمگا جائیں۔ یہ جو عموماً ہمارے ہاں روزانہ بحث ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آنے والے ہیں، امام مہدی کے ظہور کی ساری نشانیاں پوری ہو گئی ہیں، آج آئے اور کل آئے۔ میں بیانات پر جاتا ہوں تو بعض لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کا کیا خیال ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آدمی اپنی اوقات کے مطابق خیال ظاہر کرے، میں اوقات سے بڑھ کر خیال کو ظاہر نہیں کرتا! بس میں کہتا ہوں کہ آپ اس بات کو چھوڑیں! جو ہمارے ذمہ کام ہے ہم وہ کریں۔ بسا اوقات انسان اپنے کاموں سے ہاتھ کھینچ کر بیٹھ جاتا ہے، اپنے ذمہ جو کام ہے وہ بھی چھوڑ دیتا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنے والے ہیں، بس آج نہیں تو اگلے

سال یا اس سے اگلے سال، بس دو چار سال ہیں جب وہ آئیں گے تو پھر کام کریں گے۔

میں کہتا ہوں کہ وہ نہ آئے تو پھر کیا ہو گا؟! بھائی! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے بھی تو ہماری ذمہ داریاں ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہیں، وہ آجائیں گے تو ہم ان کے سپاہی ہیں اور اگر ہماری زندگی میں نہ آئے تو ہماری نیت تو ہے کہ ہم ان کے سپاہی ہیں، اس لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھیں، بس اپنے ذمہ جو کام ہے اسے جاری رکھیں۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ﴾ حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہاں دیکھیں کہ اللہ نے محمد کے ساتھ "رسول اللہ" کی وضاحت کی ہے۔ اس لیے کہ سہیل بن عمرو نے کہا تھا کہ محمد بن عبد اللہ لکھو، محمد رسول اللہ نہ لکھو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاٹ دو۔ حضور نے اس پر تحمل کیا، ضبط کیا اور اس معاہدے کی وجہ سے "رسول اللہ" کا لفظ کاٹا ہے تو اللہ نے ہمیشہ کے لیے قرآن کا حصہ بنا کر نازل فرما دیا کہ اب قیامت تک محمد کے ساتھ "رسول اللہ" پڑھا جائے گا، لکھا جائے گا۔ انہوں نے وقتی طور پر کٹوایا تھا لیکن اللہ نے مستقل حصہ بنا دیا۔

صحابہ کرام کی صفات:

﴿وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا﴾

جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں وہ کفار کے مقابلے میں سخت ہیں، آپس میں نرم ہیں، تم دیکھو گے کہ وہ رکوع کرتے ہیں، سجدے کرتے ہیں، اللہ کا فضل اور اللہ کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔

﴿سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾

کثرتِ سجود کی وجہ سے ان کے چہرے پر نشان نظر آتے ہیں۔

اس نشانی سے مراد وہ ظاہری نشان نہیں ہے جو سجدہ کی وجہ سے پیشانی پر پڑ جاتا ہے بلکہ اس سے مراد نورِ تقویٰ ہے جو تہجد والے شخص کے چہرے پر نظر آتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے چہرے پر یہ نور نظر آتا ہے۔ اگر کسی تہجد گزار کے چہرے پر نور نظر نہ آئے تو اپنی آنکھ کا قصور سمجھا کریں، ایسے نہیں کہ کوئی شخص تہجد بھی پڑھے اور آپ کہیں کہ یار! اس کے چہرے پر نور تو نظر نہیں آرہا بلکہ یوں سمجھنا کہ نور تو ہے لیکن مجھے نظر نہیں آرہا۔ آدمی کو بخار ہو تو میٹھا انگور بھی آدمی کو موافق نہیں آتا۔ اب یہ نہ کہو کہ انگور کھٹا ہے، یہ کہو کہ انگور تو ٹھیک ہے لیکن میری زبان کا ذائقہ ٹھیک نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح پانی بالکل صاف ہوتا ہے لیکن جس بوتل میں ہوتا ہے اس کا رنگ کالا ہو تو صاف پانی بھی کالا نظر آتا ہے۔ تو تمہاری آنکھوں کے شیشے چونکہ کالے ہیں اس لیے ہر چیز کالی نظر آتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾

اللہ نے فرمایا کہ صحابہ کے اوصاف تورات میں بھی بیان کیے گئے ہیں اور انجیل میں بھی بیان کیے گئے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ فرمایا:

﴿كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾

ان کی مثال ایسے ہے جیسے کھیتی ہو، جس نے پہلے تو اپنی کونپل نکالی ہو، پھر اس کو مضبوط کیا ہو، پھر تھوڑی سی موٹی ہوئی ہو، پھر اپنے تنے کے سہارے کھڑی ہوئی ہو کہ کسان اس کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ اللہ کیوں کرتے ہیں تاکہ اس سے کافروں کا دل جلے۔

اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال کیوں دی ہے؟ اس لیے کہ ایک وقت

وہ تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تھے۔ پھر آپ کے ساتھ حضرت خدیجہ، حضرت علی، حضرت زید بن حارثہ، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم؛ یہ تھوڑے سے افراد تھے، پھر چند ایک غلام ملے، یوں آہستہ آہستہ ایک وقت آیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ دنیا میں اس قدر قوت والے ہوئے کہ ان کو دیکھ کر جلنے والا کافر ہی ہو سکتا ہے، مسلمان نہیں ہو سکتا۔

البتہ اس آیت کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالنا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی قوت کو دیکھ کر جلنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے یہ نتیجہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طاقت کو دیکھ کر جلنے والا یہ کافروں والا کام کرتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھ کر جلنا مسلمانوں کا کام نہیں ہے یہ کافروں کا کام ہے۔ تو کافر ہونا اور ہے اور کافروں کا طرز اختیار کرنا اور ہے۔ جیسے حدیث میں ہے:

مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ.[173]

اب دیکھو! یہاں بالکل صریح ہے کہ جو جان بوجھ کر نماز چھوڑتا ہے تو اس نے کافروں والا کام کیا۔ جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتا بلکہ پریشان ہوتا ہے وہ کافروں والا کام کرتا ہے۔ لہذا اس بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہیں دیتے۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾﴾ اللہ نے ایمان والوں اور نیک اعمال کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی مغفرت کرے گا اور ان کو اجر عظیم دے گا۔

اللہ پاک ہمیں قرآن سمجھنے کی اور سمجھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

173۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ج2 ص299 رقم الحدیث 3348

سورۃ الحجرات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۝۱﴾

قرآن کا مخاطب خود کو سمجھیے!

میں نے آپ سے کہا تھا کہ قرآن کریم کی تفسیر یا احادیث کا درس دیں یا کہیں وعظ و نصیحت کریں تو یہ ذہن سے نکال دیں کہ یہ درس عوام کے لیے ہے بلکہ یہ ذہن بنا لیں کہ یہ درس ہمارے لیے ہے۔ میں سورۃ الحجرات کے شروع میں یہ بات بطورِ خاص اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہم میں سے ہر بندہ یہ ذہن بنالے کہ اس سورت کا مخاطب میں ہوں، اگر ایسا ذہن بنائیں گے تو پھر عمل کی توفیق مل جاتی ہے۔ اگر آدمی آیات کا مخاطب خود کو نہ سمجھے تو پھر عمل کی توفیق نہیں ملتی بلکہ بندہ یہ کمزوریاں اور عیوب دوسروں میں تلاش کرتا ہے کہ یہ عیب فلاں کے اندر ہے، یہ فلاں کے اندر ہے، یہ فلاں کے اندر ہے اور جب اس کا مخاطب خود کو سمجھیں گے تو پھر یہ عیب کسی اور میں ہو یا نہ ہو بندہ اپنے اندر تلاش کرتا رہتا ہے۔

شانِ نزول:

قبیلہ بنو تمیم کے کچھ لوگ آئے۔ مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے قبیلہ کا حاکم کس کو

بنائیں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ باتیں چل پڑیں تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ قعقاع ابن معبد کو بنائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ اقرع بن حابس کو بنائیں۔ اس پر بات تھوڑی سی چل پڑی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ کے نبی موجود ہیں تو کوئی رائے نہ دیتا جب تک آپ رائے نہ لیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رائے پوچھی نہیں اور انہوں نے رائے دے دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱﴾

کہ اے ایمان والو! تم پیغمبر سے آگے مت بڑھو، اللہ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ تمہاری باتیں سنتا ہے اور تمہارے دلوں کے احوال کو جانتا ہے۔

میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آیات کے ترجمے میں محاورات کو سامنے رکھیں ورنہ آیت کا ترجمہ صحیح نہیں ہو پاتا۔ قرآن کریم ایک محاورے کے مطابق بات کر رہا ہوتا ہے تو ہمیں اسی محاورے کے طرز پر ترجمہ کرنا چاہیے۔

علماء کا احترام کرنا بھی ضروری ہے:

یہاں یہ بات سمجھیں کہ پیغمبر کا وارث عالم ہوتا ہے، جو احکام پیغمبر اور امتی کے ہوتے ہیں تقریباً اس سے ملتے جلتے احکام عالم اور غیر عالم کے ہوتے ہیں۔ اب مسجد کا امام ہے، یہ نبی تو نہیں ہے لیکن یوں سمجھیں کہ امت میں نبی کی طرح ہے۔ امت کو مسائل سمجھانے میں یہ نبی کا وارث ہے، اس لیے امت کو اس عالم کے ساتھ ادب اور احترام کا وہی معاملہ کرنا چاہیے جو ایک امت اپنے نبی کے ساتھ کرتی ہے۔ مقتدی اپنے امام کے ساتھ... مرید اپنے پیر کے ساتھ... شاگرد اپنے استاد کے ساتھ... تنظیم میں ہیں تو کارکن اپنے امیر کے ساتھ بس یہی ادب والا رویہ اختیار کرے۔ حضرات فقہاء

نے یہ لکھا ہے، اس لیے اس کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رائے لیں تو رائے دینی چاہیے اور جب رائے نہ لیں اور رائے لینے کی خواہش بھی نہ ہو تو رائے نہیں دینی چاہیے۔ اسی طرح استاد یا اپنے سے بڑا شخص اگر رائے لے تو رائے دیں اور جب تک اس کے رائے لینے کا منشا سامنے نہ آئے تو تب تک رائے نہیں دینی چاہیے اور اگر یہ خدشہ ہو کہ ہماری رائے ان کو ناگوار گزرے گی پھر تو بالکل رائے نہ دیں، بس خاموشی اختیار کریں۔ جب رائے مانگیں تو پھر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو!

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝٢﴾

اے ایمان والو! اپنی آواز پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور نبی کے ساتھ ایسی بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں احساس بھی نہ ہو گا کہ تمہارے اعمال ضائع ہو گئے ہیں۔

یہاں پر "جہر" کا معنی صرف یہ نہیں کہ اونچی آواز سے بات نہ کرو بلکہ معنی یہ ہے پیغمبر کے ساتھ تم اس طرح بات نہ کیا کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہو۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنی پست آواز سے بولتے تھے کہ بسا اوقات پوچھنا پڑتا کہ آپ نے کیا کہا ہے؟

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی آواز طبعاً بہت اونچی تھی تو وہ بہت پریشان ہوئے کہ میری تو آواز اونچی ہے، نہ چاہتے ہوئے آواز اونچی ہو جاتی ہے تو انہوں نے اپنی آواز کو پست کیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو قسم اٹھالی کہ

میں اب زندگی بھر بات ایسے کروں گا جیسے بندہ سرگوشی کرتا ہے۔

﴿کَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾... آپس میں بات کرنے کے دو مطلب ہوتے ہیں؛ ایک یہ کہ جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو اس طرح نبی کو نہ پکارا کرو! جس طرح بعض لوگ کہتے ہیں: اوئے بات سنو! تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے نہیں کہنا، ایک تو یہ خیال کرو۔ دوسرا یہ کہ جس طرح تم آپس میں بیٹھے ہو اور اونچی باتیں کرتے ہو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوں تو اسی طرح اونچی باتیں نہ کرو، تمہاری آواز پیغمبر کی آواز سے اونچی نہیں ہونی چاہیے۔

روضہ مبارک کے پاس آواز بلند کرنا ممنوع ہے:

اور جس طرح یہ حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیاوالی زندگی میں تھا اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برزخ والی زندگی میں بھی یہی حکم ہے کہ آج بھی مدینہ منورہ میں روضہ رسول پر نہ اونچی آواز سے بات کرنی چاہیے اور نہ ہی وہاں شوروغل کرنا چاہیے۔ اللہ آپ سب کو حرمین کی زیارت کی توفیق دے۔ (آمین۔ سامعین) بیت اللہ کا جمعہ اور نمازیں آپ سنیں گے تو امام بہت بلند آواز سے بولتا ہے لیکن مسجدِ نبوی کا خطبہ جمعہ سن لیں یا مسجد نبوی کی نمازیں اور تراویح دیکھ لیں تو امام کی آواز اونچی نہیں ہوتی، بہت پست آواز ہوتی ہے۔ آپ کو دونوں میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔ وہاں کے خطبات اور نمازوں سے اندازہ ہو گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یہاں مسجد نبوی میں کیسے چلنا ہے؟

اعمال ختم ہونے کا معنیٰ:

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں؛

(1): پہلا سوال تو یہ ہے کہ اللہ نے یہاں فرمایا: ﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ﴾ کہ

تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ یہ بات اتفاقی ہے کہ نیک اعمال صرف اور صرف کفر کی وجہ سے ضائع ہوتے ہیں، اگر بندہ کافر ہو جائے تو اعمال ضائع ہو جاتے ہیں لیکن اگر معصیت کا کوئی کام کرلے تو اس کی وجہ سے نیک اعمال ضائع نہیں ہوتے۔ اب یہاں جو فعل ہے یعنی ''اونچی آواز سے بات کرنا'' تو یہ فعل کفر نہیں ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا: ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کہ اے ایمان والو! اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب مومنوں کو ہے، ان میں ایمان موجود ہے۔ جب ایمان موجود ہے تو پھر ان کے اعمال کیوں ختم ہو گئے؟ ایک تو یہ سوال ہے۔

(2): اور دوسرا سوال یہ ہے کہ جس طرح ایمان لانا امرِ اختیاری ہے اسی طرح کفر بھی امرِ اختیاری ہے۔ ایک بندہ جب تک اپنے ارادہ اور اختیار سے ایمان نہیں لاتا تو اسے مومن نہیں کہیں گے، اسی طرح اگر کوئی مسلمان اپنے ارادے سے کفر اختیار نہ کرے تو اسے کافر نہیں کہیں گے لیکن یہاں فرمایا: ﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ اعمال ضائع ہوتے ہیں کفر کی وجہ سے تو گویا بندہ کافر ہو جائے گا اور اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں کافر ہو گیا ہوں حالانکہ کفر امرِ اختیاری ہے۔

تو یہ دو سوال یہاں پیدا ہوتے ہیں۔

ان کا جواب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے دیا۔ حضرت کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے اور جہر کرنے سے بچو! کیوں؟ کہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال ختم ہو جائیں گے! خطرہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنا یہ ایسے اعمال ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی اور بے

ادبی کا احتمال ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو گی۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست اور واضح ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا وہم اور گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ معاذاللہ جان بوجھ کر ایسا کام کریں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو۔ البتہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں مثلاً آواز بلند کرنا یا آگے بڑھنا نا جنہیں کرنے والا شخص ایذا اور تکلیف دینے کے ارادے سے نہ بھی کرے کرے لیکن پھر بھی ایذاء کا احتمال تو ہے۔ اس لیے اس کو مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا اور اسے معصیت کہہ دی گیا۔ پھر بعض معصیت کے کام ایسے ہوتے ہیں جس کا ارتکاب کرنے والے سے اللہ رب العزت توبہ اور نیک کام کی توفیق سلب کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص گناہوں میں پڑ کر ایک نہ ایک دن کفر تک جا پہنچتا ہے اور ظاہری بات ہے کہ کفر کی وجہ سے تمام اعمال ختم ہو جاتے ہیں اور ایسا کرنے والے نے چونکہ قصد اور ارادہ نہیں کیا اس لیے اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ اس کے اعمال ختم ہو گئے ہیں۔

یہ خلاصہ ہے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے جواب کا۔ اب اس میں دونوں سوالات کا جواب ہو جاتا ہے۔

حضور علیہ السلام گھر میں ہوں تو پکار نہ بلایا جائے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۳﴾

فرمایا کہ جو لوگ پیغمبر کے سامنے اپنی آواز کو آہستہ کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے منتخب کر لیا ہے اور ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴﴾

یہی بنو تمیم کے لوگ آئے تو ان میں اکثر لوگ چونکہ اعراب لوگ تھے تو انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کے باہر کھڑے ہو کر آوازیں لگائیں، وہ لفظ یہ تھے: "اُخْرُجْ عَلَيْنَا يَا مُحَمَّدُ!" باہر آؤ ہماری بات سنو!

اب بلانے کا یہ طرز ایسا تھا جو مناسب نہیں تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں یوں نہیں کرنا چاہیے بلکہ تم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا انتظار کرو، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو پھر ان کے سامنے بات رکھو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر چلے جائیں تو ان کو بلایا نہ کرو۔

وہ لوگ جو آپ کو بلاتے ہیں حجروں کے باہر سے ان میں اکثر ایسے ہیں کہ جو بات سمجھتے نہیں ہیں۔ یہاں ﴿اَكْثَرُهُمْ﴾ کیوں فرمایا؟ یا تو واقعتاً اکثر لوگ ایسے تھے جنہوں نے ایسے پکارا تھا اور بعض ایسے تھے کہ جنہوں نے ایسے نہیں پکارا تھا۔

اور یا ﴿اَكْثَرُهُمْ﴾ کہہ کر ان کا خیال فرمایا ہے تاکہ پریشان نہ ہو جائیں یہ بات سمجھائی کہ ان میں اکثر ناسمجھ ہیں۔ اس سے ہر بندہ سمجھے گا کہ میرے بارے میں نہیں دوسرے کے بارے میں ہے تو بات بھی ہو جائے گی اور کسی بندے کی تذلیل بھی نہیں ہو گی۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ﴾

اگر یہ لوگ رک جاتے، آواز نہ دیتے یہاں تک کہ آپ باہر تشریف لاتے تو ان کے لیے زیادہ بہتر ہوتا۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾﴾

انہوں نے جرم اگر کر بھی لیا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مہربان ہیں۔

احترام پیغمبر اور وارثِ پیغمبر:

اب یہاں جو فرمایا ﴿حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡهِمۡ﴾ یہاں ایک نکتہ سمجھیں:

1: جب پیغمبر گھر چلے جائیں تو ان کو نہ بلاؤ بلکہ ان کے آنے کا انتظار کرو۔

2: اور اگر وہ باہر آئیں تمہاری وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کسی کام کی وجہ سے تو پھر بھی ان سے مت پوچھو ﴿حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡهِمۡ﴾۔ ہاں جب تمہارے لیے آئیں گے تو پھر ان سے بات پوچھنا!

اور یہاں پر یہی مسئلہ علماء کے لیے ہیں کہ جب گھر چلے جائیں تو ان کو اپنے کام کے لیے مت بلاؤ، انتظار کرو اور جب وہ تمہارے لیے آئیں تو پھر پوچھو۔ یہ بات بہت سمجھنے کی ہے۔ اگر ہم کسی بڑے کو بلاتے ہیں تو مقصد تو شریعت ہوتی ہے۔ جب خود شریعت کہتی ہے کہ یا نہ بلاؤ تو ہمیں نہیں بلانا چاہیے۔

میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں تا کہ آدمی یہ سمجھے کہ شریعت کا مطالبہ کیا ہے؟ شریعت کا منشا کیا ہے؟ شریعت چاہتی کیا ہے؟ جب ہمارا ذہن بن جائے گا کہ ہم سارے کام اللہ کے لیے کرتے ہیں تو پھر ان معاملات میں کسی قسم کی کوئی ٹینشین نہیں ہوتی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علماء کا احترام:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں معروف ہے کہ آپ اگر کسی عالم صحابی کے پاس حدیث پاک معلوم کرنے کے لیے جاتے تو گھر کے باہر بیٹھ جاتے اور دروازے پر دستک نہیں دیتے تھے۔ جب وہ صاحب باہر تشریف لاتے تو آپ سے کہتے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں اور آپ نے ایسا کیا! آپ ہمیں بلا لیتے، آپ باہر کیوں بیٹھے ہیں؟ تو آپ فرماتے کہ عالم اپنی قوم میں نبی

کی طرح ہوتا ہے اور نبی کے بارے میں امت کو ہدایت ہے کہ ان کے آنے کا انتظار کیا جائے۔

یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمارہے ہیں! اس لیے اس بات کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔

متکلم اسلام کا معمول:

میں خود اپنی بات عرض کرتا ہوں۔ میں اگر کسی کے پاس جاؤں اور پہلے سے اطلاع دے کر جاؤں تو پھر جا کر اندر اطلاع دیتا ہوں کہ میں آگیا اور اگر میں اپنے سے بڑے کے پاس جاؤں اور اطلاع دے کر نہ جاؤں تو میرا یہ معمول نہیں ہے۔ بس میں کہتا ہوں کہ ان کو آرام کرنے دو! ہم بھی سوتے ہیں، جب ظہر کو اٹھیں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔ اگر ان کا ملاقات کا ارادہ ہوا تو مل لیں گے، نہ ہوا تو انتظار کر لیں گے۔ اس لیے ہم ناراض بھی نہیں ہوتے۔

خبر کی تحقیق کرنے کا حکم:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ ﴿۶﴾﴾

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا جو امہات المومنین میں شامل ہیں ان کے والد حارث بن ضرار بن ابی ضرار اپنے قبیلہ بنو المصطلق کے رئیس اور سردار تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا فرمایا۔ چنانچہ میں نے اسلام قبول کر لیا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اقرار بھی کر لیا۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور! میں جب اپنی قوم میں جاؤں گا تو انہیں

بھی اسلام کی دعوت دوں گا اور زکوٰۃ ادا کرنے کا کہوں گا، وہ میری بات مانیں گے، اسلام بھی قبول کریں گے اور زکوٰۃ بھی دیں گے، میں ان کی زکوٰۃ کو جمع کرلوں گا، آپ فلاں مہینہ اور فلاں وقت میں اپنا کوئی قاصد میرے پاس بھیج دیں تاکہ جو زکوٰۃ کی رقم میرے پاس جمع ہو جائے گی میں وہ اس کو دے دوں گا۔ چنانچہ حضرت حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ چلے گئے۔ انہوں نے اپنی قوم سے زکوٰۃ کی رقم وصول کرلی۔

قاصد بھیجنے کی جو تاریخ مقرر کی تھی جب وہ تاریخ گزر گئی تو ان کو شک ہوا شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کسی بات پر ناراض ہیں ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا نمائندہ ضرور بھیجتے دے۔ حارث رضی اللہ عنہ نے اپنے سرداروں سے بھی اس بات کا ذکر کی۔ سب نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جائیں اور دیکھیں کہ حقیقت حال کیا ہے؟

ادھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا، فرمایا کہ جاؤ اور ان سے زکوٰۃ وصول کر کے لاؤ۔ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ چلے گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے اور لوگوں کو پتا چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نمائندہ آرہا ہے تو کچھ لوگ ان کے استقبال کے لیے بستی سے باہر نکلے تو حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ ان کے ساتھ میری پرانی دشمنی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں۔ اس لیے وہ واپس لوٹے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ یارسول اللہ! میں تو زکوٰۃ لینے کے لیے گیا تھا لیکن وہ لوگ تو مجھے مارنے کے لیے باہر آئے ہوئے تھے اور زکوٰۃ بھی نہیں دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک دستہ دیا اور فرمایا کہ جاؤ! پہلے خوب تحقیق کرنا کہ اصل معاملہ کیا ہے اور اس کے

بعد ہی کوئی اقدام کرنا!

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہاں سے روانہ ہوئے اور ادھر سے وہ لوگ وفد کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ پتا چلے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ تو مدینہ کے قریب دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو تو حضرت خالد بن ولید نے بتایا کہ ہم تو تمہاری طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا: کیوں؟ تو حضرت خالد بن ولید نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہ کو تمہارے پاس بھیجا تھا زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے لیکن تم نے انکار کر دیا اور انہیں قتل بھی کرنے لگے تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے۔ یہ بات سن کر حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق رسول بنا کر بھیجا ہے میں نے ولید بن عقبہ کو دیکھا ہی نہیں اور نہ ہی وہ میرے پاس آئے ہیں۔ ہم تو خود پریشان تھے کہ زکوٰۃ لینے والا کیوں نہیں آیا، اس لیے ہم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہے ہیں کہ کہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے ناراض تو نہیں ہو گئے، بندہ کیوں نہیں بھیجا؟ یہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سارا ماجرا پیش کیا تو معاملہ سارا بالکل حل ہو گیا، نہ لڑائی کی نوبت آئی اور نہ قتل و قتال ہوا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾

اگر کوئی فاسق آدمی کوئی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کیا کرو، تحقیق نہیں کرو گے تو ﴿اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶﴾ نتیجہ نکلے گا کہ تم کسی قوم کو نقصان پہنچاؤ گے لاعلمی کی وجہ سے اور بعد میں پھر تمہیں ندامت اٹھانی پڑے گی۔ یہ تو ہوا مسئلہ۔

عدالتِ صحابہ کے متعلق ایک اشکال کا جواب:

اب اس سے جو قابلِ اشکال بات ہے وہ یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں قاعدہ ہے: ”اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ “صحابہ سارے عادل ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحابی فاسق تھے۔ تو اگر ضابطہ عدول کا ہے تو پھر یہ فاسق کیسے؟ اور اگر فاسق ہے تو ضابطہ کیسے؟

اس لیے یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں:

اس آیت میں فاسق سے مراد وہ خاص صحابی نہیں ہے۔ شان نزول اگرچہ یہی واقعہ ہے لیکن مراد وہ صحابی نہیں ہیں بلکہ اس آیت میں ایک ضابطہ اور قاعدہ بیان کیا ہے کہ جب بھی کوئی فاسق آدمی آئے تو اس کی خبر کی وجہ سے تم فوراً کوئی عملدرامد شروع نہ کر دینا بلکہ پہلے اس کی تحقیق کرنی ہے کہ اس کی بات ٹھیک ہے یا اس کی بات غلط ہے؟ اور یہ اس وقت ہے جب اس فاسق بندے کی خبر سے کوئی نقصان کا اندیشہ ہو، اور اگر فاسق آدمی کی خبر سے نقصان کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر فاسق آدمی کی خبر کی تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، پھر فاسق نہیں کافر آدمی کی خبر کی تحقیق کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً: آپ کے پاس آپ کے علاقے کا کوئی آدمی آتا ہے جو فاسق ہے، ڈاڑھی اس نے منڈوائی ہے، نمازیں وہ نہیں پڑھتا، شراب وہ پیتا ہے اور وہ سرگودھا کسی کاروباری سلسلے سے آیا اور آپ کو آکر ملتا ہے اور کہتا ہے کہ سردی کا موسم تھا میں آنے لگا آپ کے اباجی ملے تو انہوں نے آپ کے لیے دیسی گھی بھیجا ہے اب کوئی آپ تحقیق کریں گے؟ (نہیں۔ سامعین) تو آپ کو پتا ہے کہ ہمارے محلے کا آدمی ہے، ہمارے اباجی سے تعلق ہے تو ابو نے گھی دیا ہو گا اور سردی کا موسم ہے، تو اس کی کوئی تحقیق کرے گا؟ (نہیں۔ سامعین)

یہ فاسق نہیں بلکہ اگر آپ کے محلے کا کوئی عیسائی بھی لے آئے تو آپ لے

لیں گے۔ اس میں تحقیق کی کیا ضرورت ہے؟ تو فاسق کی خبر کی تحقیق اس وقت ہوتی ہے جب اس کی خبر پر یقین کرنے سے نقصان ہوتا ہو اور اگر اس کی خبر سے کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو پھر فاسق کی خبر کی بھی تحقیق کی ضرورت نہیں، بس اس بات کو مان لو۔ تو یہاں ایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔

صحابہ سارے عادل ہیں:

باقی جہاں تک صحابہ رضی اللہ عنہم کا معاملہ ہے تو یہ قاعدہ ہے "اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ" اس لیے صحابہ کو فاسق نہیں کہتے۔ وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے گناہ ہوئے ہیں لیکن گناہ پر وہ برقرار نہیں رہے بلکہ گناہ کے بعد ان لوگوں نے توبہ کرلی اور جب انسان گناہ کرے اور گناہ کے بعد توبہ کرے تو ایسے آدمی کو فاسق نہیں کہتے۔

صحابہ کرام کے بارے میں جب قرآن کریم میں صاف فرمایا ہے کہ:

1: ﴿أُولَٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾

2: ﴿وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾

3: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾

تو اللہ اس سے تھوڑا راضی ہوتا ہے جو نافرمان ہو، اللہ راضی اس سے ہوتا ہے جو فرمانبردار ہوتا ہے۔ اس لیے صحابہ کرام کے بارے میں عدول کا ضابطہ اپنی جگہ پر بجا ہے۔

اب دیکھو! اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کی بات کو رد بھی نہیں فرمایا اور ان کی بات پر مکمل اعتماد بھی نہیں فرمایا بلکہ فرمایا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ذرا تحقیق کرلینا! اس سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص

کوئی ایسی خبر لائے تو اس خبر کی بنا پر جلدی کوئی اقدام نہ کریں بلکہ تحقیق کر لیا کریں۔

اطاعت رسول کا حکم:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝۷﴾

جب حضرت ولید بن عقبہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا کہ بنو مصطلق والے مجھے زکوٰۃ دینے سے انکار کرتے ہیں اور قتل کرنا چاہتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے غیرت دینی کی بنا پر یہ رائے دی کہ ان لوگوں سے جہاد کرنے کے لیے مجاہدین کو بھیجا جائے اور انہیں قتل کیا جائے لیکن حضور علیہ السلام نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی خبر پر فوراً عمل کرنے کرنے کا حکم نہیں دیا کہ جا کر اس قبیلہ والوں کو قتل کر دو بلکہ حضرت خالد بن ولید کو حکم دیا کہ جا کر پہلے تحقیق کریں، اصل حقیقت معلوم کریں پھر اس کے مطابق اقدام کریں۔

تو پہلی آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ میں ایک قاعدہ بیان کیا گیا تھا اور اس آیت ﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک ہدایت کی گئی ہے کہ جب بنو مصطلق کی خبر تم نے سنی تو تمہاری غیرت دینی کو جوش آنا اپنی جگہ پر درست تھا کہ ان کے خلاف مجاہدین کو بھیجا جائے اور قتال کیا جائے لیکن رائے وہی بہتر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کی تھی کہ پہلے تحقیق کر لی جائے، پھر اقدام کیا جائے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے مشورہ لیں تو مشورہ دو لیکن یہ کوشش نہ کیا کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مشورہ

کے مطابق عمل بھی کرے، یہ بات درست نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو فہم وفراست اور دانشمندی عطا فرمائی ہے وہ تمہیں حاصل نہیں ہے، اس لیے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری رائے کے مطابق چلیں تو بہت سے معاملات میں تم نقصان میں پڑ جاؤ گے۔ اس لیے رسول اللہ سلم کی بات ماننے میں ہی خیر ہے۔

تو فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ دیکھو! تمہارے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، اگر وہ اکثر معاملات میں تمہاری بات مانیں گے تو تمہیں مشقت ہو گی۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ﴾

"لٰكِنَّ" استدراک کے لیے آتا ہے۔ استدراک کسے کہتے ہیں کہ جو "لٰكِنَّ" سے پہلے والے کلام میں جو شبہ پیدا ہوتا ہے "لٰكِنَّ" کے بعد والا کلام اس ماقبل والے شبہ کو دور کرتا ہے۔ اب اتنی بات تھی ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ﴾ کہ اس بات کو سمجھو کہ اگر اکثر معاملات دنیاوی میں رسول اللہ تمہاری بات مانیں تو تمھیں مشقت اٹھانی پڑے گی، شبہ یہ پڑتا تھا کہ صحابہ یہ چاہتے تھے کہ حضور ہماری بات مانیں، فرمایا "لٰكِنَّ" ایسے نہیں ہے جو تمہیں شک پڑ رہا ہے وہ ایسے لوگ نہیں تھے۔ ﴿حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ اللہ نے کامل ایمان صحابہ کو محبوب بنالیا تھا اور اس ایمان کو حاصل کرنا اللہ نے صحابہ کے دل میں مزین کر لیا تھا۔

حکیم الامت کی تعبیر:

یہاں پر حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں

بہترین ترجمہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا کئی مرتبہ جی چاہتا ہے کہ میں بیان القرآن لا کر سامنے رکھ کر بعض آیات کا ترجمہ سناؤں کہ حضرت تھانوی کیسا ترجمہ کرتے ہیں!

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ﴾ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

"لیکن اللہ تعالیٰ نے (تم کو مصیبت سے بچالیا اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس (کی تحصیل) کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا۔"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ ایسا اضافہ کرتے ہیں کہ اگر اس کو کاٹ لیں تب بھی ترجمہ ہے اور اس کو باقی رکھ لیں تب بھی ترجمہ ہے۔ عجیب ترجمہ ہے بیان القرآن! قرآن کریم کا ترجمہ سمجھنے کے لیے اردو میں جتنی کتابیں آئیں بیان القرآن سب سے بہتر ہے اور شاید ہی دوبارہ کوئی آئے!

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے تھے میں اردو کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتا صرف عربی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں، اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ علوم اردو زبان میں نہیں ہیں لیکن بیان القرآن کا جب میں نے مکمل مطالعہ کر لیا تو میرا ذہن بدل گیا ہے، اب میں سمجھتا ہوں کہ علوم اردو زبان میں بھی ہیں۔[174]

مسلمانوں میں صلح کرانے کا حکم:

﴿وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا﴾

یہ ایک عام مسئلہ بیان کیا ہے کہ جب مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو تمہیں چاہیے کہ تم ان کی اصلاح کرو۔ اور اگر اس کے باوجود بھی صلح نہ کریں تو پھر جو چڑھائی کرتا ہے تو اس کے خلاف دوسرے کا ساتھ دو تاکہ ظلم کا راستہ روک دیا جائے۔

174۔ حیات محدث کشمیری: ص288

﴿فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ﴾

پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو تم ان کو مارو جو زیادتی کرتی ہے یہاں تک کہ اللہ کی بات کو مانیں اور انصاف کی طرف آجائیں۔

﴿فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹﴾

اگر وہ باز آجائیں تو صلح کرادو اور انصاف کے ساتھ رہو اور انصاف کا ساتھ دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں انصاف کرنے والوں کو۔

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَ اَخَوَيۡكُمۡ﴾

اور مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان کے درمیان صلح کرادیا کرو!

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝۱۰﴾

اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

چند اہم ہدایات:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ﴾

اب یہاں ہدایات کی ہیں کہ ایمان والو کو چاہیے:

کوئی مرد کسی دوسرے مرد سے مذاق نہ اڑائے ہوسکتا ہے جس کا مذاق اڑاتا ہے وہ اس سے بہتر ہو۔

﴿وَلَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُنَّ خَيۡرًا مِّنۡهُنَّ﴾

اور ایک عورت دوسری عورت کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے جس کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ اس سے بہتر ہو جو مذاق اڑارہی ہے۔

﴿وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾

اور تم عیب نہ نکالا کرو، الزام نہ لگایا کرو ایک دوسرے پر۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ﴾

اور برے القاب سے نہ پکارا کرو۔

﴿بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِيۡمَانِ﴾

ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔

﴿وَمَنۡ لَّمۡ يَتُبۡ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝۱۱﴾

اور جو توبہ نہیں کریں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

یہاں تین مسئلے بیان فرمائے:

[1]: پہلا مسئلہ بیان فرمایا کہ ایک قوم کو دوسری قوم کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ اس قوم کے لفظ میں عورتیں شامل نہیں، کیوں کہ ﴿وَلَا نِسَآءٌ﴾ مستقل آگے آرہا ہے۔ عموماً قرآن کریم میں جہاں لفظ قوم آتا ہے وہ مرد اور عورت سب کو شامل ہوتا ہے اور یہاں مردوں کو الگ ذکر کیا عورتوں کو الگ ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو مسئلے کی اہمیت بتانا مقصود ہے کہ مذاق اڑانا جرم کتنا بڑا ہے؟ تو مردوں کو الگ سمجھایا اور عورتوں کو الگ سمجھایا۔

اور الگ اس لیے بھی کیا کہ شریعت کا مزاج بتانا مقصود ہے کہ مخلوط معاشرہ کا تصور شریعت میں ہے ہی نہیں۔ عورت مرد کا مذاق اڑائے اور مرد عورت کا مذاق اڑائے ایسا ہے ہی نہیں، اس لیے مرد مرد کا مذاق اڑاتا ہے اور عورت عورت کا مذاق اڑاتی ہے۔ تو اس لیے ﴿وَلَا نِسَآءٌ﴾ کو الگ ذکر کیا اور ﴿قَوۡمٌ﴾ مردوں کو الگ ذکر فرمایا۔ یہاں پر شریعت نے اپنا مزاج بتایا ہے کہ مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔

[2]: اسی طرح کسی پر الزام نہ لگاؤ، عیب نہ نکالو، اور برے القاب نہ دو! اب یہاں ان الفاظ کو سمجھانے کے لیے بڑے اختصار سے کام لے رہا ہوں اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کا ذکر زبان سے ہو، جس کا ذکر قلم سے ہو، جس کا ذکر اشارے سے ہو، تحریر ہو، تقریر ہو، اشارہ ہو، کسی کی نقل اتاریں وہ بھی اس میں شامل ہے، کوئی برا لقب ہو وہ بھی اس کے اندر شامل ہے، کسی کا عیب نکالیں وہ بھی اس کے اندر شامل ہے الزام لگاؤ تو اس میں شامل ہے۔ غرض مقصد یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو دوسرے مسلمان کی تذلیل کا باعث بنے، دوسرے مسلمان کی توہین کا باعث بنے، دوسرے مسلمان کی ایذاءرسانی کا باعث بنے تو اس سے بچنا چاہیے۔

ہاں البتہ بعض القاب ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی کی توہین کے لیے نہیں ہوتے اور وہ بندہ اسی لقب کے ساتھ معروف ہوتا ہے تو اس کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ "امام اعمش نے فرمایا"۔ اب "اعمش" کہتے ہیں چندھیائی آنکھوں والے کو، یہ عیب ہے لیکن معروف ہے۔ "محدث اعرج نے فرمایا۔" اب یہاں "اعرج" کا معنی لنگڑا ہے لیکن معروف اسی سے ہے تو پھر حرج کی کوئی بات نہیں۔ لیکن ویسے اس سے بہت زیادہ بچنا چاہیے۔

[3]: اور یہ جو فرمایا کہ ﴿بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِیۡمَانِ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص مؤمن ہو اور مؤمن ہونے کے بعد پھر وہ الزام لگائے اور اس کی طرف نسبت ہو گناہ کی تو یہ بہت بری بات ہے کہ ایمان کے بعد ایک شخص کی طرف گناہ کی نسبت ہو۔ تم کسی پر الزام لگاؤ کہ فلاں مسلمان گناہ بھی کرتا ہے یہ بہت بری بات ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔

ایمان والوں کو ہدایات:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اجۡتَنِبُوۡا كَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعۡضَ

الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ ﴾

یہاں تین احکام اور بیان فرمائے:

1: ﴿اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾ گمان سے بچو کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

2: ﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ تجسس سے بچو، کسی کی خفیہ باتیں کھولنے سے بچو۔

3: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ اور آپس میں ایک دوسرے کی غیبت سے بچو! کیا تم میں سے کوئی شخص چاہتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تم اس کو ناپسند کرتے ہو تو غیبت کو پسند کیوں کرتے ہو؟ اللہ سے ڈرو اللہ توبہ قبول کرتے ہیں اللہ، رحم والے ہیں۔

یہ جو فرمایا کہ گمان سے بچو تو سمجھ لیں کہ گمان کی چار قسمیں ہیں:

1: ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو حرام ہے۔

2: اور ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو واجب ہے۔

3: اور ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو مستحب ہے۔

4: اور ایک ظن اور گمان ایسا ہے جو مباح ہے۔

◆ حرام گمان یہ ہے کہ مثلاً اللہ کی ذات کے بارے میں کہ اس طرح یہ گمان کرنا اللہ تعالیٰ مجھے ہمیشہ تکلیف میں رکھیں گے، مصیبت میں رکھیں گے۔ یہ بدگمانی اللہ کی ذات کے بارے میں حرام ہے، جائز نہیں ہے۔ اسی طرح کسی اچھے مسلمان کے بارے میں بلاوجہ اور بغیر کسی قوی دلیل کے بدگمان ہونا یہ بھی حرام اور ناجائز ہے۔

◆ واجب گمان یہ ہے کہ جیسے بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کسی ایک

جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہوتا ہے لیکن اس کے متعلق قرآن و سنت میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہوتی۔ تو ایسے موقع پر ظنِ غالب پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ جیسے لڑائی جھگڑوں کے مقدمات میں قابلِ اعتماد گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ کرنا یہ حاکم اور قاضی پر واجب ہے۔

- ظنِ مستحب... ہر وہ مسلمان جس کا ظاہر اچھا ہو اور اس میں فسق کی کوئی علامت نہ پائی جائے تو اس کے بارے میں نیک گمان رکھنا مستحب ہے، اللہ رب العزت اس پر ثواب دیتے ہیں۔
- ظنِ مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں کسی بندے کو شک پڑ جائے کہ میں نے تین پڑھی ہیں یا چار پڑھی ہے تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا مباح اور جائز ہے۔

تجسس اور تحسس میں کیا فرق ہے؟:

﴿وَّ لَا تَجَسَّسُوْا﴾

یہاں لفظ "تجسس" آیا ہے۔ ایک لفظ ہوتا ہے "تحسس" دونوں میں فرق سمجھ لیں:

- تجسس کہتے ہے کہ ایسی چیز کو تلاش کرنا کہ جس کو چھپایا جا رہا ہو۔
- اور تحسس کہتے ہیں کہ اس چیز کو تلاش کرنا کہ جس کو چھپایا نہ جا رہا ہو معنی دونوں کا تلاش ہی ہے تو یہاں ﴿وَّ لَا تَجَسَّسُوْا﴾ فرمایا یہ بتانے کے لیے کہ ایسی باتیں جو پوشیدہ رکھنی چاہیے تم ان کو کھرید کھرید کر تلاش نہ کیا کرو بلکہ چھوڑ دو۔

غیبت کا وبال:

﴿وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾

یہاں صرف غیبت کے ساتھ ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡہِ مَیۡتًا فَکَرِہۡتُمُوۡہُ﴾ فرمایا یہ بتانے کے لیے کہ پچھلے بھی دونوں جرم ہیں لیکن غیبت ان سے بڑا جرم ہے، کیوں؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک شخص کسی کے بارے میں بدگمانی رکھتا ہے یا کسی کی خفیہ باتیں معلوم کرتا ہے۔ جرم تو یہ بھی ہیں لیکن چھوٹے ہیں اور غیبت کا جرم بڑا ہے کیوں؟ بدگمانی میں کسی دوسرے کے سامنے برائی کا اظہار نہیں ہوتا اور بدگمان کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے لیکن غیبت کا جرم متعدی ہے، غیبت کرنے والے کا ذاتی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں کو بتارہا ہوتا ہے۔ ایک گناہ جو لازمی ہو وہ چھوٹا ہوتا ہے اور ایک گناہ جو متعدی ہو وہ بڑا ہوتا ہے اس لیے غیبت بہت بڑا جرم ہے۔

اور حدیث پاک میں ہے: "اَلۡغِیۡبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا" [175]

غیبت؛ زنا سے بڑا جرم ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ زنا کی منشا باہ ہے اور غیبت کی منشا جاہ ہے، جاہ؛ باہ سے بڑا جرم ہے اس لیے غیبت زنا سے بڑا جرم ہے۔

جو باہ والا مسئلہ ہے یہ بہت جلدی ختم ہو جاتا ہے، ایک کانٹا چبھے ختم، دو تھپڑ لگیں ختم اور جاہ والا مرض ختم نہیں ہوتا۔ یہ حب جاہ کا مرض اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

اعراب کے دعویٰ ایمان کی حقیقت:

﴿قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَ

175۔ شعب الایمان للبیہقی: ج5 ص306 رقم الحدیث: 6741

لَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِيۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَا يَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَيۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴﴾

بنو اسد ایک قبیلہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ انہوں نے دل سے ایمان قبول نہیں کیا بلکہ یہ لوگ مدینہ کے مال میں سے کچھ مال لینا چاہتے تھے اس لیے آکر کہا کہ حضور! ہم تو مؤمن ہیں ہمیں بھی مال چاہیے اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارا احسان دیکھو! باقی لوگ تم سے لڑے ہیں اور پھر کلمہ پڑھا ہے اور ہم نے بغیر لڑے کلمہ پڑھا ہے، اس لیے ہمارا حق زیادہ بنتا ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات میں ان کے جھوٹے دعوے کی تردید کی گئی ہے۔

فرمایا: یہ دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے پیغمبر! آپ ان سے فرمادیجیے کہ تم ایمان تو نہیں لائے، البتہ یہ کہو ﴿اَسۡلَمۡنَا﴾ کہ ہم نے ظاہری طور پر خود کو تمہارے سپرد کر دیا ہے اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور اگر تم دل سے اللہ اور اس کے رسول کی بات مانوں گے تو ﴿لَا يَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَيۡـًٔا﴾ اللہ تمہارے اعمال کے اجر میں کچھ بھی کمی نہیں کرے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ لَمۡ يَرۡتَابُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾

ایمان والے تو وہ ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول کو دل سے مانتے ہیں پھر اس میں شک بھی نہیں کرتے اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مال اور جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا ہے۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

﴿قُلۡ اَتُعَلِّمُوۡنَ اللّٰهَ بِدِيۡنِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۶﴾

اے پیغمبر! آپ ان سے فرما دیجیے کہ کیا تم اللہ کو اپنے دین کی خبر دیتے ہو کہ ہم ایمان والے ہیں، دیندار ہیں، حالانکہ اللہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

﴿یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾﴾

یہ لوگ ایسے ہیں کہ آپ پر احسان جتلاتے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے ہیں۔ آپ ان سے فرما دیں کہ تم اپنا احسان مجھ پر مت جتلاؤ بلکہ اگر تم واقعی اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی۔

ایمان اور اسلام میں فرق:

یہاں صرف اتنی بات سمجھیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام میں مبدا کے اعتبار سے فرق ہے اور منتہیٰ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے یعنی دل سے ماننا اور اسلام نام ہے اپنے ظاہر کو اللہ اور اللہ کے رسول کے تابع کرنے کا۔

اب ایمان معتبر اس وقت ہو گا کہ جب آدمی دل سے تصدیق بھی کرے اور اس کا اظہار انسان کے ظاہر پر ہو۔ جس کا سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنی زبان سے کہے "لاالہ الااللہ محمدرسول اللہ" ایک مرتبہ اپنی زبان سے پورا کلمہ "لاالہ الااللہ محمدرسول اللہ" کہنا فرض ہے۔ اگر کوئی شخص یہ نہیں کہتا اور صرف دل سے مانتا ہے تو ایسا شخص مؤمن نہیں کہلا سکتا۔

ایک تو یہ آیت آپ کے سامنے آگئی اور دوسری حدیث جبرائیل ہے کہ

جب جبرائیل امین علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

"أَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِسْلَامِ" حضور! فرمایئے کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا

کہ اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کر، زکوۃ ادا کیا کر، رمضان کا روزہ رکھا کر اور اگر طاقت ہو تو بیت اللہ کا حج ادا کر۔

تو یہاں پانچ چیزیں ارشاد فرمائیں۔ پھر پوچھا:

"فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِيْمَانِ" کہ ایمان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزیں فرمائی ہیں:

أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ.

کہ اللہ کو ماننا، اللہ کے فرشتوں کو ماننا، خدا کی آسمانی کتابوں کو ماننا، اللہ کے رسولوں کو ماننا، آخرت کے دن کو ماننا اور اچھی یا بری تقدیر کو ماننا۔ یہ ایمان ہے۔[176]

تو یہاں چھ چیزیں بیان فرمائیں اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان میں فرق ہے۔

اور جب ہم میت پر جنازہ پڑھتے ہیں تو دعا پڑھتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَ كَبِيْرِنَا

176۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4695

وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا. اَللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الْإِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الْإِيمَانِ. "[177]

یہاں بظاہر معلوم ہوتا ہے اسلام اور ایمان میں فرق ہے۔ تو یہ فرق لغوی معنی اور مبدا کے اعتبار سے ہے لیکن منتہی اور انجام کے اعتبار سے دونوں میں فرق نہیں ہے۔ ایمان وہی معتبر ہو گا جس میں اسلام بھی ہو اور اسلام وہی معتبر ہو گا جس میں ایمان بھی ہو۔ اس لیے بعض موقع پر صرف اسلام کا ذکر آتا ہے اور بعض موقع پر صرف ایمان کا ذکر آتا ہے۔

ہم جنازے میں دعا مانگتے ہیں کہ اللہ زندہ رکھے اسلام پر اور موت دے ایمان پر۔ کیوں کہ ایمان نام ہے دل سے ماننے کا اور اسلام نام ہے ظاہر پر عمل کرنے کا۔ بوقت موت انسان عمل نہیں کر سکتا صرف دل سے مان سکتا ہے۔ اب ایک بندے کے ذمہ دس سال کی نمازیں ہیں، اب اس کو توبہ کی توفیق ہو گئی۔ اس نے نمازیں قضا پڑھنی شروع کر دیں۔ پانچ دن بعد موت کا وقت آ گیا۔ اب وہ دس سال کی نمازیں پڑھ تو نہیں سکتا لیکن مان تو سکتا ہے۔

ایک بندے نے بیس سال زکوٰۃ نہیں دی۔ اس نے توبہ کر لی۔ اس نے نیت کی کہ میں اپنی ساری زکوٰۃ ادا کروں گا۔ اب زکوٰۃ دے تو نہیں سکتا لیکن مان تو سکتا ہے۔ ایک شخص پر حج فرض تھا۔ اس نے ادا نہیں کیا۔ اب اس نے نیت کی کہ میں ان شاء اللہ اس سال ضرور حج کروں گا کہ اس سے پہلے موت کا وقت آ گیا۔ اب حج کر تو نہیں سکتا لیکن مان تو سکتا ہے۔

اس لیے دعا مانگی جاتی ہے کہ اے اللہ! زندگی اسلام والی دے اور موت

177۔ سنن الترمذی، رقم:1024

ایمان والی دے! آپ نے کبھی بھی کسی بزرگ کو دعا مانگتے ہوئے یہ نہیں سنا ہو گا: اے اللہ! ہم سب کا خاتمہ بالاسلام فرمادے۔ یہ دعا ہوتی ہے کہ اے اللہ! خاتمہ بالا یمان فرمادے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ موت کے وقت آدمی مان سکتا ہے اور عمل کرنا اس کے بس میں نہیں ہے تو پھر آدمی دعا ایمان کی کرتا ہے۔

اللہ ہم سب کو اسلام والی زندگی دے اور ایمان والی موت عطا فرمادے۔

آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورت قٓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قٓ ۚ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ۚ﴿۱﴾ بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ فَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا شَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ۚ﴿۲﴾﴾

سورۃ ق کی اہمیت:

حضرت ام ہشام بنت حارثہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارا گھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے ساتھ تھا، دو سال تک ہمارا تنور بھی ایک رہا جس تنور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روٹیاں پکتیں تھیں اسی میں ہماری روٹیاں بھی پکتی تھیں۔ مجھے سورت ق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن سن کر یاد ہو گئی کیونکہ جمعے کے دن خطبہ جمعہ میں سورت ق پڑھنا آپ کا معمول تھا۔[178]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں کبھی سورت ق اور اقتربت الساعۃ کی تلاوت فرماتے تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ نمازِ فجر میں بکثرت سورۃ ق کی تلاوت فرماتے تھے لیکن یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص اعجاز تھا کہ لمبی سورتوں کے باوجود آپ کی نماز بہت ہلکی محسوس ہوتی تھی۔

178۔ صحیح مسلم، رقم 873

کفار کے دو تعجبات:

﴿قٓ ۚ وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ۚ﴿۱﴾ بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ فَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا شَیۡءٌ عَجِیۡبٌ ۚ﴿۲﴾﴾

﴿قٓ﴾ یہ حروفِ متشابہات میں ہے جس کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ قرآن مجید کی قسم! مضمونِ قسم محذوف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ لوگوں کو قیامت سے ڈراتے ہیں۔ ﴿بَلۡ عَجِبُوۡۤا﴾ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ لوگ بات قبول کرتے لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انہی میں سے ایک انسان کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا گیا ہے۔ کافر لوگ یہ کہنے لگے کہ ہم مر جائیں گے، مٹی ہو جائیں گے تو کیا پھر دوبارہ اٹھیں گے؟ یہ بہت مشکل اور عجیب بات ہے۔

گویا یہ کافر دو باتوں پر تعجب کرتے ہیں:

1: نبی کے بشر ہونے پر۔

2: اس بات پر کہ دوبارہ پھر اٹھائے جائیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے مشرک اور آج کے مشرک دونوں کی فکر ایک ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ نبی بشر نہیں ہو سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ تھا اور ان کا مشاہدہ نہیں ہے، اس لیے مشاہدے کی بنیاد پر انہوں نے بشر مانا لیکن نبی نہیں مانا اور یہ نبی تو مانتے ہیں لیکن بشر نہیں مانتے اور ہم اہل السنۃ والجماعۃ بشر بھی مانتے ہیں اور نبی بھی مانتے ہیں۔

﴿قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡہُمۡ ۚ وَ عِنۡدَنَا کِتٰبٌ حَفِیۡظٌ ﴿۴﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ تم اٹھنے کی بات کرتے ہو جب تم مر جاؤ گے اور مٹی تمہارے جسم کو کھائے گی اور تمہارے جسم کو کم کر دے گی تو ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ ہم

جانتے ہیں ان اعضاء کو جن کو مٹی کم کر دے گی۔ ہمارے پاس لوح محفوظ میں سب لکھا ہوا محفوظ ہے۔

جسم کے بعض اعضاوہ ہیں جن کو مٹی نہیں کھاتی مثلاً ریڑھ کی ہڈی کا جزو اصلی جس سے انسان بنتا ہے اس کو مٹی نہیں کھاتی۔ کبھی قبر اکھڑے تو اس میں ہڈیاں پڑی ہوئیں نظر آتی ہیں، ان کو مٹی نہیں کھاتی اور بعض اعضاء کو مٹی کھاتی رہتی ہے اور جسم کم ہوتا رہتا ہے، ہم تو اس کو بھی جانتے ہیں۔

﴿بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ ۝٥﴾

اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس جب سچ آیا تھا تو ان لوگوں نے اسے اسی وقت ہی جھٹلا دیا تھا اور اب عجیب تضاد کا شکار ہوئے پڑے ہیں۔

یعنی صرف یہ نہیں کہ ان کو تعجب ہے بلکہ یہ تکذیب بھی کرتے ہیں۔ بسا اوقات انسان کو بعض چیزوں پر تعجب ہوتا ہے لیکن تکذیب نہیں کرتا۔ جس طرح ہم کہتے ہیں کہ اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا درخت ہے اور ایسا عمدہ پھل ہے! لیکن ہم تکذیب تو نہیں کرتے۔ تو یہ لوگ تعجب بھی کرتے تھے اور تعجب سے بڑھ کر تکذیب بھی کرتے تھے۔

اب دیکھیں! وہ لوگ جو تعجب کرتے تھے بلکہ انکار کرتے تھے کہ اللہ ہمارے وجود کو دوبارہ کیسے پیدا فرمائیں گے تو اس انکار کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں: یا تو یہ کہ انسان کے جسم میں موجود ہونے کی صلاحیت نہیں، یا یہ کہ اللہ ان کے موجود کرنے پر قادر نہیں ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ وجود میں صلاحیت نہ ہو تو یہ بات تو غلط ہے۔ انسان کا جسم تو موجود ہے، نہیں تھا تو موجود ہوا۔ تو صلاحیت کا انکار تو ہو نہیں سکتا۔ پھر انکار اس بات کا ہو گا کہ اللہ قادر نہیں ہے۔ تو اس کی تردید کرتے ہوئے اللہ

نے فرمایا:

قدرتِ باری تعالیٰ:

﴿اَفَلَمْ یَنْظُرُوْۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ﴿۶﴾﴾

ہماری قدرت دیکھنی ہے تو آسمان کو دیکھو! کہ ہم نے ان کے اوپر آسمان کیسے بنایا! اور اس کو خوبصورت بنایا، اس آسمان میں کسی قسم کا رخنہ نہیں پڑا!

﴿وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ﴿۷﴾﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ گاڑھ دیے اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگا دی ہیں۔ جب اللہ یہ کر سکتا ہے تو کیا تمہارے وجود کو پیدا نہیں کر سکتا؟

﴿تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰی لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ﴿۸﴾﴾

ہم نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا یہ سب اس لیے پیدا کیا تاکہ ایک تو دانائی حاصل ہو اور پھر بینائی حاصل ہو! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں دو لفظ استعمال فرمائے؛ دانائی اور بینائی ہر اس شخص کے لیے کہ جو رجوع کرتا ہے۔

علوی ماحول بابرکت ہے:

﴿وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِیْدِ﴿۹﴾﴾

ہم آسمان سے برکت والا پانی اتارتے ہیں۔ پھر اس کے ذریعے باغات اگاتے ہیں اور غلے کے دانے اگاتے ہیں جنہیں کاٹا جاتا ہے۔

اب دیکھیں! جو پانی اوپر سے نیچے آیا اس کو بابرکت فرمایا، اس لیے کہ وہاں ماحول ایسا ہے۔ ایک ہمارا ماحول ہے سفلی یعنی نیچے والا، ایک ماحول ہے علوی اوپر والا، اوپر والے ماحول میں گناہ نہیں ہیں اس لیے وہاں پر برکات زیادہ ہیں، نیچے والے ماحول میں گناہوں کی وجہ سے برکات کم ہو جاتی ہے۔

بعض ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے وجود میں برکت ہے۔ مثلاً مسجد، قرآن وغیرہ ان کے وجود میں برکت ہے۔ تو یہاں جتنے گناہ آتے رہیں گے ان کے وجود کی برکت ختم نہیں ہو گی، خارجی برکات کم ہو جائیں گی اور جو اوپر کا ماحول ہے وہاں وجود میں بھی برکت ہے اور ماحول بھی ایسا ہے کہ وہاں برکتیں ہوتی ہیں۔

یہ بات ذہن میں آئے تو ایک اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ہمارے عالم جو صوفی مزاج تھے تو انہوں نے کہا کہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اوپر ہے۔ قرائن کیا ہیں؟ کہ انسان کی توجہ جب بھی نیک کام کی طرف ہو تو اوپر جاتی ہے۔ آدمی جب دعائیں مانگتا ہے تو رجوع اوپر ہو جاتا ہے، جب نیک اعمال ہوتے ہیں تو وہ بھی اوپر جاتے ہیں۔ تو اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اوپر ہے۔

میں نے انہیں کہا کہ وجہ یہ نہیں ہے، دیکھو! ایک معاملہ ہے انسان کی روح کا اور ایک معاملہ ہے نفس کا۔ انسان جو نفس ہے وہ ہے مرغوباتِ طبعیہ کا نام جو ٹھیک نہیں ہے اور روح ایک مستقل الگ چیز ہے، روح اوپر سے آتی ہے، ہمیشہ اب یہاں کے نفسانی آمیزش میں ملوث ہو کر روح میں بھی نحوستیں آتی ہیں، روح بھی ملوث ہوتی ہے اور پھر ناپاکی کی طرف جاتی ہے نفسانی خواہشات میں ملوث ہونے کی وجہ سے۔ فرق کیا ہے کہ روح چونکہ اوپر سے آئی ہے تو روح کی ترقیات کے لیے اوپر کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور روحانی ترقیات کا نام ہے کہ انسان پاکیزگی اختیار کرے اور ناپاکیوں سے بچے۔ زمین کا ماحول ناپاکیوں کا ہے اور آسمانی ماحول پاکیوں کا ہے۔ تو جب روح کو

ترقیات چاہییں ہوں گی تو وہ اس محل کی طرف رجوع کرے گی جہاں ماحول پاک ہو گا، وہ اوپر والا ماحول ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ اوپر ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اوپر کا ماحول پاک ہے اور اوپر کے ماحول کے پاک ہونے کی وجہ سے روح کی توجہ اس طرف ہوتی ہے۔ نیچے والا ماحول چونکہ گناہوں کی وجہ سے ناپاک ہے اور اوپر کا ماحول بالکل پاک ہے، نورانی ماحول ہے، ملائکہ کا ماحول ہے، گناہوں کا تصور نہیں ہے اس لیے جب بھی تقویٰ مطلوب ہو تو روح اوپر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ اوپر ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر ماحول پاکیزہ ہے۔

رزقِ خداوندی:

﴿وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿١٠﴾﴾

اور کھجوروں کے اونچے اونچے درخت ہیں، ﴿لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ﴾ جس کے خوشے تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔

﴿رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿١١﴾﴾

یہ چیزیں ہم نے اپنے بندوں کو رزق دینے کے لیے پیدا کی ہیں۔ برکت والے پانی سے ہم بنجر زمین کو آباد کر دیتے ہیں۔ ﴿كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ﴾ جس طرح پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں اسی طرح تم بھی نکل کر ہمارے سامنے آجاؤ گے! یہ کیا مشکل ہے ہمارے لیے؟

منکرینِ انبیاء کا کچھ تذکرہ:

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ﴿١٢﴾ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿١٣﴾﴾

اب اللہ نے اپنے پیغمبر کو تسلی دی ہے کہ یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو اس سے

پہلے بھی نوح علیہ السلام کو جھٹلایا ہے اور کنویں والی قوم نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلا دیا تھا اور قوم ثمود نے بھی حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا۔ اور قوم عاد نے بھی جھٹلایا اور قوم فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا اور قومِ لوط نے بھی جھٹلایا۔

کنویں والے کون ہیں؟

﴿اَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوۡدُ﴾

حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آپ پر تقریباً چار ہزار افراد ایمان لائے اور بقیہ ایمان نہیں لائے۔ ان منکرین کی شرارتیں بڑھ گئیں تو ان کو تباہ کر دیا گیا۔ حضرت صالح علیہ السلام پر جو چار ہزار لوگ ایمان لائے تھے آپ ان کو لے کر چلے گئے اور ایک جگہ پر آباد ہوئے۔ جہاں آباد ہوئے وہاں ایک کنواں بھی تھا۔ عربی زبان میں کنویں کو "الرس" بھی کہتے ہیں۔ اس کنویں کے ساتھ جو آباد تھے اس لیے ان کو کہتے ہیں "اصحاب الرس"۔ حضرت صالح علیہ السلام کی وفات اسی جگہ پر ہوئی اور جب موت آئی تو کہا: "حَضَرَ مَوۡتٌ" کہ صالح علیہ السلام پر موت حاضر ہو گئی ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی وفات ہو گئی، اس کے بعد سے لے کر اب تک اس جگہ کا نام پڑ گیا "حضر موت"۔ یہ قوم ایک عرصہ وہاں رہی اور بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے ایک اور نبی بھیجا۔ اس قوم نے اس پیغمبر کی نافرمانی کی اور اسے قتل کر دیا تو خدا نے اس قوم کو بھی ہلاک کر دیا۔

﴿وَّ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ وَ قَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیۡدِ ﴿۱۴﴾﴾

"ایکہ" کہتے ہیں گھنے جنگل کو۔ حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے وہاں گھنے جنگلات تھے۔ "تبع" یمن کے بادشاہ کا لقب ہے۔ تو فرمایا کہ: اصحاب الایکہ نے بھی اپنے نبی کو جھٹلایا اور قوم تبع نے بھی جھٹلایا۔ ان میں

سے ہر ایک نے پیغمبر کو جھٹلایا تو ہمارا عذاب ان پر آ گیا۔

﴿اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۵﴾﴾

اور کسی کو بنا نہ سکنے کی تیسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی بناتے بناتے تھک جائے۔ اللہ نے اس وجہ کی بھی تردید فرمائی اور فرمایا: کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے پر تھک گئے ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ لوگ دوبارہ پیدا کرنے کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾﴾

تم پیدائش کی بات کرتے ہو! ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے دل کے خیالات کو بھی جانتے ہیں اور ہم تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

رگیں دو قسم کی ہیں؛ ایک وہ جو جگر سے نکلتی ہیں اور جسم میں خون پہنچاتی ہیں۔ انہیں "ورید" کہتے ہیں۔ اور دوسری ان سے باریک رگیں ہیں جو دل سے نکلتی ہیں اور خون کی لطیف بھاپ - جسے ہم روح کہتے ہیں - اس کو پورے جسم میں پہنچاتی ہیں، انہیں "شریان" کہتے ہیں۔ تو "شریان" اور "ورید" یہ اطباء کے ہاں الگ الگ ہوتی ہیں۔

لیکن عربی لغت کے اعتبار سے "ورید" رگ کو کہتے ہیں خواہ وہ جگر سے نکلے، خواہ وہ دل سے نکلے۔ یہاں ﴿الْوَرِیْدِ﴾ سے کون سی رگ مراد ہے؟ تو مفسرین فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ یہاں ورید سے مراد شریان یعنی قلب سے نکلنے والی باریک رگیں مراد ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلب کی حرکت کے بند ہونے کی وجہ سے انسان پر موت آتی ہے۔ جو رگیں جگر سے نکلتی ہیں اور خون پہنچاتی ہے ان سے

موت کا تعلق نہیں ہے، خون سے باریک جو غبار ہے جسے ہم روح کہتے ہیں موت کا تعلق اس سے ہے۔ تو جب شریان والی رگ کٹتی ہے تو بندے پر بہت جلد موت طاری ہو جاتی ہے۔ کئی بندوں کے جگر نکل جاتے ہیں لیکن بندہ نہیں مرتا لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ دل نکال کر پھینک دیں اور پھر بھی بندہ زندہ رہ جائے، ایسا نہیں ہوتا بلکہ بندہ مر جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں "ورید" سے مراد یہی رگیں لی جائیں۔

﴿وَ نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ﴾.... اس آیت کے تحت تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اصحاب الظواہر جو علماء ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہاں "قرب" سے مراد قربِ علمی ہے اور جو اصحاب باطن اور صوفیا ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد قربِ ذاتی ہے۔

معیتِ ذاتیہ کا بیان:

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اللہ کی ذات اور اللہ کی صفات میں تلازم ہے، جہاں صفت ہو گی وہاں اللہ کی ذات ہو گی، ایسا نہیں ہو سکتا کہ صفت ہو اور وہاں اللہ کی ذات نہ ہو۔ تو اگر قربِ علمی مان بھی لیں تو قربِ علمی کو قربِ ذاتی لازم ہے۔ قربِ ذاتی پھر بھی وہاں پر موجود ہو گا۔[179]

اس لیے اس سے اس وسوسے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ قربِ علمی ہے، قرب ذاتی نہیں ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہاں قرب سے مراد اتصالِ علمی اور احاطۂ علمی ہے اور صوفیاء کی رائے یہ ہے کہ یہاں قرب سے مراد صرف قربِ علمی اور احاطۂ علمی ہی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا اتصال ہے جس

179۔ مکاتیب رشیدیہ ص42

کی کیفیت اور حقیقت کسی کو معلوم نہیں لیکن یہ قرب و اتصال بلا کیف موجود ہے۔
حضرت فرماتے ہیں کہ اس پر دلائل بھی موجود ہیں مثلاً ﴿وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ﴿١٩﴾﴾،
﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾، ﴿اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ﴾ وغیرہ ایسے دلائل موجود ہیں جن سے یہ خاص قسم کی معیت ثابت ہوتی ہے۔

﴿وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾.... اس پر ایک چھوٹی سی بات مجھے یاد آ گئی۔ اب یہ سمجھانا کہ اللہ کیسے بندے کے ساتھ ہیں یہ کتنا مشکل ہے! مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اتصالے بے مثال و بے قیاس ہست رب الناس را با جانِ ناس

اللہ کا اتصال بندوں کی ذات سے ایسے ہے کہ جو بے مثال و بے قیاس ہے، اس کو سمجھانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔

﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿١٧﴾﴾

جب بندہ کوئی کام کرتا ہے تو دائیں بائیں جانب بیٹھنے والے دو فرشتے لکھ لیتے ہیں۔

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿١٨﴾﴾

جب بھی کوئی بات بندے کی زبان سے نکلتی ہے تو وہاں ایک نگران متعین ہے۔

﴿وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿١٩﴾﴾

اور موت کی بے ہوشی کا وقت یقیناً آ پہنچا اور یہی وہ چیز ہے جس سے اے انسان تو بھاگا کرتا تھا۔

﴿وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿٢٠﴾ وَ جَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا

سَآئِقٌ وَّ شَهِيْدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ

فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾﴾

قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا، یہی وعید کا دن ہے۔ ہر شخص آئے گا تو اس کے ساتھ ایک ہنکانے والا ہو گا اور ایک اس کے اعمال پر گواہ ہو گا۔ پھر کہا جائے گا کہ اسی دن کے بارے میں تو غافل تھا آج ہم نے تیرے سارے پردے ہٹا دیے ہیں۔ اب دیکھو! تمہاری نگاہ کتنی تیز ہو گئی ہے!

﴿وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾﴾

اس کا ہمنشین ایک فرشتہ کہے گا: یہ دیکھو! یہ اعمال نامہ میرے پاس محفوظ ہے۔

﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ ﴿٢٥﴾﴾

پھر دو فرشتوں کو حکم ہو گا کہ تم ہر کافر کو اور ہر سرکش کو جہنم میں ڈال دو جو نیکی سے روکنے والا تھا، حد سے تجاوز کرنے والا تھا اور شک ڈالنے والا تھا۔

﴿الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿٢٦﴾﴾

جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنا رکھا تھا، اس لیے تم اس شخص کو سخت عذاب میں ڈال دو!

﴿قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ

لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٢٩﴾﴾

اور شیطان کہے گا کہ اللہ! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ خود گمراہ ہوا ہے۔ اللہ فرمائیں گے: میرے پاس اب جھگڑا نہ کرو، ہم تو پہلے ہی تمہیں تمہارے برے انجام کی وعید سنا چکے ہیں اور جو بات ہمارے ہاں طے شدہ ہو تو وہ تبدیل نہیں ہوتی اور

ہم بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتے۔

جہنم سے سوال اور اس کا جواب:

﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝٣٠﴾

اس وقت کو بھی یاد رکھو جب ہم جہنم سے کہیں گے کہ کیا تمہارا پیٹ بھر گیا ہے؟ تو وہ کہے گی: کیا کچھ اور بھی ہے؟

قرآن کریم میں ہے:

﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝١١٩﴾[180]

کہ اللہ جہنم کو بھر دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ جب جہنم کو بھر دیں گے تو پھر کیوں پوچھیں گے کہ کیا تمہارا پیٹ بھر گیا ہے؟ اور وہ کہے گی کہ اور چاہیے! بظاہر دونوں میں تعارض ہے۔

جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ جہنم کو تو لوگوں سے بھر دیا جائے گا اور پھر پوچھیں گے کہ کیا تم بھر چکی ہو اور جہنم کہے گی کہ مجھے اور چاہیے تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ جہنم میں مزید جگہ ہو گی، بلکہ یہ صرف تحدیداً اور زجر کے لیے ہو گا کہ اور لاؤ... اور لاؤ... جو لوگ پہلے سے جہنم میں ہوں گے تو اس سے ان پر خوف طاری ہو جائے گا۔

متقین کا انعام:

﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ۝٣١ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ۝٣٢﴾

180۔ ھود 119:11

جنت کو متقین کے بالکل قریب کر دیا جائے گا اور یہ قطعاً دور نہیں ہو گی۔

یہی ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ یہ چیز ہر اس بندے کے لیے ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو اور اپنی حفاظت کرنے والا ہو۔

﴿مَنۡ خَشِیَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَیۡبِ وَ جَآءَ بِقَلۡبٍ مُّنِیۡبِۣ ﴿۳۳﴾﴾

جو اللہ سے بن دیکھے ڈرتا ہو اور رجوع کرنے والا دل لے کر آتا ہو۔

﴿ادۡخُلُوۡهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡخُلُوۡدِ ﴿۳۴﴾ لَهُمۡ مَّا یَشَآءُوۡنَ فِیۡهَا وَلَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ ﴿۳۵﴾﴾

حکم ہو گا: امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔

جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس تو بہت کچھ اور بھی ہے۔

﴿وَ کَمۡ اَهۡلَکۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا فَنَقَّبُوۡا فِی الۡبِلَادِ ؕ هَلۡ مِنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۳۶﴾﴾

ان لوگوں سے پہلے کتنے لوگوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو طاقت میں اِن سے بڑھ کر تھے، وہ لوگ مزید قوت حاصل کرنے کے لیے شہروں میں پھرتے تھے، کیا ان کے بھاگنے کی کوئی جگہ ہے؟

عبرت کون حاصل کرتا ہے؟

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَهٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ هُوَ شَهِیۡدٌ ﴿۳۷﴾﴾

اس میں اس شخص کے لیے عبرت کا سامان ہے جو دل رکھتا ہو یا دل سے متوجہ ہو کر کان لگاتا ہو۔

یہاں پر دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا کہ عبرت وہ شخص حاصل کرتا ہے جس کے پاس قلب ہو، قلب سے مراد عقل سلیم ہو اور جس کے پاس عقل تو کم ہو

لیکن توجہ سے سنتا ہو۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ یہاں دو قسم کے بندوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک ﴿لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ﴾ وہ لوگ جو مشائخ ہیں اور دوسرا ﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ﴾ کہ جو سالکین ہیں۔ ایک ہوتا ہے بڑے مقام پر فائز ہونا اور ایک ہوتا ہے اس کے پیچھے چلنے والا۔ بڑے مقام والے کو تو شرح صدر ہوتا ہے اور دوسرے کو شرح صدر نہیں ہوتا لیکن بات توجہ سے سنتا ہے اور اعتماد کر لیتا ہے۔

﴿وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾﴾

ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کو چھ دنوں کی مقدار میں پیدا فرمایا۔ ہمیں اس بنانے میں تھکاوٹ کا احساس تک بھی نہیں ہوا۔

مخالفت کا حل؛ صبر اور تسبیحِ خداوندی:

﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾﴾

میرے پیغمبر! آپ ان کی باتوں پر صبر کریں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیں سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے کے بعد۔ رات کے حصوں میں بھی اللہ کی تسبیح کرو اور سجدوں کے بعد بھی تسبیح کرو!

یہ بات کیوں سمجھائی؟ اس لیے کہ جب کوئی بندہ مخالفت کرتا ہے اور مخالفت سن کر تکلیف ہو تو تکلیف سے بچنے کا طریقہ خود کو کسی دوسرے کام میں مشغول کرنا ہے۔ بس اس سے تکلیف کم ہو جائے گی۔ پھر مشغولیت اچھی ہو تو سبحان اللہ کیا

کہنے! تو اللہ نے فرمایا کہ میرے پیغمبر! ان کی باتوں پر صبر کیجیے! باقی جو تکلیف ہوتی ہے اس سے بچنا کیسے ہے؟ تو فرمایا: ﴿وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ کہ عبادات میں خود کو مشغول کر لو، صبح شام ذکر و اذکار میں لگ جاؤ! اب یہ پریشانی کم ہو جائے گی۔ دیکھو! قرآن نے جو نسخہ بتایا ہے اس نسخے کو پلے باندھ لو۔

جب بھی آپ دین کا کام کریں گے تو مخالفت ہو گی۔ اس کا پہلا حل تو ہے کہ اس مخالفت پر صبر کریں اور دوسرا یہ کہ خود کو کسی اور کام میں مشغول کریں۔ وہ دوسرا کام تسبیحات اور عبادات کا ہے۔ اس سے آدمی کو صبر کی توفیق ملتی ہے اور آدمی تسلی اور دل جمی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔

ہمارا یہ بہت بڑا المیہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص مخالفت کرے تو ہم اس کی مخالفت کا رونا روتے ہیں، ہر وقت مخالفت کا ذکر کرتے ہیں، پھر جواب میں مخالفت شروع کرتے ہیں، اس سے نقصان ہوتا ہے اور نفع نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بندہ آپ کی بات نہ سمجھے یا آپ کی مخالفت کرے تو آپ اس کی مخالفت نہ کریں، اس کی مخالفت کا ہر وقت ذکر نہ کریں، اس سے غیبت کی بیماری شروع ہو جاتی ہے اور آپس میں نفاق آتا ہے، افتراق آتا ہے، لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے مواقع پر بس خاموش ہو جاؤ! اب جب خاموش ہوں گے تو تکلیف ہو گی، اس تکلیف سے بچنے کے لیے اپنی توجہ ہٹا دو! جب بندے کی توجہ ہٹ جاتی ہے تو تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ ہم اپنی توجہ نہیں ہٹاتے بلکہ پھر اسی بات پر، پھر اسی بات پر دھیان دیتے ہیں اور اس کا خیال لاتے رہتے ہیں تو پھر اس سے بہت نقصان ہوتا ہے۔

﴿وَ اسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾﴾

سنو! جب ایک منادی بہت قریب سے آواز دے گا۔

﴿يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾﴾

اس دن ہر بندہ یقیناً اس چیخ کو سنے گا اور یہی وہ دن ہو گا جب اٹھ کر سامنے آئیں گے۔

﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ اِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿٤٤﴾﴾

ہم ہی ہیں جو زندہ بھی کرتے ہیں اور مارتے بھی ہیں اور ہماری طرف ہی تمہارا لوٹنا ہو گا۔ اس دن زمین پھٹ کر ان کو اس طرح باہر کرے گی کہ وہ لوگ تیزی سے چل پڑیں گے۔ یہ جمع کرنا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔

﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾﴾

جو کچھ یہ کہتے ہیں ہم خوب جانتے ہیں، آپ ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔ آپ قرآن کریم سے ذریعے نصیحت ہر اس بندے کو کریں جو وعید سے ڈرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ڈرے گا تب اس پر اس وعید کا اثر ہو گا اور جو ڈرتا نہیں ہے اس پر کیا اثر ہو گا! اللہ ہم سب کو دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الذّٰریات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ﴿۳﴾
فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۴﴾﴾

تین قسم کی مخلوق کی قسم:

اللہ رب العزت نے اس سورت کے شروع میں تین قسم کی مخلوقات کی قسمیں کھائی ہیں: ایک مخلوق ہے ارضی، ایک مخلوق ہے فضائی اور ایک مخلوق ہے سماوی۔ فرمایا:

﴿وَالذّٰرِیٰتِ ذَرۡوًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا ۙ﴿۲﴾ فَالۡجٰرِیٰتِ یُسۡرًا ۙ﴿۳﴾
فَالۡمُقَسِّمٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۴﴾﴾

قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد و غبار کو اڑاتی ہیں، اور پھر ان بادلوں کی جو بوجھ اٹھاتے ہیں اور پھر ان کشتیوں کی جو آسانی سے چلتی ہیں اور فرشتوں کی جو اللہ کے حکم سے چیزیں تقسیم کرتے ہیں۔

فرشتے یہ سماوی مخلوق ہیں۔ ہوائیں اور کشتیاں یہ ارضی مخلوق ہیں اور درمیان میں بادل یہ فضائی مخلوق ہیں۔ تو اللہ نے ان تینوں کی قسم کھائی ہے۔ پھر فرمایا:

﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝۵ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝۶﴾

اور جو وعدہ تمہارے ساتھ ہے وہ سچا ہے، اور جزا اور سزا کا دن یہ واقع ہو کر رہنا ہے۔

آسمان کی خوبصورتی:

﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷﴾

پھر آسمان کی قسم کھائی۔ یہاں "حُبُكِ" یہ جمع ہے "حبیکہ" کی۔ حبیکہ ان دھاریوں کو کہتے ہیں جو کپڑے میں بن جاتی ہیں، راستے بھی چونکہ دھاریوں کی طرح سیدھے ہوتے ہیں اس لیے راستوں کو بھی "حُبُكِ" کہہ دیتے ہیں۔ اس لیے بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ قسم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے۔ راستوں سے وہ راستے مراد ہو سکتے ہیں جن میں ملائکہ چلتے ہیں۔

اور ایک کپڑے میں کئی دھاریاں ہوں تو اس سے کپڑا خوبصورت بن جاتا ہے۔ اس لیے بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ قسم ہے آسمان کی جو خوبصورت اور حسن و زینت والا ہے، کیونکہ اس میں جب راستے ہوں گے تو خوب صورت بنے گا۔

تردیدِ منکرین:

﴿اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸﴾

یہ مضمونِ قسم ہے کہ تم لوگ مختلف اور متضاد باتوں میں پڑ گئے ہو!

﴿يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝۹﴾

اس قیامت سے یا اس قرآن سے وہی شخص محروم ہوتا ہے جس کے مقدر میں محروم ہونا لکھا ہے۔ دلائل موجود ہیں تو آدمی کو مان لینا چاہیے لیکن جس کی قسمت میں محرومی ہو وہ محروم ہو کر رہے گا۔

﴿قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝١٠﴾

تباہ ہو جائیں وہ لوگ جو اٹکل کی باتیں کرتے ہیں، ظن اور گمان سے چلتے ہیں۔

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝١١ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٢﴾

جو ایسی غفلت اور بے خبری میں پڑے ہوئے ہیں کہ سب بھول گئے ہیں۔

ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کا دن کب ہو گا؟

﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ۝١٣﴾

فرمایا کہ ان کو بتاؤ کہ جب تمہیں آگ پر تپایا جائے گا تو وہ دن قیامت کا ہو گا۔

تو دن متعین نہیں کیا بلکہ ان کی تہدید اور عذاب ان کو سنا دیا گیا۔ جیسے کوئی شخص سزائے موت کا قیدی ہو اور اس کو پتا تو ہے کہ سزا ہونی ہے۔ وہ مذاق میں کہتا ہے کہ کب ہے ہماری تاریخ؟ کب پھانسی چڑھیں گے؟ تو اس کو بتایا جائے کہ جب تم سولی پہ چڑھو گے تو وہی تمہارا دن ہے سزا کا۔ تو تعین نہیں بتائی جا رہی دن کی بلکہ سزا بتائی جا رہی ہے۔

﴿ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝١٤﴾

قیامت کے دن کہا جائے گا کہ اپنے کرتوتوں کے مزے اب چکھو، یہی وہ عذاب ہے جس کو تم جلدی مانگتے تھے۔

متقین کا انعام:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝١٥﴾

متقین کے بارے میں فرمایا کہ بے شک متقین باغات میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے۔

﴿اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝١٦﴾

جو نعمتیں ان کا پروردگار ان کو دے گا وہ اس کو لے رہے ہوں گے، یہ متقین اس سے پہلے دنیا میں نیکیاں کرتے تھے۔

رات کے قیام کی فضیلت:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿١٨﴾﴾

وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور سحری کے وقت اٹھ کر پھر اللہ سے استغفار بھی کرتے تھے کہ شاید ہم آپ کی عبادت نہیں کر سکے۔

یہ جو ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ ہے اس میں لفظ "يَهْجَعُوْنَ" یہ ہجوع سے بنا ہے جس کا معنی ہے رات کو سونا۔ اس سے پہلے جو "مَا" ہے اس میں دو احتمال ہیں:

[1]: اگر "مَا" کو موصولہ بنائیں تو معنی یہ ہو گا کہ "وہ رات کو بہت کم سوتے تھے۔" یعنی جاگتے زیادہ تھے۔

[2]: اور اگر "مَا" کو نافیہ بنائیں تو معنی ہو گا کہ "وہ بہت کم بیدار ہوتے تھے۔" یعنی رات کا زیادہ حصہ سوتے تھے اور بہت کم حصہ جاگ کر گزارتے تھے۔

اب ترجمے دونوں ٹھیک ہیں۔ "مَا" موصولہ بنائیں یا نافیہ بنائیں۔

حضرت حسن بصری، حافظ ابن جریر طبری اور بہت سے مفسرین نے اپنے ذوق پر "مَا" کو موصولہ قرار دیا ہے کہ یہ لوگ ایسے تھے جو کم سوتے تھے یعنی جاگتے زیادہ تھے۔ راتوں کو عبادت کرتے تھے، نماز میں مشغول رہتے تھے۔

حضرت ابن عباس، امام قتادہ، امام مجاہد وغیرہ نے "مَا" کو نافیہ قرار دیا ہے

کہ یہ لوگ ایسے تھے جو سوتے زیادہ تھے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس صفت میں وہ تمام لوگ شامل ہو جاتے ہیں جو رات کے کسی حصہ میں اٹھ کر عبادت کر لیتے ہیں، چاہے شروع رات میں چاہے آخر رات میں، یہ فضیلت سب کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جب یہ تفسیر کریں گے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو رات کا کچھ حصہ جاگتے ہیں تو بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہیں سوتے وہ بھی اس فضیلت میں شامل ہیں۔

محتاج کی امداد کا حکم:

﴿وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ١٩﴾

اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے مال میں سوال کرنے والوں اور محروم لوگوں کا حق ہوتا ہے۔

دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں؛ بعض وہ جو محتاج ہوتے ہیں اور مانگتے ہیں، بعض ایسے ہوتے ہیں جو محتاج تو ہوتے ہیں لیکن مانگتے نہیں ہے۔ تو مؤمنین متقین کی صفت یہ ہے کہ اگر محتاج مانگے تو اس کو بھی دیتے ہیں اور جو محتاج ہو اور نہ مانگے تو اس کو بھی دیتے ہیں۔ یہاں لفظ "محروم" فرمایا کیونکہ بندہ محتاج ہو اور نہ مانگے تو محروم رہ جاتا ہے۔ تو فرمایا کہ متقین وہ لوگ ہیں کہ جو شخص نہ مانگنے کی وجہ سے عام طور پر محروم رہ جاتا ہے یہ اسے بھی دیتے ہیں، تو یہ لوگ صرف مانگنے والے کو نہیں دیکھتے بلکہ تلاش کرتے ہیں کہ مستحق کون ہے؟ تو یہ کسی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے۔

اور لفظ کیسا استعمال کیا ﴿وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ﴾ یہ لوگ صدقات اس طرح دیتے ہیں کہ جیسا ان کے مال میں حق ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس حق کو ادا کرتے ہیں۔ مطلب کہ یہ لوگ انتظار نہیں کرتے کہ جب کوئی مانگے گا تو پھر دیں گے بلکہ کوئی

نہ مانگے اور محتاج ہو تو یہ تب بھی دیتے ہیں۔

﴿وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿٢٠﴾﴾

اور جو اللہ کی ذات پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اب دیکھو! کبھی پانی ہے، کبھی سبزیاں ہیں، کبھی نہریں ہیں.... کتنی چیزیں خدا نے زمین میں پیدا کیں۔ بندہ ایک چیز پر غور کرے تو پتا چلتا ہے کہ اس کو پیدا کرنا ہمارے اختیار میں نہیں تھا، اس کو نکالنا ہمارے اختیار میں نہیں تھا لیکن اللہ کی ذات ایسی ہے جو ان چیزوں کو نکالتی ہے۔ یوں ایک قسم کی زمین سے مختلف قسم کی نباتات نکلتی ہیں۔ میں دلائل میں تفصیل بیان نہیں کرتا، میں صرف اشارہ کر رہا ہوں۔

انسان میں قدرت کی نشانیاں:

﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

اور خود تمہاری ذات میں بھی اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟

﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ کا تعلق پیچھے ﴿وَفِي الْاَرْضِ﴾ کے ساتھ ہے کہ جس طرح زمین میں دلائل موجود ہیں اسی طرح کتنے دلائل ہیں جو خود تمہاری ذات میں موجود ہیں۔ آدمی اپنی ذات کو دیکھ لے کہ آنکھ کتنی چھوٹی سی ہے اور دیکھتی کتنا زیادہ ہے۔ یہ اللہ کریم کے علاوہ کون ہے جو اس کو سنبھالتا ہے؟ ایک چھوٹی سی نعمت کو لے لو تو بندے کو خدا کی ذات پر یقین ہوتا ہے۔ دنیا میں چھوٹی سی چیز انسان بناتا ہے تو وہ تھوڑی دیر بعد خراب ہو جاتی ہے لیکن اللہ کی پیدا کردہ چیز کے فوائد بہت زیادہ ہوتے ہیں اور اتنا استعمال ہوتی ہے لیکن تھکتی نہیں ہے، استعمال ہو کر گھستی نہیں ہے، اس کو مزید کسی خوراک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ اللہ نے عجیب نظام بنایا ہے۔

﴿وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾

آسمان کے اندر تمہارا رزق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان میں لوحِ محفوظ ہے جہاں تمہارا مقدر لکھ دیا گیا ہے۔ ﴿وَمَا تُوْعَدُوْنَ﴾... اور جو تمہارے ساتھ وعدہ کیا جاتا ہے کہ آئندہ جنت بھی ملے گی، یہ سب آسمان میں لکھا ہوا ہے۔

قیامت کا وقوع یقینی ہے:

﴿فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾

قسم ہے آسمان اور زمین کی کہ قیامت ایسے ہی برحق اور سچی ہے جیسے تم آپس میں باتیں کرتے ہو! یعنی جس طرح تمہیں اپنی گفتگو پر یقین ہے کہ تم بول رہے ہو اسی طرح یہ بات یقینی ہے کہ قیامت نے آکر رہنا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کا قصہ:

﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾﴾

کیا آپ کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ نہیں پہنچا جو بہت عزت والے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے آئے۔ ﴿الْمُكْرَمِيْنَ﴾ سے مراد فرشتے ہیں اور فرشتے ہوتے ہی معزز ہیں یا یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کا اکرام کیا تھا اس لیے انہیں معزز کہا گیا ہے۔

مہمان کا اکرام کیسے کیا جائے؟

یہاں مہمان کے حوالے سے چند ایک باتیں ذہن نشین فرما لیں۔ مہمان مہمان ہوتا ہے بڑا ہو یا چھوٹا ہو، مسلمان ہو یا کافر ہو، اھل السنۃ ہو یا اھل بدعت ہو، مہمان کا اکرام مہمان سمجھ کر کرنا چاہیے۔ حدیث مبارک میں ہے:

مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ۔[181]

جو شخص اللہ اور آخر کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنی مہمان کا اکرام کرے۔

تو مہمان میں تخصیص نہیں ہوتی۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ آنے والا آپ کا رشتہ دار ہے تو اس کی نوعیت الگ ہو گی، آنے والا صاحبِ علم ہے تو نوعیت الگ ہو گی لیکن مہمان بحیثیتِ مہمان اس کی حیثیت الگ ہوتی ہے، اس کا تعلق مفادات سے نہیں ہے۔ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اگر ہم شریعت کا حکم سمجھتے ہوئے اپنے مہمان کا اکرام کریں گے تو اللہ راضی ہو گا، اجر ملے گا اور اگر ہم اپنی ذاتی غرض کے لیے اس کی عزت واکرام کریں گے تو اللہ ناراض ہو گا اور عذاب بھی ہو گا۔ اس لیے نیت ٹھیک کرنا بہت ضروری ہے۔

1: ایک تو معمول بنالیں کہ مہمان کا اکرام کرنا ہے چاہے وہ چھوٹا ہے یا بڑا۔

2: دوسرا کوشش یہ کریں کہ مہمان کا اکرام گھر سے کریں، گھر والوں کا مزاج بنائیں، گھر والوں کو شریک کریں، گھر والوں کو ساتھ چلائیں اور ان کو یہ بات سمجھائیں کہ مہمان کے آنے پر اللہ کتنے خوش ہوتے ہیں!

3: تیسرا یہ کوشش کریں کہ مہمان کی پسند کا کھانا ہو۔ اس سے پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مہمان بسا اوقات نہیں بتاتا تو جو میسر ہے وہ لے کر آجائیں۔

4: چوتھا یہ کہ اگر آپ کھانا لے آئے اور مہمان نہ کھانا چاہے تو مہمان پر کھانے کو مسلط نہ کریں، مہمان کو کھانے کے لیے مجبور نہ کریں اور اس طرح مہمان جب کھانا چاہے اس وقت کھلائیں۔

181۔ السنن الکبریٰ للبیہقی: ج8 ص164 رقم 17106

بہر حال میں گزارش کرتا ہوں کہ مہمان کا اکرام کرنا سیکھیں! بطورِ خاص جس بندے نے دین کا کام کرنا ہے اس کے دستر خوان کو وسیع ہونا بہت ضروری ہے۔ دستر خوان میں وسعت نہ ہو تو کام میں وسعت کبھی نہیں ہو سکتی۔ کام کی وسعت کے لیے دستر خوان کی وسعت بہت ضروری ہے، جتنے اسباب ہیں اتنا انتظام کریں، جس حد تک ممکن ہے اتنا کریں لیکن اپنے دستر خوان کو وسیع رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بہت زیادہ فوائد ہیں؛ دنیاوی فوائد بھی ہیں اور اخروی فوائد بھی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی:

یہاں پر بعض مفسرین نے ابراہیم علیہ السلام سے مہمانی کے آداب لکھے ہیں۔ ایک ادب یہ تھا: ﴿فَرَاغَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ﴾ "راغ" ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں کہ جب کوئی بندہ جائے اور کسی کو محسوس نہ ہونے دے کہ چلا گیا ہے۔ اسے "راغ" کہتے ہیں۔ ایک ہے ویسے چلا جانا اور ایک ہے چپکے سے چلا جانا۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بتایا نہیں کہ میں تمہارے لیے کچھ لینے جا رہا ہوں بلکہ مہمان سمجھ کر بغیر بتائے لینے کے لیے چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ جب مہمان آئے ہیں تو کوئی چیز کھائیں گے نا۔

دوسرا ادب یہ تھا ﴿فَقَرَّبَهٗۤ اِلَیْهِمْ﴾ کہ جب کھانا تیار ہوا تو مہمانوں کو کھانے پر نہیں بلایا گیا بلکہ کھانا مہمانوں کے پاس لے کر گئے، مہمانوں کو تکلیف نہیں دی۔

تیسرا ﴿قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ﴾ کہ ان کو یہ نہیں کہا کہ آپ کھاؤ بلکہ یہ پوچھا کہ آپ کھاتے کیوں نہیں ہو؟ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مہمان کے لیے جو کچھ موجود ہو مہیا کر دو اور مہمان کو کھانے پر مجبور نہ کرو کہ ضرور کھائے۔ اس لیے ابراہیم علیہ

السلام نے پہلے پوچھا کہ تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟ تو یہ مہمانی کے آداب بیان کیے ہیں۔

﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٢٥﴾﴾

ملائکہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے، سلام کیا، آپ علیہ السلام نے جواب دیا اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں۔

یہ بات آپ نے دل میں کہی یا یہ بھی احتمال ہے کہ ان سے پوچھنے کے لیے زبان سے کہی کہ تم کون لوگ ہو؟ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔

﴿فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿٢٦﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾

اتنی بات کی اور ابراہیم علیہ السلام گھر چلے گئے اور بھنا ہوا بچھڑا ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ چونکہ فرشتے تھے اس لیے انہوں کھایا نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کہا کہ آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ لیکن انہوں نے نہ کھایا۔

ابراہیم علیہ السلام کا خوف اور فرشتوں کی بشارت:

﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾﴾

ابراہیم علیہ السلام نے خوف محسوس کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم تو ملائکہ ہیں، فرشتے ہیں، آپ نہ ڈریں! انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دی کہ اللہ آپ کو بیٹا عطا فرمائے گا جو علم والا ہو گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت شرفاء کا معمول یہ ہوتا تھا کہ وہ جب کسی کے ہاں مہمان بنتے تو میزبان سے کچھ نہ کچھ کھا لیا کرتے تھے جو اس بات کی علامت ہوتی کہ اس مہمان سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر کوئی مہمان نہ کھاتا تو خطرہ ہوتا کہ یہ کہیں کوئی دشمن نہ ہو جو نقصان نہ پہنچا دے۔ اس لیے

ابراہیم علیہ السلام نے خوف محسوس کیا۔

﴿فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٠﴾﴾

ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ پردے کے پیچھے تھیں یا قریب تھیں، بات سن رہی تھیں تو ان کو بہت تعجب ہوا انہوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور کہا کہ میں بانجھ بھی ہوں اور بوڑھی بھی ہوں تو مجھے اولاد کیسے ہو گی؟ انہوں نے کہا کہ اللہ کا فیصلہ ہے اس لیے اولاد آپ کی ہو کر رہے گی، اللہ حکمت والا بھی ہے، اللہ علم والا بھی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس کو دینا ہے اور حکمت والے ہیں کہ کب دینا ہے؟ اس لیے اللہ کی جیسے حکمت ہوتی ہے ویسے ہی فرماتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی عمر جو مفسرین نے لکھی ہے اس وقت سو سال تھی اور حضرت سارہ کی عمر ننانوے سال تھی۔ تو فرشتوں نے کہا کہ ہم تو آپ کو خوشخبری دیتے ہیں۔

قومِ لوط کی طرف سفر:

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣١﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿٣٣﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣٤﴾﴾

پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ تم کہا جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں مجرم لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے یعنی ہم لوط علیہ السلام کی بستی کی طرف جا رہے ہیں، تاکہ ان پر ایسے پتھر برسائیں جو پکی مٹی کے بنے ہوتے ہیں جن پر نشان لگے ہوئے ہیں آپ کے رب کے پاس سے۔

اور روایات میں آتا ہے کہ جب پتھر پھینکتے تھے اور بندہ دوڑتا تھا تو پتھر اس کے پیچھے جا کر اس کو لگتا اور تباہ کر دیتا، پھر بعد میں اس کو الٹا کر کے پھینکا گیا تھا۔ تو دو قسم کا عذاب ان پر آیا تھا۔

اب یہاں دیکھیں! آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک ضابطہ بیان کیا تھا کہ "عِنْدَ رَبِّكَ" یہ قرآنی اصطلاح ہے۔ تمام چیزوں پر حقیقی اور ظاہری حق اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن بعض چیزوں پر ظاہری اختیار بھی اللہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور بسا اوقات ظاہری اختیار بندے کو دے دیتے ہیں۔ جہاں ظاہری اختیار بھی اللہ کے پاس ہوں وہاں نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے اور جہاں ظاہری اختیار بندے کے پاس ہو تو وہاں نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے۔ یہاں ﴿مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ﴾ ہے۔ اب ان پتھروں پر جو نشان لگے پڑے ہیں وہ تو ہر کسی کو پتا چل رہا ہے لیکن ﴿عِنْدَ رَبِّكَ﴾ کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ ان پتھروں پر نشانات کا پڑنا اس کے ساتھ بندوں کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ خالص اللہ کا اختیار ہے۔ اس لیے نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے۔

﴿فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٣٥﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٦﴾﴾

اس بستی میں جو بھی ایمان والا تھا ہم نے اس کو وہاں نے نکال لیا۔ ہم نے اس بستی میں ایک گھر کے علاوہ کسی گھر کو مؤمن نہ پایا۔

لوط علیہ السلام کا عجیب معاملہ تھا۔ مسافر نبی ہیں اور کوئی ایک شخص بھی ساتھ کلمہ گو نہیں ہے۔ صرف اپنا ایک گھر تھا۔ بتاؤ! اس پیغمبر کی کتنی حسرت ہو گی! گھر میں بیوی ہے وہ بھی ایمان نہیں لائی۔ جب بستی سے نکلے تو بیوی بھی عذاب میں مبتلا ہو گئی، وہ بھی ساتھ نہیں تھی، کتنی عجیب کیفیت ہو گی حضرت لوط علیہ السلام کی۔ اور

جب قوم نے حملہ کرنا چاہا تو لوط علیہ السلام نے فرمایا تھا:

طاقت اور قبیلہ نعمتِ عظمیٰ:

﴿لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُكْنٍ شَدِیْدٍ ۝۸۰﴾ [182]

اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلے میں طاقت ہوتی، اے کاش! میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لے لیتا! یعنی میرا قبیلہ ہوتا تو آج تم مجھے رسوا نہ کرتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی عالم کو طاقت کا مل جانا، اچھے قبیلے کا مل جانا، اچھے خاندان کا مل جانا یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ بسا اوقات طاقت بہت سارے مصائب سے روک دیتی ہے اور بسا اوقات اچھے خاندان میں پیدا ہونا یہ آدمی کو بہت سارے مسائل سے بچا لیتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام چونکہ مسافر تھے۔ وہاں ان کا قبیلہ تھا ہی نہیں اس لیے یہ فرما دیا۔

﴿وَتَرَكْنَا فِیْهَاۤ اٰیَةً لِّلَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۝۳۷﴾

ہم نے ان میں ایک نشانی چھوڑی ہے ان لوگوں کے لیے جو سخت عذاب سے ڈرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ دربارِ فرعون میں:

﴿وَفِیْ مُوْسٰۤی اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝۳۸﴾

اور دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں بھی ہم نے ایک ایسی ہی نشانی چھوڑی تھی جب ان کو کھلی دلیل دے کر فرعون کی طرف بھیجا۔

﴿فَتَوَلّٰی بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝۳۹﴾

182۔ سورۃ ھود 80:11

تو فرعون نے اپنے پورے اراکین سمیت انکار کیا اور کہا کہ یہ ساحر ہے بلکہ یہ جادوگر ہے۔

﴿فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾﴾

ہم نے فرعون کو اور اس کے لشکر کو پکڑا اور ان سب کو سمندر میں پھینک دیا اور فرعون تو تھا ہی ملامت کے قابل!

عاد و ثمود کا انجام:

﴿وَ فِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾﴾

اور قوم عاد میں بھی ہم نے نشانیاں چھوڑی ہیں جب ہم نے ان پر ایسی ہوا بھیجی جو بانجھ تھی۔ کیا مطلب کہ عام طور پر جب ہوا چلتی ہے تو اس میں خیر وبرکت ہوتی ہے۔ بادل کھینچ لاتی ہے، بارش کا سبب بنتی ہے لیکن یہ ہوا ان تمام خیروں سے خالی تھی کیونکہ یہ عذاب کی آندھی تھی۔

﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾﴾

یہ ہوا جہاں سے بھی گزرتی اس جگہ کی ساری چیزوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالی۔

﴿وَ فِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾﴾

اور قومِ ثمود میں بھی ایسی نشانی ہم نے چھوڑی تھی جب ان سے کہا گیا تھا کہ تم چند روز کے مزے اٹھالو، چند دن من چاہی زندگی گزار لو۔ بندہ عیش و عشرت میں زندگی گزار دے اور اللہ کی فرمانبرداری نہ کرے تو عذاب تو پھر آنا ہی ہے۔

﴿فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾

اس سمجھانے کے باوجود انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی تو انہیں ایک کڑک نے آپکڑا اور یہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔

﴿فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّ مَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿٤٥﴾﴾

ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ نہ تو کھڑے ہو سکتے تھے اور نہ ہی اس عذاب سے بچ سکتے تھے۔

﴿وَ قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٤٦﴾﴾

اس سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم میں بھی ہم نے نشانیاں چھوڑی ہیں۔ یہ قوم بڑی نافرمان تھی۔ تو یہ مختلف قوموں کا تذکرہ کیا ہے عبرت کے لیے۔

تخلیقِ باری تعالیٰ کے نمونے:

﴿وَ السَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿٤٨﴾﴾

ہم نے آسمان کو طاقت سے پیدا کیا ہے اور ہم تو وسعت دینے والے ہیں۔

ہم نے زمین کو پھیلا دیا ہے اور ہم کیا ہی بہترین پھیلانے والے ہیں!

﴿وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٩﴾﴾

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں تا کہ تم کچھ نصیحت حاصل کرو!

یعنی ہر چیز کی دو دو قسمیں پیدا کی ہیں۔ کالا پیدا کیا تو سفید بھی پیدا کیا، میٹھا پیدا کیا تو کڑوا بھی بنایا، مرد کو بنایا تو عورت کو بھی بنایا، مسلمان کو پیدا کیا تو کافر کو بھی پیدا کیا۔ ہر جگہ پر اللہ نے دو دو قسمیں پیدا کی ہیں۔

﴿فَفِرُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿٥٠﴾﴾

اس لیے تم اللہ کی طرف دوڑو! بے شک میں تمہیں صاف طور پر ڈرانے والا ہوں۔

یہاں یہ بات ارشاد فرمائی کہ دلائل کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم شرک کو چھوڑ کر توحید اختیار کرتے، مزید یہ کہ ﴿اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ﴾ مجھ جیسا بندہ تم کو

ڈرانے والا بھی ہے، میں نہ ہوتا تو دلائل کا تقاضا تھا کہ تم اللہ کی طرف متوجہ ہوتے اور اب تو میں خود ڈرانے والا تم میں موجود ہوں اس لیے اب تو تمہیں حق کی راہ اختیار کر لینی چاہیے۔۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ۚ51﴾

اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، کیونکہ میں اللہ کی طرف سے تمہیں واضح ڈرانے والا ہوں۔

تسلی پیغمبر:

﴿كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ۚ52﴾

میرے پیغمبر! یہ کام صرف ان لوگوں کا نہیں ہے بلکہ جس طرح آپ سے یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں اسی طرح یہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے کہ جب بھی کوئی نبی آتا تو لوگ یا تو اسے ساحر کہتے یا مجنون کہتے۔

﴿اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ۚ53﴾

کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو یہ وصیت کرتے چلے آئے ہیں یعنی یہ تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے مرتے وقت ایک دوسرے سے کہتے چلے آئے ہوں کہ جب بھی کوئی رسول آئے تو ایسے کہنا! فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہ لوگ سرکش ہیں اور جو بھی سرکش ہو اس کی یہ عادت ہوتی ہے۔

عالم اور مشکلات کا سامنا:

یہاں سے ایک مسئلہ اچھی طرح سمجھیں! کہ ایک معاملہ پیغمبر کے ساتھ تھا اور ایک معاملہ پیغمبر کے وارث کے ساتھ ہے۔ پیغمبر کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا تھا کہ انہیں مخالفین معاذ اللہ ساحر اور مجنون کہتے تھے اور جب عالم کام کرے گا تو اس کا

مقابلہ دو قسم کے لوگوں سے ہو گا:

1: بعض وہ لوگ ہوں گے جو فکری طور پر عالم کے مخالف ہوں گے۔

2: اور بعض وہ ہیں جو فکری طور پر مخالف نہیں ہیں بلکہ حسد کی بیماری کے شکار ہیں اور جو حاسد ہوتا ہے وہ محسود پر الزام لگاتا ہے۔ تو جس عالم نے جب بھی کام کیا ہے اس پر الزام لگے ہیں، آئندہ جب بھی کوئی عالم کام کرے گا اس پر الزام لگیں گے۔ وہ پہلے الزام لگانے والے بعد والوں کو وصیت نہیں کرتے کہ تمہارے اندر عالم ہے تم بھی یہ الزام لگانا۔ کیونکہ جو مرضِ حسد اُن میں تھا وہی مرضِ حسد اِن میں بھی ہے۔ وہ اُن کا کچھ اور کر نہیں سکتے تھے سوائے الزام لگا کر بدنام کرنے کے اور یہ بھی کچھ اور تو کر نہیں سکتے لیکن الزام لگا کر بدنام کرتے ہیں۔

تو جس طرح پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ یہ پرانی بات ہے لوگ آپ کو ایسا ایسا کہیں گے تو اس سے علماء کو بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ پرانی باتیں ہے جو ایسے الزامات لگاتے ہیں۔ جو بندہ یہ سہہ سکتا ہے تو وہ دین کا کام کرے، جو یہ نہیں سہہ سکتا وہ عقائد یا کسی عنوان پر تحریکات کو شروع ہی نہ کرے اور جب شروع کرنا ہو پھر اللہ کے لیے لگے رہو! لگے رہو اللہ کے لیے! ایک وقت آئے گا ان شاء اللہ کہ اللہ بہت زیادہ قبولیت عطا فرمائے گا۔

﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿٥٤﴾﴾

اے پیغمبر! آپ ان سے رخ پھیر لیں، آپ پر کوئی الزام نہیں ہو گا۔

﴿وَّ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٥﴾﴾

آپ نصیحت کرتے رہیں کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو فائدہ دے گی۔

آپ کے حاسدین کو نہیں تو اپنوں کو تو فائدہ دے گی، اس لیے آپ اپنا کام جاری رکھیں۔

تخلیقِ جن وانس کا مقصد:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝٥٦﴾

ہم نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا میں بعض لوگ کام کرتے ہیں تو اس میں اپنے فوائد مقصود ہوتے ہیں اور اللہ نے جو بندوں کو پیدا فرمایا ہے تو اس میں اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اپنا کوئی مقصد نہیں ہے، کسی اپنے فائدے کے لیے بندے کو پیدا نہیں فرمایا۔

یہاں دو تین باتیں سمجھیں:

[۱]: ایک بات یہ سمجھیں کہ جب جن وانس کو اللہ نے پیدا ہی عبادت کے لیے کیا ہے تو پھر کتنے جن وانس ہیں جو عبادت نہیں کرتے۔ تو ایک کام کے لیے اللہ پیدا فرمائے، پھر وہ بندہ کام نہ کرے تو کیا یہ ہو سکتا ہے؟ اللہ تو فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٨٢﴾[183]

اللہ کسی چیز کا ارادہ فرمائیں اور وہ نہ ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب اللہ نے انسان اور جنات کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا ہے تو پھر یہ عبادت کیوں نہیں کرتے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ارادۂ خدا سے تخلف ہو جائے؟

ارادۂ تکوینی اور ارادۂ تشریعی:

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایک ہے اللہ کا ارادۂ تکوینیہ اور ایک ہے ارادۂ تشریعیہ۔ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ میں ارادۂ تشریعیہ ہے،

183۔ یٰس 82:36

ارادۂ تکوینیہ نہیں ہے۔ ارادۂ تکوینیہ میں جس کا ارادہ فرماتے ہیں تو وہ مجبور ہوتا ہے اور اس نے کرنا ہی کرنا ہوتا ہے اور اس میں ابتلاء نہیں ہوتا ہے کہ کرے گا تو ثواب اور نہیں کرے گا تو گناہ، اس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا اور اس میں بندے کا اختیار بھی نہیں ہوتا۔ تو ارادۂ تکوینیہ میں نہ اختیار ہوتا ہے نہ ابتلاء ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ نے ہواؤں کو حکم دیا کہ تم نے چلنا ہے، وہ چلیں گی، اب ہوا کا اختیار نہیں ہے کہ اس کا جی چاہے تو چلے، جی چاہے تو نہ چلے، اور یہ بھی نہیں کہ چلیں گی تو جنت میں جائیں گی اور نہیں چلیں گی تو جہنم میں جائیں گی۔ جونہی قیامت آئے گی ہر ہوا نے ختم ہو جانا ہے۔ یہ سب ارادۂ تکوینیہ ہے۔ سورج نے مشرق سے نکلنا ہے، اسے خدا کا حکم ہے کہ نکلو! اب ایسا نہیں ہے کہ اس کا جی چاہے تو نکلے، جی چاہے تو نہ نکلے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور سورج نکلے گا تو جنت میں جائے گا اور نہیں نکلے گا تو جہنم میں جائے گا ایسا بھی نہیں ہے۔ تو ارادۂ تکوینیہ میں ابتلاء اور اختیار نہیں ہوتا۔

اور ارادۂ تشریعیہ میں ابتلاء بھی ہوتا ہے اور اختیار بھی ہوتا ہے۔ کیا مطلب کہ اللہ رب العزت بندے کو ایک حکم دیتے ہیں اور ساتھ اختیار بھی دے دیتے ہیں کہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ یہ ہے ارادۂ تشریعیہ۔ اختیار بھی دیتے ہیں اور ساتھ ابتلاء بھی ہوتا ہے، اچھا کام کرے گا تو نجات پائے گا اور نہیں کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ تو ارادۂ تشریعیہ میں نقصان بھی ہوتا ہے اور ابتلاء بھی ہوتا ہے۔

تو یہاں ارادہ سے مراد ارادۂ تشریعیہ ہے، ارادۂ تکوینیہ نہیں ہے۔

دوسرا جواب قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے "تفسیر مظہری" میں دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اصل میں اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جن و انس کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ ان میں استعداد اور صلاحیت رکھی ہے کہ اگر عبادت کرنا چاہیں تو کر سکیں اور نہ کرنا چاہیں تو نہ کریں۔ تو فرمایا کہ ہم نے ان کی تخلیق اس طرز پر کی ہے

کہ ان میں عبادت کی استعداد رکھی ہے۔ اب چاہیں تو استعداد کا صحیح استعمال کریں اور چاہیں تو استعداد کا غلط استعمال کریں، ہم نے ان کو اختیار دے دیا ہے۔

وجہِ تخلیقِ کائنات:

[۲]: دوسری بات یہاں یہ سمجھیں کہ جب ہم یہ حدیث پاک پیش کرتے ہیں مستدرک علی الصحیحین کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی تخلیق کے سبب ہیں:

وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ.[184]

کہ اے آدم! اگر میں نے محمد کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں تجھے بھی پیدا نہ کرتا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام پیدا نہ ہوتے تو ہم بھی پیدا نہ ہوتے۔ تو اس سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری پیدائش کا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اب اس حدیث کے خلاف بعض لوگ ایک تو قرآن کی آیت کو پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ اور حدیث پاک میں ہے: "وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ" چونکہ حدیث آیت کے خلاف ہے لہٰذا حدیث قابلِ قبول نہیں ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے "پیدائش کا مقصد" اور ایک ہوتا ہے "پیدائش کا سبب"۔ پیدائش کا مقصد ﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ ہے اور پیدائش کا سبب "وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ" ہے۔ مقصد اور ہوتا ہے اور سبب اور ہوتا ہے۔

184۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج3 ص517 رقم الحدیث 4286

میں ایک مثال دیتا ہوں بات سمجھانے کے لیے کہ آپ سے پوچھا جائے کہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ تو آپ کہیں گے تخصص کرنے، عقائد سیکھنے، مسائل سیکھنے، شریعت کو سیکھنے۔ تو یہ آپ کا مقصد ہے۔ اب پوچھا جائے کہ یہاں کیوں آئے؟ تو ایک متخصص کہتا ہے کہ استاد جی! میرے ساتھ ایک طالب علم پڑھتا تھا، اس نے یہاں مرکز میں دورہ تحقیق المسائل کیا تھا، اس نے مجھے دعوت دی اس لیے میں یہاں پر آیا ہوں۔ تو یہ آپ نے آنے کا سبب بتایا ہے۔ تو تخصص کا مقصد عقائد کو سیکھنا ہے اور سبب وہ طالب علم ساتھی ہے۔ تو مقصد الگ ہے اور سبب الگ ہے۔

تصحیحِ حدیثِ عمر دربارۂ توسلِ آدم:

دوسرا پھر اس حدیث پر سوال آتا ہے کہ اس کو محدثین نے موضوع اور من گھڑت کہا ہے، لہٰذا موضوع حدیث قبول نہیں کرنی چاہیے۔ میں آپ کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ بات کرنے والے کو بات ادھوری نہیں بلکہ پوری کرنی چاہیے۔ اگر اس حدیث کو بعض محدثین موضوع کہتے ہیں تو بعض صحیح بھی تو کہتے ہیں۔ خود امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک علی الصحیحین کی کتاب التاریخ میں اس روایت کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے:

"هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْإِسْنَادِ." [185]

کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔

علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے "شفاء السقام" میں لکھا ہے:

قَدِ اعْتَمَدْنَا فِيْ تَصْحِيْحِهٖ عَلَى الْحَاكِمِ. [186]

185۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج3 ص517 تحت الحدیث 4286

186۔ شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام للسبکی: ص361

کہ ہم حاکم کی تصحیح پر اعتماد کرتے ہیں۔

علامہ تاج الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ اس پر اعتماد فرما رہے ہیں۔ خود حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے جو "امداد الفتاویٰ" لکھا ہے علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

حدیثِ توسلِ آدم علیہ السلام بسیدنا النبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صحیح سند سے ثابت ہے جو مرفوع ہے۔[187]

تو اس لیے یہ کہنا کہ یہ حدیث موضوع ہے درست نہیں۔ کسی حدیث کو موضوع کہنا اجتہادی چیز ہے۔ تو باقی جو اس کو صحیح فرما رہے ہیں وہ بھی اجتہادی چیز ہے۔ اس لیے فوراً رد کر دینا کہ فلاں نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا ہے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

تو یہ حدیث قرآن کریم کی اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔

﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾﴾

میں ان سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿۵۸﴾﴾

بے شک اللہ رزاق بھی ہے، قوت والا بھی ہے۔

تنبیہ کفار:

﴿فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾﴾

اصل میں "ذَنوب" کہتے ہیں بڑے ڈول کو جس کی مدد سے پانی نکالا جاتا ہے۔ عام طور پر دیہاتی علاقے جہاں یہ کنویں موجود ہوں وہاں پانی بھرنے والے جب

187۔ امداد الاحکام: ج1 ص133

ڈول سے پانی بھرتے ہیں تو باری باری بھرتے ہیں۔ اس لیے ''ذَنوب'' کا معنی باری اور حصہ بھی آتا ہے۔

فرمایا: جن لوگوں نے ظلم کیا ان کی بھی باری ایسے آئے جس طرح ان جیسا کام کرنے والوں کی باری آئی تھی۔ اس لیے یہ لوگ جلدی عذاب کا مطالبہ نہ کریں۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٦٠﴾﴾

جس دن کا ان لوگوں سے وعدہ کیا جا رہا ہے اس دن ان کافروں کے لیے تباہی یقینی ہوگی۔

اللہ ہمیں نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الطور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ الطُّوۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَ کِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ﴿۳﴾﴾

”طور“ اصل میں اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اگا ہو اور یہاں اس سے مراد ”طور سینا“ ہے۔ اللہ نے قسمیں کھائی ہیں۔ فرمایا:

”وَ الطُّوۡرِ ۙ﴿۱﴾“ قسم ہے طور کی۔

”وَ کِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ ۙ﴿۲﴾ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ ۙ﴿۳﴾“ رَقّ کہتے ہیں اس باریک چیز کو جو کاغذ کی طرح ہو اور عموماً اس کو کاغذ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ فرمایا: اور قسم ہے کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہوئی ہے۔ مراد اس سے یا تو لوحِ محفوظ ہے یا اعمال نامہ ہے یا قرآن کریم ہے۔

بیت معمور کیا ہے؟

﴿وَّ الۡبَیۡتِ الۡمَعۡمُوۡرِ ۙ﴿۴﴾﴾

اور قسم ہے بیت معمور کی۔

کعبہ کے بالکل محاذات میں ساتویں آسمان پر ملائکہ کا قبلہ ہے، وہ اس کا وہاں طواف کرتے ہیں۔ ہر روز ستر ہزار فرشتے طواف کرتے ہیں۔ جو ایک بار آئے وہ

دوبارہ نہیں آتا۔ معراج کی رات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام اسی بیت معمور سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ صلہ کیوں دیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کعبہ شروع میں بنا پھر ختم ہو گیا، ابھی جو کعبہ کی بِناء ہے اس کے بانی ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ تو اللہ نے اس کے بدلے میں بیت معمور سے تکیہ لگانے کی نعمت ان کو عطا کی ہے۔

﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝﴾

اور قسم ہے بلند چھت کی۔ مراد اس سے آسمان ہے۔ اور قسم ہے اس دریا کی جو پانی سے بھرا ہوا ہے یا معنی یہ ہے کہ قسم ہے اس دریا کی جو بھڑ کتا ہے۔

یہ جو سمندر اور دریا ہیں یہ آگ بن جائے گی اور امت کو حشر تک دھکیل کر لے جائیں گے اور یہ ساری آگ پھر جہنم کا ایندھن ہو گی۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

اللہ کا عذاب آکر رہتا ہے:

﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝﴾

قسم کھا کر بتایا کہ اللہ کے عذاب نے آکر رہنا ہے، اس عذاب کو کوئی روک نہیں سکتا۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے پہلے میں ایک مرتبہ مدینہ منورہ پہنچا تاکہ جنگ بدر کے جو قیدی تھے ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کروں۔ میں جب پہنچا تو اس وقت فجر کی نماز میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت طور کی تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اتنی بلند تھی کہ مسجد نبوی کے صحن میں بھی جا رہی تھی۔ میں نے اس

سورت کی یہ آیت سنی ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝﴾ تو میں بالکل گھبرا گیا۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میں قیدیوں کی بات کرنے کے لیے آیا تھا اور کلمہ پڑھ کر خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیدی بن گیا یعنی مسلمان ہو گیا۔

قرآن پر عمل ہی اصل مقصد ہے:

یہاں یہ بات بہت اچھی طرح یاد رکھیں کہ قرآن کریم کی تفاسیر بیان کرتے ہوئے ہم تفسیری نکات پر بہت توجہ دیتے ہیں اور عمل پر توجہ نہیں دیتے۔ نکات پر نکات، نکات پر نکات بیان ہوں گے تو اس سے کیا ہو گا؟ اصل تو یہ ہے کہ آدمی قرآن پڑھے، قرآن پڑھائے، قرآن سمجھے اور سمجھائے اور اس کو عمل کی توفیق ملے، تفسیری نکات کو بیان کرنا کمال نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کو پڑھ کر عمل پر آ جانا یہ کمال ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی بطور خاص آپ زندگیاں پڑھ لیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن کریم کے نکات کتنے ملتے ہیں، بہت کم ملیں گے لیکن ان کی عملی زندگی آپ پڑھ لیں کہ وہ کیسے قرآن کریم پر عمل کرتے تھے۔

میں اس لیے گزارش کرتا ہوں کہ آپ دیکھ لیں کہ پچھلی سورت میں قیامت کا ذکر تھا، اس سورت میں بھی قیامت کا ذکر ہے، ہر سورت میں قیامت کا ذکر بار بار آ رہا ہے۔ یہ قیامت کا ذکر اس لیے نہیں کہ بندہ نکات بیان کرے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ بندہ قیامت کا ذکر سنے اور ڈر جائے، اللہ کے خوف سے کانپ جائے، گناہوں سے توبہ کر لے، اپنی آخرت کی تیاری کر لے۔ قیامت کا ذکر اس لیے ہے۔ اللہ ہمیں آخرت کی تیاری کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

قیامت کی ہولناکی اور مجرمین کا انجام:

﴿يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝﴾

جب آسمان کانپنا شروع ہو جائے گا اور پہاڑ چل پڑیں گے یعنی اپنی جگہ سے ٹل جائیں گے۔

﴿اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾

دنیا میں آدمی کو تکلیف آتی ہے تو گڑ گڑا پڑتا ہے تو تکلیف دینے والے کو ترس آجاتا ہے تو کبھی چھوڑ دیتا ہے لیکن آخرت کا معاملہ یوں نہیں ہے، فرمایا: اس جہنم میں داخل ہو جاؤ، اب تم برداشت کرو یا تم برداشت نہ کرو تمہارے لیے برابر ہے، اب تمہارے اعمال کا بدلہ مل کے رہے گا۔ نہ تمہارے رونے سے ہم تمہیں چھوڑیں گے اور نہ تمہارے چپ رہنے سے تمہیں چھوڑیں گے۔ اب چپ رہو یا روتے رہو، اب تم نے رہنا یہیں پر ہے۔ بتاؤ! کتنی خطرناک بات ہے؟! اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

متقین کا انعام:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ ۝۱۷ۙ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَ وَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۱۸﴾

اس کے مقابلے میں نیک لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ متقین باغات میں ہوں گے، اللہ کی نعمتوں میں ہوں گے، خوش ہوں گے ان انعامات میں جو خدا نے انہیں دیے ہوں گے۔ ان کا رب ان کو جہنم کے عذاب سے بچالے گا۔

﴿كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۹ۙ﴾

حکم ہو گا کہ مزے سے اب کھاؤ اور پیو، یہ تمہارے اعمال کے بدلے میں تمہیں دیا جارہا ہے۔

﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۲۰﴾

جنتی لوگ نشستوں پر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں گے اور یہ نشستیں ترتیب سے بچھی ہوں گی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ہم ان کا نکاح فرمائیں گے۔ دعا کریں اللہ ہم سب کو عطا فرمائے۔ (آمین)۔

یہ جو ﴿زَوَّجۡنٰهُمۡ﴾ ہے اس کے بارے میں مفسرین کی دونوں رائے ہیں؛ بعض کہتے ہیں کہ اہلِ جنت کا جنت میں حوروں سے نکاح ہو گا اور یہ نکاح ہونا محض ان کا اعزاز ہو گا، اعزاز کے طور پر یہ اس کی بیوی ہو گی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ نکاح نہیں ہو گا بغیر نکاح کے اللہ ان کو دیں گے لیکن ﴿زَوَّجۡنٰهُمۡ﴾ سے مراد ہے جوڑا، یعنی ہم حور دے کر اس کا جوڑا بنا دیں گے۔

دونوں تفسیریں ٹھیک ہیں۔

والدین کی وجہ سے اولاد کے مقام کی بلندی:

﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّیَّتُهُمۡ بِاِیۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَ مَاۤ اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ كُلُّ امۡرِیًٔ بِمَا كَسَبَ رَهِیۡنٌ ﴿۲۱﴾﴾

والدین جنت میں ہوں گے اور اولاد ان کی ایمان والی ہو گی لیکن اولاد کے اعمال میں کوتاہی ہو گی۔ تو جنت میں والدین کہیں گے کہ اللہ! ہماری اولاد تو نچلے درجے میں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد کو بھی ہمارے والا رتبہ ملے! ان کے اعمال تو والدین کے اعمال کی طرح نہیں تھے لیکن ان کی خواہش کو دیکھ کر اللہ ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کو بھی وہی مرتبہ عطا فرمائیں گے لیکن ایمان شرط ہے۔

اسی طرح حدیث پاک میں ہے کہ بسا اوقات اولاد اوپر والے مقامات پر ہو گی اور اولاد کہے گی کہ یا اللہ! میرے ابو جان! میری امی جان! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ

ان میں ایمان تو تھا لیکن تمہاری طرح اعمال نہیں تھے، لیکن اولاد کی خوشی کے لیے اللہ ان کے والدین کو وہاں پہنچا دیں گے۔

توسل بالذات کی دلیل:

اب یہاں ایک بات سمجھیں؛ یہ جو ہے ﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ وہ لوگ جو مؤمن ہیں تو اس سے مراد ذات ہے، کیونکہ "الَّذِیۡنَ" ذات ہوتی ہے، آگے ﴿وَ اتَّبَعَتۡہُمۡ ذُرِّیَّتُہُمۡ بِاِیۡمَانٍ﴾ اور ان کی اولاد نے ان کی اتباع کی ہے ایمان مین یعنی اولاد بھی مؤمن تھے، آگے ﴿اَلۡحَقۡنَا بِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ﴾ ہم ان والدین کے ساتھ ان کی اولاد کو بھی ملا دیں گے، ﴿وَ مَاۤ اَلَتۡنٰہُمۡ مِّنۡ عَمَلِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ﴾ اور والدین کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے یعنی یہ نہیں کہ ان کو نیچے لے آئیں بلکہ ان کو اسی مقام پر رکھیں گے جس پر وہ تھے اور اولاد کو بھی ان کے مقام پر لے جائیں گے۔

اب دیکھیں! یہ جو اولاد نیک اعمال میں والدین سے کم ہے تو والدین کے ساتھ پہنچ جائیں گے والدین کی وجہ سے، والدین کی برکت سے، والدین کے توسل سے تو یہ ذات کا توسل نہیں ہے تو اور کیا ہے؟! یہ جو اولاد کے اعمال کم ہیں اور اپنے والدین کے پاس پہنچ جائیں گے تو یہ کس وجہ سے پہنچیں گے؟ اپنے اعمال کی وجہ سے یا والدین کی ذات کی وجہ سے؟ (والدین کی ذات کی وجہ سے۔ سامعین) اسی کو تو ذات کا وسیلہ کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ذات کا وسیلہ نہیں ہے۔

اب اگر کوئی بندہ کہے کہ یہ ذات نہیں بلکہ والدین کے نیک اعمال تھے تو ان اعمال کی وجہ سے اولاد ان کے مقام پر پہنچی ہے۔ ہم کہتے ہیں: بھائی! ہم جو توسل کرتے ہیں اسی کا کرتے ہیں جو نیک ہو، اس کا تو نہیں کرتے جو بد ہو، بحث تو ذات کی ہے لیکن کون سی ذات؟ نیک ذات! نیک ذات کی وجہ سے ہم توسل کرتے ہیں، بد ذات کی وجہ

سے تھوڑی کرتے ہیں! میں اس لیے کہتا ہوں کہ یہ آیت توسل بالذوات پر مستقل دلیل ہے۔ اس کو نوٹ فرمالیں۔

پھر میں ساتھ ساتھ اس خلجان کو بھی دور کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ توسل بالذات پر یہ آپ نے دلیل دی ہے، آپ سے پہلے بھی کسی نے یہ دلیل دی ہے؟ میں کہا کرتا ہوں کہ بھائی! اگر کسی نے نہ دی ہو اور دلیل موجود ہو تو اس میں حرج کی بات کیا ہے؟ ایک مسئلہ پر ہم سے پہلے والے حضرات پانچ دلائل پیش کریں اور ہم چھ پیش کر دیں تو ہم نے کوئی مسئلہ تبدیل کیا ہے کیا؟ وہی مسئلہ ہے البتہ دلیل کا اضافہ کیا ہے تو اس میں حرج کیا ہے؟

پھل اور گوشت جنت کی خوراک:

﴿وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ ۝٢٢﴾

ہم انہیں پھل بھی دیں گے اور گوشت بھی دیں گے، جو بھی ان کا دل چاہے ا ہم انہیں عطا کریں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھل اور گوشت جنت کی خوراک ہے۔ میں ایک جگہ دستر خوان پر تھا تو تین چار نوجوان لڑکے ساتھ تھے اور ایک بزرگ بھی تھے۔ اب وہ لڑکے ایسے تھے جو پھل نہیں کھا رہے تھے۔ بزرگ پھل شوق سے کھا رہے تھے۔ اب عام طور پر ہمارے آج کے جو بچے ہیں یہ پھل شوق سے نہیں کھاتے، چپس کھائیں گے، سلانٹی کھائیں گے، برگر کھائیں گے، سموسے کھائیں گے، پیزے کھائیں گے، شوارمے کھائیں گے لیکن پھل کی طرف ان کی رغبت نہیں ہے، ان کا یہ مزاج بن گیا ہے۔ تو وہ بزرگ ان لڑکوں سے کہنے لگے کہ بیٹا! تم پھل نہیں کھاتے تو جنت میں کیا کرو گے؟ اب یہ بزرگ ان کو دلیل دے رہے تھے کہ جنت میں بھی پھل ہوں گے، لہذا پھل کھانے چاہییں تاکہ پھل کھانے کا مزاج بنے۔

یہ بات یاد رکھنا کہ جنت میں جانے پر اہلِ جنت کا مزاج خود بخود جنت والا ہو جائے گا۔

ملائیشیا میں دیکھ لیں۔ طلبہ صبح بھی چاول کھاتے ہیں، دوپہر میں بھی چاول کھاتے ہیں اور رات میں بھی چاول کھاتے ہیں اور چاول بھی سفید رنگ کے جو پھیکے ہوتے ہیں اور ساتھ اس کے عموماً مچھلی ہوتی ہے۔ آپ لوگ نہیں کھا سکتے لیکن وہ کھاتے ہیں۔ تو اس دفعہ جو میرا ملائیشاء کا سفر تھا۔ تو وہاں یہ بات چل پڑی کہ بھائی ہمارے ہاں کھانا یہ ہوتا ہے اور ملائیشاء میں کھانا یہ ہوتا ہے۔ وہاں ہمارے شاگرد ہیں مولانا طاہر صاحب، یہاں مرکز میں انہوں نے تخصص کیا ہے وہاں میرے میزبان وہی ہوتے ہیں؛ انہوں نے مجھے کہا کہ استاد جی! اصل بات یہ ہے کہ جیسی زمین ہوتی ہے، جیسا موسم ہوتا ہے وہاں کے لوگوں کا اللہ تعالیٰ اسی طرح کا پیٹ بناتے ہیں، اس لیے پاکستان کا جیسا موسم ہے وہاں اسی طرح کی خوراک ہوتی ہے اور ہمارا جیسا موسم ہے اسی طرح کا ہمارا پیٹ ہے اور ایسی ہی ہماری خوراک ہے۔

تو وہاں کی جو خوراک ہے اگر وہی خوراک یہاں پنجاب پاکستان والے کھائیں تو ان کے پیٹ برداشت نہیں کریں گے۔ ادھر کا موسم ہی ایسا ہے تو موسم کے مطابق اللہ خوراک دیتے ہیں۔ جب آدمی جنت میں جائے گا تو اللہ پاک اس کا مزاج بھی یوں بنا دے گا۔ اللہ ہم سب کو عطا فرمادیں۔ (آمین)

جنت میں دوستانہ چھینا جھپٹی:

﴿يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ﴿٢٣﴾﴾

اہل جنت جنت میں شراب پر ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی بھی کریں گے، یہ محبت کی باتیں ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے سے جام کھینچیں گے۔ لیکن وہاں نہ تو بیہودگی ہوگی اور نہ ہی کوئی گناہ ہوگا۔ یعنی ایک ہوتا ہے کہ آدمی فضول بک بک کرے

وہاں یہ نہیں ہوگا اور سچ مچ گناہ کی باتیں کرے وہاں یہ بھی نہیں ہوگا۔

﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴿٢٤﴾﴾

اللہ رب العزت جنت میں حوریں بھی عطا فرمائیں گے اور جنت میں خدمت کے لیے بچے بھی عطا فرمائیں گے اور وہ بچے ایسے ہوں گے جیسے چھپے ہوئے موتی ہوتے ہیں یا تو اپنی اولاد ہوگی یا جنتی ہوگی جیسے حوریں ہوں گی اللہ ایسے ہی وہاں کی ایک مخلوق پیدا فرما دیں گے۔

﴿وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ ﴿٢٧﴾﴾

وہاں جنتی ایک دوسرے سے باتیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ جب ہم دنیا میں تھے تو بہت ڈر لگتا تھا کہ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟! اللہ نے ہم پر کتنا احسان کیا ہے اور ہمیں جھلسانے والی آگ سے بچا لیا ہے۔ اب سمجھ آگئی ہے۔

﴿فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ﴿٢٩﴾﴾

میرے پیغمبر! آپ ان کو نصیحت کریں، اللہ کا کرم ہے کہ آپ کاہن بھی نہیں ہیں اور مجنون بھی نہیں ہیں۔

کاہن ایسے ہوتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں نجومی ہوتے ہیں جو ستاروں کو دیکھ کر بتاتے ہیں، آپ اللہ کے فضل و کرم سے ایسے نہیں ہیں۔

شعر کا معنی؛ لغوی اور اصطلاحی

﴿أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ ﴿٣٠﴾﴾

یہ کہتے ہیں کہ شاعر ہیں اور ہم ان پر موت کے حادثے کا انتظار کر رہے ہیں کہ یہ کب ختم ہوتے ہیں۔

یہ بات میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایک ہوتا ہے شعر لغوی اور ایک ہوتا ہے شعرِ اصطلاحی اور عرفی۔ لغتِ عرب میں شعر کا معنی یہ نہیں ہے کہ مقفّٰی اور مسجّع کلام ہو۔ شعر کا معنی مقفیٰ اور مسجیٰ کلام کرنا یہ عرفی معنی ہے، یہ لغوی نہیں ہے۔ یہ جو لوگ کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو شعر نہیں پڑھتے تھے تو پھر وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کیسے کہتے تھے؟ پھر شاعر ہونے کا الزام کیسے لگاتے تھے؟

اصل بات یہ ہے کہ شعر کا معنی ہوتا ہے خیالی باتیں کرنا، جس کا خارج میں وجود نہ ہو، جس طرح منطق میں فرضی قضایا کو کہتے ہیں کہ یہ دلائل شعریہ ہیں۔ تو شعر کہتے ہیں خیالی بات کو جس کا خارج میں وجود نہ ہو۔ تو وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ فرضی باتیں کرتے ہیں کہ مر جائیں گے، پھر اٹھیں گے، پھر حساب کتاب ہو گا، پھر جنت ہو گی یا جہنم ہو گی... یہ سب خیالی باتیں ہیں، یہ شاعر ہیں۔ تو وہ لوگ حضور علیہ السلام کو شاعر لغوی معنی کے اعتبار سے کہتے تھے ورنہ جو عرفی شعر ہوتا ہے وہ تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے بھی نہیں تھے، اس کا انہوں نے کیا الزام لگانا ہے؟ اس کے بارے میں تو قرآن نے صاف فرما دیا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ﴾[188] کہ ہم نے حضور علیہ السلام کو شعر کی تعلیم نہیں دی مطلب کہ ہم نے آپ کو عرفی شعر کا فن نہیں دیا اور یہ آپ کی شان کے مناسب بھی نہیں ہے۔

﴿قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ ﴿۳۱﴾﴾

آپ فرمائیں کہ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ دیکھیں گے کہ انجام کس کا کیا ہوتا ہے؟

188۔ یٰسین 69:36

”قرآن گھڑا ہوا کلام ہے“ کا تحقیقی اور الزامی جواب

﴿اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ۝۳۲ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۳۳ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ۝۳۴﴾

یہ اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں تو اللہ نے فرمایا: کیا ان کی عقلمندی ان کو یہی بات کہتی ہے کہ یہ لوگ ایسا کام کریں؟ یا یہ لوگ سچ مچ ہیں ہی سرکش کہ بلاوجہ ایسی باتیں بکتے ہیں۔ یا یہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ کلام خود گھڑ لیا ہے؟! بلکہ یہ لوگ تصدیق نہیں کرتے۔ اگر یہ لوگ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں تو اس قرآن جیسا کوئی کلام تو بنا کر لائیں!

اللہ نے ان کی بات کے دو جواب دیے ہیں؛ ایک جواب تحقیقی ہے اور دوسرا جواب الزامی ہے۔ تحقیقی اور الزامی جواب دینا یہ قرآن کریم کا طرز ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں لکھا ہے کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کو خود گھڑ لیا ہے تو اس کا تحقیقی جواب تو یہ ہے کہ ایسی بات نہیں بلکہ یہ لوگ یہ بات صرف اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ”لَا يُؤۡمِنُوۡنَ“ کہ یہ لوگ عناد کی وجہ سے قرآن کی تصدیق نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ آدمی جس چیز کی تصدیق نہ کرتا ہوں وہ چیز ہزار حق اور صحیح ہو لیکن عنادی بندہ ہمیشہ اس کی نفی ہی کرے گا۔ تو تحقیقی جواب تو یہ ہے۔

اور الزامی جواب یہ ہے کہ اچھا! اگر آپ کہتے ہیں کہ یہ قرآن انہوں نے خود گھڑ لیا ہے تو ﴿فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ﴾ اسی طرح کا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ! تم نہیں بنا سکتے تو اس پر کیوں الزام لگاتے ہو کہ اس نے بنالیا ہے۔

﴿اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَيۡرِ شَيۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ۝۳۵ اَمۡ خَلَقُوا

السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾

کیا یہ لوگ خود بخود پیدا ہو گئے؟ یا انہوں نے اپنے آپ کو خود پیدا کر لیا ہے؟ یا آسمان اور زمین کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اور کچھ بھی نہیں ہے اصل بات یہی ہے کہ بس یہ لوگ اللہ کو مانتے نہیں ہیں۔

نبوت وہبی ہے:

﴿اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَۜيۡطِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾﴾

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ طائف والے کہتے تھے کہ اللہ نے نبی بنانا تھا تو ہم میں سے کسی عزت والے بڑے آدمی کو بناتے! یہ کیسے نبی بن گیا؟ اللہ فرماتے ہیں کہ کیا اللہ کی رحمت کے خزانے ان کے پاس ہیں کہ جس کو چاہیں نبی بنائیں اور جس کو چاہیں نبی نہ بنائیں؟! یا یہ لوگ حاکم بنے ہوئے ہیں کہ ان کے قبضہ میں تو خزانے نہ ہوں لیکن جس کے قبضہ میں خزانے ہیں ان سے کہہ کر یہ لوگ کسی کو نبوت دلواتے ہوں۔ تو اللہ نے دونوں احتمالات کی نفی فرمادی۔

﴿اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ ۚ فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۸﴾﴾

کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اوپر چڑھتے ہیں اور جا کر آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں؟ اگر کوئی ایسی سیڑھی ہے تو ان میں سے کوئی جائے اور اوپر کی باتیں سن کر آئے اور کوئی واضح دلیل لے کر آئے!

اپنے لیے بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں!

﴿اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَلَكُمُ الۡبَنُوۡنَ ﴿۳۹﴾﴾

اور یہ لوگ بھی کتنے عجیب ہیں! کہتے ہیں کہ ہمیں تو بیٹے پسند ہیں اور اللہ کے

لیے فرشتے بیٹیاں ہیں۔ جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ تم اللہ کے لیے کیوں پسند کرتے ہو؟

اور عجیب بات یہ ہے کہ جب اللہ رب العزت نے یہ بات فرمائی ہے ان کے بارے میں کہ یہ لوگ اپنے لیے بیٹیاں پسند نہیں کرتے اور اللہ کے لیے بیٹیاں پسند کرتے ہیں تو وہاں پر بیٹیوں کی صفت بیان کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے کتنی عجیب بات فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَ لَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ان لوگوں نے خدا کے لیے بیٹیاں بنا رکھی ہیں، سبحان اللہ! اور اپنے لیے بیٹے جو ان کو پسند ہیں! ﴿وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾﴾ اور جب ان سے کہا جائے کہ تمہارے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو ان کے چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں اور وہ گھٹ گھٹ کر مرنے لگتے ہیں، ﴿يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ﴾ (سورۃ النحل) اور یہ آدمی جس کو بیٹی کی خوشخبری دی گئی وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اسے بری خبر ملی ہے۔

آگے ایک بات اور فرمائی وہ اس سے بھی عجیب ہے۔ بیٹیوں کی جو صفتیں بیان فرمائی ہیں ان میں یہ ہے کہ ﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَ هُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾﴾ [189] یہ عورتوں کی صفت ہے کہ وہ بات کھل کر سمجھا نہیں سکتیں اور زیوروں میں پیدا ہوتی ہیں، اس کا معنی کہ زیور عورت کی فطرت میں شامل ہے۔

تو جس چیز کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ خدا کے لیے کیسے تجویز کر لیتے ہو؟! کیسی تمہاری تقسیم ہے!

189۔ الزخرف 18:43

اجرت علی تعلیم الدین جائز ہے... دلیل:

﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴾

اے پیغمبر! آپ ان سے پیسے تو نہیں مانگتے کہ آپ ان پر بوجھ ہو!

بعض لوگ ایسی آیات پیش کرتے ہیں کہ اجرت علی تعلیم الدین درست نہیں ہے کیونکہ اللہ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ تم ان سے پیسے تھوڑی لیتے ہو! اس پر تفصیل سے بات ہو چکی ہے۔ خلاصہ ہر جگہ پر میں عرض کرتا ہوں کہ ایک ہوتا ہے مخالف اور ایک ہوتا ہے موافق۔ یہ کفار؛ نبوت کے مخالف تھے اور مخالف کو دین سمجھائیں تو پیسے نہیں لیتے، ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا﴾ کا تعلق مخالف سے ہے اور موافق کو دین بیان کریں اور اس سے پیسے لے لیں تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔ مخالف اور ہوتا ہے اور موافق اور ہوتا ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی لیتے تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہدایا دیتے تھے۔ اور اس پر میں جو ایک دلیل پیش کرتا ہوں آپ اس کو سمجھیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تجارت شروع کی، پچیس سال میں آپ کا نکاح ہوا، جب چالیس سال کی عمر ہو گئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت چھوڑ دی۔ اب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بیوی ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شوہر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا خرچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا برداشت کرتی ہیں اعلانِ نبوت کے بعد۔ حالانکہ خرچ برداشت کرنا تو شوہر کے ذمے ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ

بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ[190]

شوہر کی بیوی پر فضیلت کی ایک وجہ یہ ہے کہ نفقہ شوہر کے ذمے ہے۔ تو قرآن سے ثابت ہے اور اعلانِ نبوت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خرچہ آپ کی بیوی برداشت کر رہی ہے۔ اب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر مال خرچ کرتی ہیں تو وہ بیوی ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ حضور کی امتی ہونے کی حیثیت سے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بیوی بھی ہیں اور امتی بھی ہیں۔ جب تک بیوی تھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کرتے تھے اور جب نسبت بدل گئی کہ بیوی بھی ہیں اور امتی بھی ہیں تو اب خرچ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا فرمارہی ہیں۔

اب دیکھو! یہ جو مال خرچ ہو رہا تھا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امتی ہونے کی حیثیت سے خرچ ہو رہا تھا کہ حضور! آپ دین کا کام کریں، جو میرا مال ہے وہ آپ کے لیے حاضر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو تجارت نہیں فرمارہے تو حضور پر خرچ آپ کے صحابہ فرمارہے ہیں، آپ کی صحابیات فرمارہی ہیں۔ اس لیے جب بھی کوئی عالم؛ دین کا کام کرے گا اور ساتھ تجارت بھی شروع کر دے تو دین کا کام نہیں کر سکے گا اور جب خود کو دین کے کام کے لیے فارغ کرے گا تو خرچ اس پر کون کریں گے؟ اس کے معتقدین، اس کے متبعین، اس کے موافقین، اس کے تلامذہ، اس کے مریدین، اس کے مقتدی۔

تو یہ لوگ دلیل کیا پیش کر رہے ہیں کہ پیغمبر کافروں سے مال نہیں لیتے تھے۔ کافروں سے تو ہم بھی نہیں لیتے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جو دین کے منکر ہیں کیا

190۔ النساء4:34

کبھی ہم نے ان سے مانگا ہے جو تم ہمارے خلاف یہ آیتیں پیش کر رہے ہو! جب ہم ان سے مانگیں تو پھر تم ہمارے خلاف یہ آیتیں پیش کرنا۔ اللہ رب العزت سمجھ عطا فرمائے۔ (آمین)

غیب کی تعریف:

﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝﴾

یا ان کے پاس غیب کا علم ہے کہ جس کو یہ لکھ لیتے ہیں، پھر محفوظ کرتے ہیں، پھر باتیں کرتے ہیں۔ کوئی غیب ان کے پاس موجود نہیں اس لیے ایسی باتیں مت کریں۔

مطلق غیب کہتے ہیں: "إِنَّ الْغَيْبَ الْمُطْلَقَ فِي الْإِطْلَاقَاتِ الشَّرْعِيَّةِ مَا لَمْ يَقُمْ عَلَيْهِ دَلِيْلٌ وَّلَا إِلٰى دَرْكِهٖ وَسِيْلَةٌ وَّسَبِيْلٌ"[191]

یہ تعریف المہند علی المفند میں ہے۔یعنی اصطلاحِ شریعت میں مطلق غیب وہی ہوتا ہے جس پہ کوئی دلیل نہ ہو اور وہ بغیر کسی واسطہ ووسیلہ کے حاصل ہو۔

سرکشوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں!

﴿اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ۝﴾

کیا یہ تمہارے خلاف تدبیریں اختیار کرتے ہیں؟ جو لوگ کافر ہیں اور تدبیریں کر رہے ہیں تو یہ اپنے جال میں خود آئیں گے۔

﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝﴾

اے پیغمبر! آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں حتی کہ وہ دن آ جائے کہ

191۔المہند علی المفند: ص88

جس دن لوگ بے ہوشی کے عالم میں پڑے ہوں گے۔

﴿يَوْمَ لَا يُغْنِىْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٦﴾﴾

وہ دن ایسا ہوگا کہ جس دن کوئی تدبیر ان کے کام نہ آئے گی اور ان کی مدد بھی کوئی نہیں کرے گا۔

﴿وَ اِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾﴾

ان کے لیے ایک عذب تو قیامت کے دن ہوگا، ایک عذاب اس سے بھی پہلے ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔

مصیبتوں پر صبر کیجیے!

﴿وَ اصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٤٨﴾ وَ مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿٤٩﴾﴾

اب اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ آپ صبر کریں، آپ ہماری حفاظت میں ہیں، یہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اور یہ جو آپ کو پریشانی ہے کہ یہ لوگ بات نہیں مانتے تو آپ خود کو مشغول کرلیں اللہ کی تسبیح میں "حِيْنَ تَقُوْمُ" جب آپ مجلس سے اٹھیں یا جب آپ سو کر اٹھیں تو آپ اس کا خیال کیا کریں۔ اور رات کو بھی تسبیح کیا کریں اور جب ستارے نکل آئیں تب بھی آپ اللہ کی تسبیح کیا کریں۔

مجلس سے اٹھنے کی دعا:

اس آیت کے تحت بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب بھی کوئی مجلس ہو، مجلس کے برخاست ہونے پر آدمی یہ دعا پڑھ لے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ

إِلَيْكَ.[192]

[یااللہ! تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے، میں تیری تعریف کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں] تو اس مجلس میں ہونے والے تمام گناہوں کو اللہ پاک اپنے فضل سے معاف فرما دیتے ہیں۔ اللہ ہمیں نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

192۔ سنن الترمذی، رقم:3433

سورۃ النجم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَ النَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَ مَا غَوٰی ۚ﴿۲﴾ وَ مَا یَنۡطِقُ

عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾﴾

سورت کی خصوصیت اور شانِ نزول:

سورۃ النجم پہلی وہ سورت ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عجیب بات یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جب سورت نجم نازل ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرے بازار میں جہاں مؤمن اور کافر سب جمع تھے اس سورت کی تلاوت فرمائی اور آیت سجدہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں چلے گئے۔ صحابہ کرام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں سجدے میں چلے گئے اور جو تمام کفار تھے ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سجدے میں گر گئے۔ ایک کافر ایسا تھا جو سجدے میں نہیں گیا، اس نے مٹی زمین سے اٹھالی اور اپنے ماتھے پر لگائی اور کہا کہ میرا سجدہ یہی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو حالت کفر پر قتل ہوتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے۔ اس نے کبر اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ وہ کفر ہی پہ مرا ہے۔

حضور علیہ السلام کا جبرئیل امین کو دوبار دیکھنا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرائیل امین کا دو مرتبہ دیدار ہوا ہے۔ ایک مرتبہ معراج سے پہلے اور ایک مرتبہ معراج کے موقع پر۔ معراج سے پہلے دیدار اس زمانے میں ہوا جو فترت وحی کا زمانہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کے بعد چھ ماہ یا تین سال تک جو وحی نہیں آئی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل امین کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا کہ جبرائیل امین مشرق کی جانب جہاں سورج طلوع ہوتا ہے، وہاں پہ کھڑے ہیں اور آپ کے جسم پر چھ سو پر ہیں اور پورے مشرق اور مغرب کو ایسے ڈھانپ رکھا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے ہوش ہوگئے جبرائیل امین کو دیکھ کر۔

اور دوسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر دیکھا ہے سدرۃ المنتہی کے پاس۔ یہ سدرۃ المنتہی ایک بیری کا درخت ہے اور یہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ بیری کو عربی میں "سدرۃ" کہتے ہیں اور "منتہٰی" کا معنی ہوتا ہے "انتہائی جگہ"۔ نیچے سے جو نیک اعمال جاتے ہیں وہ سدرۃ پر پہنچتے ہیں اور وہاں سے ملائکہ اوپر لے جاتے ہیں اور اوپر سے جو احکام آتے ہیں وہ ملائکہ سدرۃ تک چھوڑتے ہیں پھر اگلے فرشتے وہاں سے ان احکامات کو نیچے لاتے ہیں۔ تو یہ درمیان میں ایک جگہ ہے جیسے جنکشن ہوتا ہے، یہ اللہ نے جگہ بنائی ہے اور اسی کے پاس پھر جنت ہے۔ تو جنت سات آسمانوں کے اوپر ہے، اوپر پھر اللہ کی عرش کی چھت ہے، اس کے نیچے جنت ہے۔ تو یوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل امین کو دوبار دیکھا ہے۔

اگلی جو آیات آرہی ہے ان آیات میں یہی مراد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ حضرت جبرئیل کو دیکھا ہے۔ البتہ بعض مفسرین اور صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کی رائے یہ بھی ہے کہ ان آیات میں جو دوسری بار دیکھنا مراد ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات کا دیدار ہے۔ دونوں رائے ہیں۔ دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں۔

حضور علیہ السلام کو تسلی:

﴿وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ۝١ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝٢﴾

قسم ہے ستارے کی جب وہ اوپر سے نیچے آئے، تمہارے ساتھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہی راستہ بھولے ہیں اور نہ ہی غلط راستے پر چلے ہیں۔ "صَاحِبُكُمْ" کہہ کر یہ تسلی دی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے ایک بشر ہیں، کوئی الگ نہیں ہیں تو اس سے بندے کو اُنس پیدا ہوتا ہے۔

ضلال اور غویٰ میں فرق ہے:

ضلال... کہتے ہیں کہ کوئی شخص راستہ بھول جائے اور اسے راستہ نہ ملے اور غویٰ... کہ کوئی شخص غلط راستہ پر چل پڑے۔ تو فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو ضلال ہیں اور نہ ہی غویٰ ہیں یعنی نہ ایسا ہے کہ آپ کو راستہ نظر نہیں آتا اور نہ ایسا ہے کہ آپ غلط راستے پر چل پڑے ہیں۔

حضور علیہ السلام اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرمائے!

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝٣ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝٤﴾

اور آپ اپنی خواہش سے بات نہیں فرماتے ہیں بلکہ آپ کی بات وحی ہوتی ہے جو آپ کو بھیجی جاتی ہے۔ اور وحی بھی کون لاتا ہے؟ فرمایا:

﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝٥ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝٦ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝٧﴾

وحی لانے والا طاقتور ہے، ﴿ذُوْ مِرَّةٍ﴾ جو فطرتاً طاقتور ہے کسی کی وجہ سے

طاقت ور نہیں بنا۔ مراد حضرت جبرائیل امین ہیں۔ ”فَاسْتَوٰی“ وہ جبرائیل امین اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور وہ افق کے اوپر والے کنارے کی طرف تھے تاکہ نظر آئیں۔

جبرئیل اور حضور کا قرب:

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝٨ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝٩﴾

پھر حضرت جبرائیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گئے، ﴿فَتَدَلّٰى﴾ پھر مزید قریب ہوئے اور کتنا قریب ہوئے فرمایا ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ﴾ قوسان کے فاصلے کے برابر، ﴿اَوْ اَدْنٰى﴾ بلکہ اس سے بھی قریب ہوئے۔

اصل میں ایسے تھا کہ اگر عربوں کے دو قبیلوں میں مخالفت ہوتی، پھر وہ دونوں مخالفت ختم کر کے آپس میں صلح کر لیتے تو اس کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے اور دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ پہ ہاتھ نہیں مارتے بلکہ وہ دونوں کمان لیتے اور کمان کا ایک پچھلا حصہ ہوتا ہے اور ایک اگلا حصہ ہوتا ہے جہاں دھاگہ لگا ہوتا ہے اور دوسری کمان کی مڑی ہوئی لکڑی کی جگہ ہوتی ہے، تو وہ لوگ لکڑی کی جگہ اپنی طرف رکھتے اور دھاگے کی جگہ دوسری طرف رکھتے اور دھاگے سے دھاگا ملاتے۔

”قاب“ کسے کہتے ہیں، ذرا اسے سمجھیں! مثلاً یہ کمان بنی ہوئی ہے، ایک طرف یہ لکڑی ہے اور دوسری طرف یہ دھاگہ ہے۔ اس لکڑی اور اس کے بالمقابل جو دھاگہ ہے اس کے درمیانی فاصلہ کو قاب کہتے ہیں۔ یہ فاصلہ تقریباً ایک ہاتھ کے برابر ہوتا ہے۔ تو جب عرب لوگ دوستی کرتے تو کمانوں کو یوں پکڑتے اور لکڑی والا حصہ اپنی طرف رکھتے اور رسی والا حصہ دوسرے کی طرف کرتے۔ یوں یہ رسیاں آپس میں مل جاتیں اور ان دونوں آدمیوں کے درمیان فاصلہ دو قاب کا ہوتا تھا۔

تو اب مطلب یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اتنے قریب ہو گئے جتنا دو قاب کا فاصلہ ہوتا ہے تقریباً ایک ذراع کے برابر، "أَوْ أَدْنٰى" بلکہ اس سے بھی قریب ہو گئے۔ دونوں کمانیں تو آپس میں ملیں گی لیکن دونوں کے درمیان پھر بھی فاصلہ رہے گا لیکن جبرائیل امین جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوئے یہ فاصلہ بھی ختم ہو گیا اور قریب ہو گئے۔

یہ بتانا مقصود ہے کہ جب دو دشمنوں کی صلح ہوتی ہے، ان کا جب قرب ہو تو قرب جسمانی ہوتا ہے اور جبرائیل امین کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو قرب ہوا ہے یہ صرف قرب جسمانی نہیں ہے بلکہ یہ قرب روحانی بھی ہے، ان کے نظریات بھی ایک ہیں۔ دو لڑنے والے صلح کرتے ہیں، کبھی نظریہ ایک نہیں ہوتا، بس عارضی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہو کر جنگ ختم کرتے ہیں اور جبرائیل امین اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو آپس میں قریب ہیں وہ نظریاتی طور پر بھی قریب ہیں اور جسمانی طور پر بھی قریب ہے۔

دوسری رؤیت سے کون مراد ہے؟

﴿فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰى ﴿١٠﴾﴾

اور اللہ رب العزت نے اپنے بندے کی طرف جو وحی فرمانا چاہی وہی وحی فرمائی ہے۔

اب جو حضرات فرماتے ہیں کہ "ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى" سے مراد اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ وہ دونوں آپس میں قریب ہوئے ہیں تو اس میں تاویل کرنی پڑتی ہے کہ قریب ہونا اور مزید قریب ہونا ذات کے اعتبار سے یہ تو اس میں ہوتا ہے کہ جس کا جسم ہو اور وہ جبرائیل امین ہیں۔ اللہ تو جسم سے پاک ہے۔ اب ان کے قرب

سے مراد قربِ تجلی لیں گے تو تاویل کرنی پڑے گی۔ بلا تاویل اگر قرب مراد لیں گے تو وہ جبرائیل امین کا ہو گا اور اگر اللہ کا قرب مراد لیں گے تو وہ تاویل کے ساتھ ہو گا۔ تو جو بلا تاویل ہو اور صاف صاف بلا تکلف نظر آتا ہے وہ قرب حضرت جبرائیل امین کا ہے۔

تو جو حضرات کہتے ہیں کہ اللہ کا قرب ہے تو ان کی دلیل ﴿فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی﴾ ہے کہ یہ جملہ درمیان میں آرہا ہے کہ پھر اس نے وحی بھی کی، تو وحی تو اللہ کرتے ہیں اس لیے قرب سے مراد اللہ کا قرب ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ سمجھانا یہ مقصود ہے کہ قرب جبرائیل امین کا ہے لیکن اس وقت جبرائیل امین اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں قریب ہوئے ہیں لیکن قرب بلا وحی نہیں تھا بلکہ بواسطہ جبرائیل امین وحی اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ تو جبرائیل امین کو قریب بھی کیا ہے اور ایسے موقع پر وحی بھی نازل کی ہے۔

بسا اوقات یہ ہو سکتا ہے کہ آپ جبرائیل امین کو دیکھیں اور وحی نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دیکھیں بھی اور وحی بھی ہو۔ تو اس سے اُنس اور بڑھ جاتا ہے یعنی آپ پر وحی آتی اور جبرائیل امین کو دیکھے بغیر آتی، محض ان کی آواز ہوتی تھی اور جسم نہیں ہوتا تھا۔ اب اگر جسم ہو اور آواز نہ ہو تو آواز کی شناخت نہیں ہو گی اور اگر جسم اور آواز دونوں ہوں تو آئندہ بغیر دیکھے جب وحی آئے گی تو شناخت اور آسان ہو جائے گی۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ویسے بھی یقین ہوتا ہے لیکن وہ مشاہدے والا یقین بھی ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔

﴿مَا كَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾﴾

جو کچھ آپ نے آنکھ سے دیکھا ہے دل نے اسی کی تصدیق کی ہے، ایسا نہیں

ہوتا کہ آدمی آنکھ سے دیکھتا ہے لیکن دل اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

مثلاً آدمی دور دیکھتا ہے کہ وہ دھواں ہے، دل کہتا ہے کہ نہیں، دھواں نہیں ہے دھول ہے۔ اب دیکھو! آنکھ دیکھ رہی ہے لیکن دل اس کی تصدیق نہیں کر رہا۔ اب آپ گرمیوں میں سڑک پر دیکھتے ہوں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے پانی ہے حالانکہ پانی نہیں ہوتا، دل کہتا ہے کہ یہ سراب ہے، تو اب آنکھ تو دیکھ رہی ہے لیکن دل تکذیب کر رہا ہے۔

فرمایا: یہاں ایسا نہیں تھا بلکہ جو آنکھ دیکھ رہی تھی دل اس کی تصدیق بھی کر رہا تھا۔

﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿١٢﴾﴾

اور جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کیا تم اس میں شک کرتے ہو؟ حالانکہ یہ شک والی بات نہیں ہے۔

﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾﴾

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار اس کو دیکھا۔ کہاں؟ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى﴾ سدرۃ المنتہٰی کے پاس۔ اب دیکھو! یہاں ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى﴾ فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ "اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا قَدْ رَاٰى"۔ اگر "عَلٰى مَا قَدْ رَاٰى" ہوتو اس سے مراد ہو گا کہ جو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن یہاں "عَلٰى مَا يَرٰى" ہے کہ جو کچھ اب آپ نے دیکھا ہے وہ بھی ٹھیک ہے اور جو آئندہ دیکھیں گے وہ بھی ٹھیک ہے، دونوں پہ شک نہیں کرنا۔

اب یہاں "عَلٰى مَا يَرٰى" آیا ہے اور آگے صیغہ "رَاٰهُ" پھر ماضی کا آگیا

ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آئندہ دیکھنا بھی ایسے یقینی ہے جیسے پہلے دیکھنا یقینی تھا اور جب ہونے والے کام پر یقین ہو تو پھر وہاں پر صیغہ ماضی لاتے ہیں کہ یہ ایسے ہے جیسا کہ ہو چکا ہے، اتنا یقین ہونا چاہیے۔

﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى﴾ بیری کے پاس جو کہ بالکل آخر میں ہے،

﴿عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ سدرۃ المنتہی کے پاس جنت ہے۔ ماوٰی کہتے ہیں رہنے کی جگہ کو، رہنے کی جگہ جنت ہے جہاں ابدی رہیں گے۔

﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾﴾

جب بیری کو اس چیز نے ڈھانپ لیا جس نے ڈھانپ لیا۔

کس نے ڈھانپا؟ کہتے ہیں کہ سونے کے پروانے تھے یا ملائکہ تھے جنہوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾﴾

نہ تو آنکھ ادھر ادھر ہٹی ہے اور نہ ہی حد سے بڑھی ہے۔

زاغ اور طغیٰ میں فرق:

زاغ یہ ہے کہ ایک آدمی کسی چیز کو دیکھنا چاہتا ہے لیکن پھر دیکھنا چھوڑ دیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نے ایسا نہیں کیا بلکہ جس کو دیکھنا تھا اسی کو دیکھتی رہی۔ اور طغی کا معنی یہ ہے کہ جس کو دیکھنا تھا اس کے ساتھ اور چیزوں کو بھی دیکھنا شروع کر دے، یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو دیکھنا تھا صرف اسی کو دیکھا۔ تو نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ دیکھنے میں چوک گئی ہے اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نے کئی چیزوں کو دیکھنا شروع کیا۔

جو کام ذمہ ہو وہیں کریں!

اس میں ایک بات یہ سمجھ لیں کہ پیغمبر کی شان یہ ہے کہ نبی وہی کام کرتا ہے جس کا حکم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ وہ کام نہیں کرتا جس کا حکم نہ ہو۔ اس سے یہ اصول سمجھ میں آتا ہے کہ ادب کا طریقہ یہ ہے کہ جو کام ذمے نہ ہو اس کو چھوڑ دیں اور جو ذمے لگے اسی کو کریں۔ اس سے آدمی کی ترقی بہت جلد ہوتی ہے اور بطور خاص طلبہ اور مریدین کو ان چیزوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ مثلاً آپ سبق پڑھ رہے ہیں؛ دورانِ سبق بڑی سے بڑی شخصیت آ جائے تو طالب علم کو چاہیے کہ نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، صرف اپنے سبق کو دیکھتا رہے۔ ہاں اگر استاد ہی کہہ دیں کہ سبق بند کر دو اور دروازہ کھول دو تو اور بات ہے، جب تک استاد نہ کہیں تب تک طالب علم کو نگاہ نہیں اٹھانی چاہیے۔ اسی طرح جب مرید اپنے شیخ کی مجلس میں ہو تو پھر اس کے شیخ سے بڑا شیخ بھی آ جائے تو پھر مرید کو دائیں بائیں نہیں دیکھنا چاہیے، اس کے بغیر فائدہ مکمل نہیں ہوتا۔

نفع اپنے شیخ ہی سے ہوتا ہے... مثال:

حضرت مولانا رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ نکاح سے پہلے بیوی کو سوچ لینا چاہیے کہ جس کے ساتھ میرا نکاح ہونا ہے وہ بدصورت ہے یا خوب صورت ہے لیکن جب نکاح ہو جائے تو اب اس کو چھوڑ کر خوب صورت کو دیکھے تو یہ ٹھیک نہیں ہے، اسی طرح جب بیعت کرنی ہے تو دیکھ لو کہ میرا پیر کیسا ہے؟ لیکن جب بیعت ہو جائیں تو اب دائیں بائیں نہ دیکھو، جس طرح عورت کا شوہر کالا بھی ہو تو عورت کو فیض یعنی اولاد اسی شوہر سے ملنی ہے اسی طرح پیر اگر ناقص بھی ہو جب بیعت کریں تو مرید کا ذہن یہ ہونا چاہیے کہ مجھے اب فیض اسی مرشد سے ملنا ہے۔ پھر اس کو فیض ملتا ہے وگرنہ نہیں ملتا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

ہاں جب عورت یہ سمجھے کہ میرا شوہر ایسے ایسے ہے، میرا اس سے نبھا نہیں ہو سکتا تو پھر احسن طریقے سے اس سے علیحدگی کرے، خلع ہو سکتا ہے حق مہر دے کر کر الگ ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مرید اگر یہ سمجھے کہ مجھے شیخ سے فائدہ نہیں ہو رہا تو پھر احسن طریقے سے شیخ کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرے لیکن جب تک اس کے ساتھ تعلق رکھیں تو مکمل تعلق رکھیں، پھر اس کو دھوکہ نہ دیں۔

اللہ کی بڑی بڑی نشانیوں کا دیدار:

﴿لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی ﴿۱۸﴾﴾

آپ نے وہاں اللہ کی بڑی بڑی نشانیاں بھی دیکھی ہیں۔

یہاں ایک دو باتیں سمجھ لیں؛

[۱]: پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ ﴿وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ۙ﴿۴﴾﴾ پیغمبر جب بھی کوئی بات فرماتے ہیں تو وحی سے فرماتے ہیں۔ اگر مراد معانی اور الفاظ دونوں ہوں تو اس کا نام قرآن ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ معنی بتادیا جائے اور الفاظ نہ بتائے جائیں تو اس کا نام حدیث ہے اور اس کو سنت بھی کہہ دیتے ہیں۔، اور یہ جو لفظ بتایا جارہا ہے یا معنی بتایا جارہا ہے کبھی حکمِ خاص یعنی جزئی کی وحی آتی ہے تو پیغمبر وہ بتاتے ہیں اور کبھی خاص جزئی کی نہیں بلکہ قاعدہ کلیہ کی وحی آتی ہے تو نبی وہ بتاتے ہیں۔

اب اس قاعدہ کلیہ سے پیغمبر اجتہاد کر کے جزئی خود نکالتے ہیں جو نبی کا اجتہاد ہوتا ہے، اگر وہ اجتہاد صواب ہو تو اللہ اس کو بر قرار رکھتے ہیں اور اگر اس اجتہاد میں خطا ہو تو اللہ بعد میں جزئی کی وحی نازل کر کے اس اجتہاد کو ختم فرمادیتے ہیں۔

اس لیے پیغمبر کی ہر بات کے وحی ہونے کا معنی سمجھ لیں ورنہ لوگ اعتراض

کریں گے کہ جب پیغمبر کی ہر بات وحی ہے تو پیغمبر کے اجتہاد پر بسا اوقات عتاب کیوں آتا ہے؟ اور بسا اوقات نبی کے اجتہاد کو اللہ ختم کیوں فرماتے ہیں؟

[۲]: یہ مسئلہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ کبھی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مسئلہ جزئی کی صورت میں بطور وحی آتا ہے اور کبھی ایک قاعدہ کلیہ قانون کی صورت میں بطور وحی آتا ہے، پھر پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس قاعدہ کلیہ کے ذریعہ مسئلہ کا استنباط فرماتے ہیں، اس میں اگر خطا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ وحی نازل فرما کر نبی کی خطا کو ختم فرما دیتے ہیں اور پھر دوسرا مسئلہ آتا ہے۔

اب اس پر کسی کو شبہ ہو کہ جب تک اس اجتہاد کے مقابلے میں وحی نہیں آئی تب تک تو پیغمبر عمل اس اجتہاد پر کریں گے، جب اس کے مقابلے میں وحی آئی اور اس نے اس اجتہاد کو ختم کر دیا تو اب اس اجتہاد کی حیثیت کیا ہوئی جو ختم ہوا؟ ہم کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت وہی ہے کہ جیسے کوئی آیت نازل ہو جائے اور جب تک اس کی ناسخ آیت نازل نہ ہو تو اسی آیت پر عمل کیا جاتا ہے اور جب اس کی ناسخ آیت آتی ہے تو پہلی آیت پر عمل ختم ہو جاتا ہے لیکن جس دوران عمل کیا ہے اس دوران اس آیت کو غلط نہیں کہتے بلکہ اس پر عمل کا اجر پورا ملتا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ﴾[193]

بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا اور بعد میں وحی آگئی کہ منہ بیت اللہ کی طرف کرو تو جتنے ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے وہ نمازیں ضائع نہیں ہیں، وہ مقبول ہیں۔

[۳]: اسی طرح پیغمبر پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک کلیہ سے اجتہاد فرماتے ہیں، اس

193۔ البقرة 143:2

پر عمل کرتے ہیں، جب اس اجتہاد کے مقابلے میں نص آجاتی ہے تو جتنے دن اجتہاد پر عمل ہوا وہ اسی طرح قبول ہے جس طرح نص پر عمل کرنا مقبول ہوتا ہے۔ وجہ ہے ہے: ﴿وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ اس کو اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں۔

مشرکین کے بت: لات، منات اور عزیٰ:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ۝ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝﴾

"لات" یہ قبیلہ ثقیف کا بت تھا، "عزیٰ" یہ قریش کا بت تھا، "منات" بنو ہلال کا بت تھا۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے خدا بناکے رکھے تھے اور ساتھ مکان بنائے تھے کعبہ کی طرح۔ تو اللہ نے فرمایا کہ یہ جو لات، منات اور عزیٰ تم نے خدا بنا رکھے ہیں کیا ان میں کبھی تم نے غور کیا ہے؟ مطلب کہ یہ پتھروں سے تم بناتے ہو اور پھر ان کو پوجتے ہو! پھر فرمایا:

﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝﴾

اور پھر اپنے لیے تم نے بیٹے پسند کر رکھے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں طے کر رکھی ہیں! کوئی عقل کی بات کرو۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ کے لیے بیٹے مانیں تو ٹھیک ہے بلکہ یہ عرف کی بنیاد پر کہا کہ تم بیٹیاں خود پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لیے کیوں مانتے ہو؟ یہ کیسی ظالمانہ تقسیم ہے۔

ان بتوں کی حقیقت!

﴿اِنْ هِيَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝﴾

ان کی حقیقت یہی ہے کہ یہ چند نام ہیں جو تم اور تمہارے آباء و اجداد نے خود رکھے ہیں، اللہ نے ان پر کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ یہ کافر لوگ اپنے خیالات کی پیروی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔

ایک ظن وہ ہوتا ہے جو بے دلیل ہو اور ایک ظن وہ ہوتا ہے جو بادلیل ہو لیکن دلیل قطعی نہ ہو۔ وہ ظن جو بے دلیل ہو تو اس کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں اور وہ ظن اور گمان جو بادلیل ہو لیکن دلیل قطعی نہ ہو بلکہ دلیل ایسی ہو جس میں دوسری چیز کا احتمال بھی ہو جسے دلیلِ ظنی کہتے ہیں، تو اس سے جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ بھی ظنی ہوتا ہے۔ جیسے اخبارِ آحاد سے کوئی حکم ثابت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ احکام قطعیات میں سے ہیں جو کہ فرض ہیں اور یہ ظنیات میں سے ہیں جو کہ واجب ہیں یا سنت ہیں۔

تو گمان ہر جگہ برا نہیں ہوتا۔ وہ ظن جو بلادلیل ہو وہ برا ہوتا ہے اور وہ ظن جو بادلیل ہو لیکن دلیل قطعی نہ ہو تو وہ گمان قبول بھی ہے اور اس پر عمل کرنا واجب بھی ہے۔

﴿اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿٢٤﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَ الْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾﴾

تو تم کیا سمجھتے ہو کہ انسان جو خواہش کرے گا وہ پوری ہو جائے گی، ایسا کبھی نہیں ہوتا! دنیا اور آخرت کی سب نعمتیں اللہ کے پاس ہیں، اللہ جس کو چاہیں دیتے ہیں۔

﴿وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰى ﴿٢٦﴾﴾

فرشتے بھی قیامت کے دن سفارش نہیں کر سکتے سوائے اللہ کی چاہت اور اللہ کے مرضی کے، اللہ چاہیں گے تو وہ سفارش کر سکیں گے اور کسی نے کیا شفاعت کرنی ہے؟

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾ وَ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾﴾

یہ کافر لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتاتے ہیں جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، صرف بے دلیل گمان ہے اور جو بے دلیل گمان ہوتا ہے وہ حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا۔

غیروں کے بجائے اپنوں کی فکر کیجیے:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَ لَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾﴾

میرے پیغمبر! آپ ان کی فکر چھوڑیں جو ہمارے ذکر اور ہماری شریعت سے منہ موڑ چکے ہیں، یہ صرف دنیا کی زندگی چاہتے ہیں۔ اور ان کا مبلغ علم یہ دنیا کی زندگی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کون گمراہ ہے اور اللہ جانتا ہے کون ہدایت یافتہ ہے۔

اب یہاں دیکھو! اللہ اپنے پیغمبر پاک سے فرما رہے ہیں کہ ان سے اعراض کرو، ان کو بار بار سینے سے لگانے کی ضرورت نہیں ہے، چھوڑ دو ان کو، یہ جو اپنے ہیں بس ان کی فکر کرو۔ ہماری شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جو اپنے ہیں ان کو جوڑو اور جو غیر ہیں ان کی فکر نہ کرو اور جب ہمارا مزاج یہ بنے گا کہ ہم غیر کو جوڑیں گے اور اپنوں کو توڑیں گے تو یہ شریعت کے خلاف ہو گا۔ اللہ کو یہ جوڑ نہیں چاہیے۔ بس اپنوں کو جوڑو! اپنوں کو ایسا جوڑنا کہ جس میں اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کو ساتھ ملانا پڑے تو یہ جوڑ اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے، یہ توڑ ہے، ایسے جوڑ کو ہم نے کیا کرنا ہے؟!

میں یہ بات اس لیے سمجھا رہا ہوں کہ ممکن ہے کل آپ کسی ادارہ کے سربراہ بنو، کل آپ کسی جماعت کے سربراہ بنو تو اس کا بہت خیال رکھنا! ایسا کبھی نہ کرنا کہ جماعت کے سربراہ ہونے پر اپنے محنت کرنے والے کارکنوں کو نظر انداز کر دو اور غیروں کو خوش کرنے کی کوشش کرو! یہ بات مطلوب نہیں ہے۔

دیکھو! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو نیت بھی ٹھیک تھی جب آپ کے پاس حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا صحابی آئے۔ اس وقت بڑے بڑے کافر آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کی تو نیت بھی ٹھیک تھی کہ موقع ملا ہے میں ان کو بات سمجھاؤں، اپنے صحابی کو تھوڑا سا نظر انداز کیا ٹھیک نیت کے ساتھ لیکن اللہ نے پوری سورت نازل فرما دی ﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَهُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾ وَ مَا یُدۡرِیۡكَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾﴾ [194] کہ میرے پیغمبر! آپ کیا کر رہے ہیں! کتنی سخت تنبیہ آ گئی ہے۔

اس لیے اپنوں کی فکر کرو جو درد لے کر آیا ہے، جو تڑپ لے کر آیا ہے، اس کی فکر کرو، ان کو سنبھالو، باقی سنبھلتے ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں سنبھلتے تو جائیں۔ اگر یوں نہ سمجھ آئے تو پھر اس طرح سمجھ لو کہ ایک عورت تمہارے نکاح میں ہے۔ پہلے کھانا اس کو کھلاؤ۔ محلے میں ایک غریب عورت ہے، مستحق وہ بھی ہے لیکن پہلے اپنی بیوی کو کھانا کھلاؤ، یہ زیادہ اہم ہے۔ اپنے بچے بھوکے ہیں، اوروں کے بھی بھوکے ہوں گے، اُن کی فکر بھی کرنی چاہیے لیکن پہلے اپنے بچوں کی فکر کرو، اپنے بچوں کو چھوڑ کر دوسروں کو کھانا کھلانا اور اپنے بھیک مانگتے پھریں یہ شریعت نہیں ہے۔ اسی طرح دینی معاملات میں اپنوں کو جوڑو، اپنوں کو!

194۔ عبس 80:1 تا 3

"جوڑ" کیجیے لیکن کس سے:

اور جوڑ کے حوالے سے ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایک ہیں ہماری موجودہ امت کے افراد اور ایک ہیں امت کے گزرے ہوئے اکابر افراد۔ جوڑ کا ایک مطلب یہ ہے کہ امت کے بعد کے افراد کو اہلِ حق کے پہلے اکابر سے جوڑو تاکہ یہ ان سے نہ ہٹیں، اور ایک معنی یہ ہے کہ بعد والے اکابر سے کٹتے ہیں تو کٹ جائیں، ابھی جو حق اور باطل ہے ان کو جوڑو۔

تو میں حضرات سے کہتا ہوں کہ جوڑ کی بات تو ہم بھی کہتے ہیں لیکن ہمارے ہاں جوڑ کی بات یہ نہیں ہے کہ آج کے حق اور باطل کو جوڑو۔ ہمارے ہاں جوڑ کا پہلا معنی ہے اس امت کے اصاغر کو اس امت کے گزرے ہوئے اکابر سے جوڑو تاکہ یہ دائیں بائیں نہ ہٹیں، اُن کے نظریات پہ چلیں۔ ہم اگر ایک نیا نظریہ دیں گے اور نیا نظریہ دے کر حق اور باطل کو جوڑیں گے تو یہ غلط ہے۔ پرانا نظریہ جو اکابر کا تھا وہ پیش کرو تاکہ اس امت کے اصاغر اس امت کے اکابر سے جڑے رہیں۔ اپنے اکابر پر لعنت بھیج کر الگ نہ ہو، اور میں گزارش کرتا ہوں کہ اللہ کے لیے محقق نہ بنو، ناقل بنو۔ ہم گزشتہ مسائل پر تحقیق کریں گے تو اکابر سے اصاغر کو کاٹ دیں گے اور اگر صحیح ناقل بنیں گے تو آنے والے اصاغر کو جانے والے اکابر سے جوڑ دیں گے۔ عافیت امت کو گزشتہ کے ساتھ جوڑ دینے میں ہے، گزشتہ سے توڑنے میں نہیں ہے۔

گناہ گاروں اور نیکو کاروں کا بدلہ:

﴿وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ﴿۳۱﴾﴾

آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔ اللہ چونکہ مالک ہیں اس لیے

برے کو اس کے برے عمل کا بدلہ دیں گے اور نیک کو اس کی نیکی کا بدلہ دیں گے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾﴾

جو لوگ بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں اور بطور خاص بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، ﴿اِلَّا اللَّمَمَ﴾ ہاں چھوٹے چھوٹے گناہ ان سے ہو جاتے ہیں تو الگ بات ہے، اللہ بہت وسیع مغفرت والے ہیں، چھوٹے گناہ معاف فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں خوب جانتے ہیں جب اللہ نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم ماں کے پیٹ میں تھے اللہ اس وقت بھی جانتے ہیں۔ اس لیے اپنے آپ کے پاکدامن ہونے کے دعوے نہ کیا کرو۔

گناہگار کو امید اور نیکوکار کو تنبیہ:

یہاں دونوں کو بات سمجھائی ہے: ایک مُسِیئ اور دوسرا مُحسِن۔ جو مُسئی یعنی گناہ کرنے والا ہے وہ ذہن میں رکھے کہ اللہ کی رحمت بہت بڑی ہے، مایوس نہ ہونا کہ ہم تو گناہ گار ہیں ہماری معافی کیسے ہو گی؟ اور جو نیک تھے ان کو بھی سمجھایا کہ نیکی پر اکڑنا مت، جو مجرمین ہیں وہ امیدیں رکھیں اور جو نیک ہیں وہ اکڑیں مت۔ مجرم امید رکھیں اور ہم سے معافی مانگیں اور جو نیک ہیں وہ نیک عمل بھی کریں اور پھر بھی ہم سے معافی مانگیں کہ کہیں نیک عمل کی توفیق سلب نہ ہو جائے۔ اللہ پاک نے کیسے دونوں فریقوں کو بات سمجھائی ہے۔

گناہ صغیرہ اور کبیرہ میں فرق:

یہاں فرمایا: "كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ"۔ ایک ہے گناہِ کبیرہ اور ایک ہے گناہِ صغیرہ۔

کبیرہ اور صغیرہ میں فرق یہ ہے کہ وہ گناہ جس پر نص میں جہنم کی وعید آئی ہو یا وہ گناہ جس پر نص میں لعنت کے الفاظ آئے ہوں، یا وہ گناہ جس پر نص میں کوئی حد مقرر کی گئی ہو تو وہ کبیرہ ہے، اور وہ گناہ جس پر کوئی وعید نہ آئی ہو، لعنت نہ آئی ہو اور اس پر کوئی شرعی حد بھی مقرر نہ ہو تو وہ صغیرہ ہے لیکن اگر صغیرہ پر اصرار کیا جاتا ہو وہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایک گناہ صغیرہ ہے لیکن اس کے مفاسد اور نتائج کبیرہ گناہ کی طرح ہوں تو وہ بھی کبیرہ میں شامل ہے۔

اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ وہ ناپسندیدہ ہوتی ہیں، مکروہ ہوتی ہیں، نامناسب ہوتی ہیں، گناہ صغیرہ ہوتی ہیں لیکن اسی میں اگر نیت بدل جائے تو گناہ کبیرہ ہی نہیں بلکہ کفر تک پہنچ جاتی ہیں۔ میں مثال دیتا ہوں کہ مسجد کا صحن ایسا ہو کہ وہاں اینٹیں نہیں لگی ہوئیں، وہاں صرف مٹی ہے، صفیں بھی نہیں ہیں، دریاں بھی نہیں ہیں، قالین بھی نہیں ہے، صرف مٹی ہے، اب وہ جگہ پاک ہے اور آدمی کا تھوک بھی پاک ہے۔ اب اگر کوئی شخص کوتاہی کرے، غفلت کرے اور وہاں تھوک دے تو یہ ناپسندیدہ ہے، مکروہ ہے، اگرچہ تھوک پاک ہے لیکن اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا، انتہائی برا کام ہے لیکن لیکن اگر کوئی شخص اسی تھوک کو کسی پاک جگہ پر پھینک دے نفرت کی وجہ سے تو یہ کفر ہے۔ اب دیکھو! جرم تو ایک ہی ہے، تھوڑی سی نیت کے بدلنے سے وہ صرف کبیرہ گناہ ہی نہیں بلکہ کفر ہو گیا ہے۔ تو بسا اوقات ایک ہی گناہ ہوتا ہے، اس کی ایک جہت کو دیکھیں تو صغیرہ ہوتا ہے اور دوسری جہت کو دیکھیں تو گناہِ کبیرہ نہیں بلکہ کفر ہو جاتا ہے۔

میں اس لیے ہر بات کو سمجھاتا ہوں کہ ہر بات کی بنیاد پر غور ضرور کیا کریں کہ یہ کام ہم کیوں کرتے ہیں؟ پھر خود کو بدلنے کی کوشش کریں ورنہ نقصان بہت ہوتا ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت۔۔۔:

﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾

فرمایا کہ پاک دامنی کا دعویٰ نہ کرو۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کبھی فعل بول کر نفسِ فعل کا معنی مراد ہوتا ہے۔ یعنی فعل بول کر اسی فعل کا جو معنی نظر آرہا ہوتا ہے وہی معنی مراد لیا جاتا ہے، اسے کہتے ہیں کہ "نفسِ فعل" مراد ہے اور کبھی فعل بول کر نفس فعل نہیں بلکہ ارادہ فعل مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾[195]

اب یہاں معنی یہ نہیں ہے کہ جب تم نماز کے لیے بالکل کھڑے ہو جاؤ تو اب وضو شروع کرو، بلکہ یہاں معنی یہ ہے کہ جب تم ارادہ کرو قیام الی الصلوٰۃ کا تو اب تم وضو کرو۔ تو یہاں فعل بول کر ارادہ فعل مراد ہے۔

اور بسا اوقات فعل بول کر دعویٰ فعل مراد ہوتا ہے جس طرح یہاں ہے "فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ"، اس میں یہ دعویٰ فعل مراد ہے کہ تم نے پاک تو ہونا ہے کیونکہ "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا" کامیاب وہ شخص ہے جس نے اپنا تزکیہ کیا۔ تو تزکیہ تو کرنا ہے لیکن یہاں فرمایا کہ "فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ" اب یہاں اس کا ترجمہ یہ نہیں کریں گے کہ اپنا تزکیہ نہ کرو بلکہ یہاں معنی ہے کہ تم تزکیہ کا دعویٰ نہ کرو۔ تو یہاں دعویٰ فعل مراد ہے۔ اسی طرح قرآن میں ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ﴾[196]

195۔ المائدۃ 6:5

196۔ آل عمران 31:3

کہ اے نبی! ان سے فرماؤ کہ اگر تم اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری بات مانو۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری بات مانو کیونکہ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ تو اتباع کرے گا۔ لیکن یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تمہارا اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے نا تو پھر حضور کی اتباع کرو! تو یہاں دعویٰ فعل مراد ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اشخاص کے نام بدل دیے صرف اس وجہ سے کہ اس میں دعویٰ تزکیہ کی بو آرہی ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا صحابیہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا نام ہے؟ انہوں نے کہا: "برہ"۔ فرمایا: بدل دو۔ "برہ" کا معنی ہوتا ہے خود کو نیک سمجھنے والی۔ اس کا نام رکھو "زینب" ایسے لفظ بدل دیے ہیں کہ جن سے دعویٰ تزکیہ کی بو آتی ہے۔

انفاق کی عادت ڈالیے:

﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ﴿٣٣﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿٣٤﴾﴾

اے پیغمبر! آپ نے بھلا اس شخص کو بھی دیکھا ہے جو روگردانی کرتا ہے، جو تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔ کدیۃ اس پتھر کو کہتے ہیں کہ جب پانی کے لیے کھودیں تو نیچے سے وہ پتھر نکل آئے اور رکاوٹ بنے۔ کوئی بندہ پیسہ خرچ کرتا ہے اسے مفاد نظر نہیں آتا تو روک لیتا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی بندہ نیک عمل شروع کرتا ہے اور کچھ عرصے بعد نیک عمل ختم کر دیتا ہے تو یہ بھی اس میں شامل ہے۔ نیک عمل کریں اور ہمیشہ کریں۔ حدیث پاک میں ہے:

"وَمَا زَالَ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ إِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی أَحْبَبْتُهٗ." [197]

197۔ صحیح البخاری، رقم:6502

بندے کے عمل میں تسلسل ہو تو اللہ اسے اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔

کیا اس کو علم غیب ہے کہ ایسی باتیں کرتا ہے؟

﴿اَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡغَيۡبِ فَهُوَ يَرٰى ۝٣٥ اَمۡ لَمۡ يُنَبَّاۡ بِمَا فِىۡ صُحُفِ مُوۡسٰىۙ ۝٣٦ وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِىۡ وَفّٰٓىۙ ۝٣٧﴾

کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے جس کو وہ دیکھ رہا ہے؟ کیا اس کو ان باتوں کا کوئی علم نہیں ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے؟ کون ابراہیم؟ فرمایا: "الَّذِىۡ وَفّٰٓى" کہ ابراہیم وہ تھے جو امتحانات میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان صحیفوں میں باتیں کیا ہیں؟ آگے اٹھارہ آیات میں تقریباً وہی باتیں ہیں جو صحفِ موسیٰ اور صحفِ ابراہیم میں تھیں۔

ان آیات کا پس منظر یہ ہے ایک شخص نے قرآن مجید کی آیات سنیں اور اس کا دل ایمان کی طرف مائل ہو گیا تو اس کو اس کے دوست نے کہا کہ تو اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر نیا دین کیوں اختیار کر رہا ہے؟ یوں اس کو کچھ عار دلائی۔ اس نے کہا کہ میں تو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آخرت میں میری پکڑ نہ ہو جائے! دوست نے کہا کہ اگر تم مجھے کچھ پیسے دے دو تو میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ آخرت کی پکڑ سے تجھے بچا لوں گا اور تمہارا عذاب اپنے سر لے لوں گا، یوں آخرت کے عذاب سے تم بچ جاؤ گے۔ اس شخص نے اس دوست کو پیسے دیے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اور پیسے مانگے تو اس شخص نے اور پیسے بھی دے دیے لیکن بعد میں دینا بند کر دیے۔ تو ان آیات میں ان دونوں کی حماقت کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جو شخص کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں آخرت کے عذاب سے بچا لوں گا تو کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ اس بات پر قادر ہے کہ اسے جہنم کے عذاب سے بچا لے؟ اور دوسرا اللہ نے ایک قاعدہ بیان کر دیا کہ

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ کہ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اس لیے اس نے جو پیسے دیے تھے کہ وہ آخرت کے عذاب سے مجھے بچالے تو یہ صرف اس کی حماقت کی بات ہے۔

اس آیت کا ایک عمومی معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مال خرچ کرتا تھا اور پھر اس کو خیال آیا کہ اگر میں نے خرچ کیا تو مال کم ہو جائے گا اور اب اس نے مال خرچ کرنا چھوڑ دیا تو اسے فرمایا جارہا ہے کہ ﴿اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى﴾ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ اس کا پیسہ خرچ کرنے سے ختم ہو جائے گا؟ حالانکہ اللہ کا تو وعدہ ہے:

﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ﴾ [198]

کہ تم جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو تو اللہ اس کے بدلے میں اور دیتا ہے، اور یہ شخص کہتا ہے کہ میرا مال ختم ہو جائے گا، فرمایا: اس کے پاس غیب کا علم تھوڑا ہے کہ یہ کہے کہ میرا مال ختم ہو جائے گا، اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے تھے:

"أَنْفِقْ يَا بِلَالُ! وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا." [199]

کہ اے بلال! مال کو خرچ کرو اور کمی کا خوف نہ کرو!

اور یہ عجیب بات ہے جس طرح انسان کا جسم ہے، اس کی عمر ستر سال کی ہو جائے تو جسم گھٹتا نہیں ہے، جس قدر جسم سے چیزیں نکلتی جاتی ہیں مثلاً پانی ہے جو پسینے کی صورت میں نکل رہا ہے تو اتنی چیزیں اللہ خوراک کے ذریعے اور پیدا کرتے رہتے

198۔ سبا 39:34

199۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج1 ص269 رقم الحدیث: 1013

ہیں، بالکل اسی طرح جب مال خرچ ہوتا رہتا ہے تو اللہ اور مال دیتے رہتے ہیں۔

”آدمی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا“ کا مطلب:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿٣٨﴾﴾

کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی گناہ کیا ہے تو اس کا بوجھ وہی اٹھائے گا جس نے گناہ کیا ہے،، کوئی دوسرا اس کے گناہ کے بوجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی کو گناہ پر لگائے اور دوسرا شخص گناہ کرے تو گناہ کرنے والے کے گناہ کا بوجھ گناہ کرنے والا ہی اٹھائے گا اور جس نے گناہ پر لگایا ہے اس کو گناہ پر لگانے کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

ایصال ثواب پر اشکال کا جواب:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾﴾

اور یہ کہ آدمی کو وہی چیز ملے گی جو آدمی نے خود کیا ہو گا، آدمی کو اپنی کمائی ملے گی۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے ایصالِ ثواب کا انکار کیا ہے کہ یہ آیت ایصال ثواب کے خلاف ہے حالانکہ اس کا ایصال ثواب سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس آیت میں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مثلاً کوئی شخص فرض نماز نہ پڑھے، کیونکہ کوئی دوسرا پڑھ کر مجھے دے گا تو مجھے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا: ایسا نہیں ہو گا بلکہ جس نے فرض ادا کرنے ہیں اس کے فرض کا اجر اسی کو ملے گا۔ تو سمجھانا یہ مقصود ہے کہ تمہیں تمہاری اپنی کمائی ملے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی نفلی عبادت کرے اور اس کا اجر تمہارے نامہ اعمال میں ڈالے گا تو تمہیں نہیں ملے گا، یہ معنی اس آیت کا نہیں ہے۔

ایک شخص مسلمان ہے اور دوسرا کافر ہے۔ اب مسلمان اگر صدقہ کرے اور کافر کو ایصال ثواب کرے تو بالکل نہیں ہو گا اور اگر مسلمان ایصال ثواب مسلمان کو کرے تو پھر ہو جائے گا۔ یہ جو دوسرے کے صدقے کا اجر اس کو ملا ہے تو اس میں بھی اس کی محنت کو دخل ہے کہ یہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا ہے ورنہ اسے ثواب کیسے ملتا؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اچھا! فرائض میں بھی تو ایسے ہوتا ہے مثلاً ایک آدمی پر حج فرض ہے، وہ نہیں کر سکا، وہ کسی دوسرے کو حج بدل کرا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جی اجر مل جائے گا۔ اب یہاں تو دوسرے کے فرض کا اجر مل رہا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حج بدل کرایا ہے تو خرچہ تو اسی نے دیا ہے، اگر یہ خرچہ نہ دیتا تو حج کیسے ادا ہوتا؟ تو حج بدل بھی اسی کے خرچے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس لیے یہ سعی میں شامل ہے۔

وعظ و نصیحت:

﴿وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾﴾

قیامت کے دن ان کی محنت ان کو دکھا دی جائے گی، پھر انہیں پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور اللہ ہی کی طرف سب نے پہنچنا ہے۔

﴿وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى ﴿۴۳﴾﴾

اللہ ہی ہنساتے ہیں اور اللہ ہی رلاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہنسنے کے اسباب اللہ دیتے ہیں تو بندہ ہنس پڑتا ہے اور رونے کے اسباب دیتے ہیں بندہ رو پڑتا ہے۔

﴿وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾﴾

اللہ ہی موت دیتے ہیں، اللہ ہی زندہ کرتے ہیں، ہر چیز میں نر اور مادہ اللہ ہی پیدا فرماتے ہیں اور وہ بھی ایک قطرے سے پیدا فرماتے ہیں جب اسے ٹپکایا جاتا ہے۔

﴿وَ اَنَّ عَلَيۡهِ النَّشۡاَةَ الۡاُخۡرٰى ﴿۴۷﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغۡنٰى وَ اَقۡنٰى ﴿۴۸﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰى ﴿۴۹﴾﴾

اور اللہ نے یہ اپنے ذمے لیا ہے کہ دوبارہ پیدا فرمائیں گے، غنی بھی اللہ کرتے ہیں اور مال محفوظ بھی اللہ کرتے ہیں۔ شِعریٰ کا رب اللہ ہی ہے۔

''شعریٰ'' ایک ستارے کا نام ہے جسے مکہ والے پوجتے تھے۔ تو ان سے کہا جا رہا ہے کہ شعریٰ کا رب بھی تو اللہ ہے تو تم پھر اس کو کس لیے پوجتے ہو؟!

﴿وَ اَنَّهٗۤ اَهۡلَكَ عَادَاۨ الۡاُوۡلٰى ﴿۵۰﴾ وَ ثَمُوۡدَاۡ فَمَاۤ اَبۡقٰى ﴿۵۱﴾ وَ قَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا هُمۡ اَظۡلَمَ وَ اَطۡغٰى ﴿۵۲﴾﴾

اللہ نے عادِ اولیٰ کو ہلاک کیا، قوم ثمود کو بھی ہلاک کیا ہے۔ قوم عاد کے نبی حضرت ہود علیہ السلام تھے اور قوم ثمود کے نبی حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ اللہ نے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑا، اور اس سے پہلے قوم نوح کو بھی ہلاک کیا۔ قوم نوح کے بعد سب سے پہلے جن پر عذاب آیا تھا وہ عادِ اولیٰ تھی، یہ لوگ ظالم اور سرکش تھے۔

﴿وَ الۡمُؤۡتَفِكَةَ اَهۡوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾﴾

اور جو بستیاں الٹی ہوئی تھیں تو ان کو بھی اللہ نے ہی الٹا کر رکھ دیا تھا، پھر ان بستیوں پر اور جو عذاب آئے وہ تمہیں تو پتا نہیں وہ اللہ ہی جانتے ہیں کہ کتنے عذابوں نے ان کو ڈھانپ لیا! اے لوگو! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں پر شک کرتے ہو! جھگڑتے ہو! اختلاف کرتے ہو!

﴿هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿٥٦﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿٥٧﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَ تَضْحَكُوْنَ وَ لَا
تَبْكُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَ اَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿٦١﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَ اعْبُدُوْا ﴿٦٢﴾﴾

یہ قرآن بھی ایسی ڈرانے والی کتاب ہے جیسے پہلے ڈرانے والے صحیفے تھے۔ یا "نَذِیْرٌ" سے مراد پیغمبر بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ پیغمبر ایسے ڈرانے والے ہیں جیسے پہلے پیغمبر ڈرانے والے تھے۔ قیامت آرہی ہے، اللہ کے علاوہ کوئی اس کو ہٹا نہیں سکتا۔ اور اللہ تو ہٹائیں گے نہیں۔ تم ان باتوں پر تعجب کرتے ہو؟ پھر ہنستے ہو؟ تمہیں رونا نہیں آتا؟ اور تم کھیل کود میں پڑے ہو! اللہ کو سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کیا کرو۔

﴿فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَ اعْبُدُوْا ﴿٦٢﴾﴾

اس آیتِ سجدہ پر سجدہ کرنا چاہیے۔

اللہ ہمیں نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ القمر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انۡشَقَّ الۡقَمَرُ ۝۱ وَ اِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَ یَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ۝۲﴾

واقعہ شقِ قمر:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں تھے اور رات کا وقت تھا۔ مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی نبوت پر معجزہ طلب کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر معجزہ اور نشانی دکھا دوں تو تم کلمہ پڑھ لو گے؟ کہا پڑھ لیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا، اللہ کے حکم سے چاند دو ٹکڑے ہوا۔ ایک ٹکڑا مشرق اور ایک مغرب میں اور درمیان میں غار حراء والی پہاڑی حائل ہو گئی۔ اس پر مشرکین کہنے لگے کہ ابھی تو ہم اس پر یقین نہیں کرتے، ہو سکتا ہے کہ جادو سے آپ نے دو ٹکڑے کیے ہوں، اس لیے کل دن کا انتظار کرتے ہیں، باہر سے جو لوگ کل مکہ مکرمہ آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ کیا انہوں نے بھی ایسا دیکھا ہے؟ اگر دیکھا ہو تو پھر ہم مان لیں گے۔ دوسرے دن جب لوگ باہر سے آئے، ان سے پوچھا تو وہ بھی کہتے تھے کہ ہم نے بھی دو ٹکڑے دیکھے لیکن ان لوگوں نے پھر جادو کہہ کر اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تو اللہ رب العزت نے بات سمجھائی۔

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝١ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝٢﴾

قیامت قریب آ گئی ہے، اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ یہ لوگ کوئی بھی نشانی دیکھتے ہیں تو اعراض کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے جو تھوڑے وقت کے بعد ختم ہو جائے گا۔

"مُّسْتَمِرٌّ" کا معنی کبھی دائمی ہوتا ہے اور کبھی اس کا معنی عارضی ہوتا ہے۔ "مَرَّ" یہ مُرور سے ہے بمعنی گزرنے والا۔ تو جب کوئی چیز گزرتی ہے تو ختم ہو جاتی ہے۔ تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ یہ جادو ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گا کیونکہ یہ عارضی چیز ہے۔

﴿وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝٣﴾

انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑے، ہر کام نے آخر کار ایک انجام کو پہنچنا ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے دنیا میں ہر کام کا کوئی نہ کوئی انجام ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کا درس دے رہے ہیں اور اپنی رسالت پر معجزات بھی پیش فرما رہے ہیں جیسے یہ معجزہ شقِ قمر ہے۔ ادھر کافر لوگ اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کام کر رہے ہیں اور منکرین اپنا کام کر رہے ہیں۔ ﴿كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ﴾ ہر کام نے انجام کو پہنچنا ہے۔ یعنی تمہیں جلد ہی انجام معلوم ہو جائے گا کہ پیغمبر سچ فرما رہے ہیں اور تم انکار کر کے غلط انجام کو پہنچ رہے ہو۔

یہ جو فرمایا: ﴿وَكَذَّبُوْا﴾ کہ ان لوگوں نے جھٹلایا، جہاں تک چاند کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تعلق ہے اس کو تو نہیں جھٹلایا اور جھٹلا بھی کیسے سکتے تھے کیونکہ یہ

تو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، تو پھر جھٹلایا کس کو تھا؟ اس نشانی کا جو مقتضٰی تھا یعنی توحید اور نبوت... ان لوگوں نے اس کو جھٹلایا تھا۔

﴿وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵﴾

ان کے پاس بہت ساری نشانیاں آئیں جن میں ان کے لیے خبردار کرنے کا سامان تھا، کامل حکمت اور دانائی کی باتیں تھیں مگر ان کو ڈرانے سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

﴿فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝۷ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝۸﴾

آپ ان کو چھوڑ دیں، ایک وقت آئے گا کہ پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف پکارے گا۔ "الدَّاعِ" سے مراد ہے فرشتہ اور "نُّكُرٍ" ایسی چیز کو کہتے ہیں جو مزاج کے موافق نہ ہو، یعنی جب قیامت آئے گی تو ان کو پھر سمجھ آئے گی۔ آنکھیں ان کی جھکی ہوئی ہوں گی، قبروں سے ایسے نکلیں گے جیسے ٹڈیاں منتشر ہوتی ہیں۔ پھر یہ سر جھکا کر چلیں گے اس فرشتے کی طرف اور کہیں گے کہ آج کا دن بہت مشکل ہے۔

قوم نوح پر طوفان:

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّ ازْدُجِرَ ۝۹ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰﴾

صرف انہوں نے نہیں جھٹلایا بلکہ ان سے پہلے قوم نوح نے بھی ہمارے بندے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا، ہمارے بندے کو کہتے تھے کہ یہ مجنون ہے، پھر انہیں دھمکیاں دیں۔ تو نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا کہ اللہ! میں بہت

بے بس ہو چکا ہوں، میری مدد فرما۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی قوم والے بسا اوقات ان کے گلے کو دباتے، نوح علیہ السلام بے ہوش ہو جاتے لیکن پھر بھی اللہ سے دعا مانگتے کہ اللہ! ان کو ہدایت دے دیں، ان کو پتا نہیں کہ میں ان کا کتنا خیر خواہ ہوں۔ ساڑھے نو سو سال اس تکلیف میں گزارے اور بالآخر اللہ سے مدد مانگی کہ اے اللہ! میری مدد فرما۔

﴿فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾﴾

تو ہم نے آسمان سے زور دار پانی برسایا اور زمین سے چشمے نکالے۔ یوں آسمان اور زمین کا سارا پانی آپس میں ملا اور بالآخر جو فیصلہ ہو چکا تھا اس کے نتیجے میں یہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔

﴿وَ حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾ وَ لَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾﴾

ہم نے ان کو تختوں اور میخوں سے بنی ایک کشتی پر سوار کیا جو ہماری نگرانی میں چلتی رہی، یہ عذاب دراصل سزا تھی ان لوگوں کی جو کافر تھے۔ ہم نے اس کو عبرت کے آثار کے طور پر باقی رکھا، کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَ نُذُرِ ﴿۱۶﴾﴾

دیکھو! پھر ہمارا عذاب اور ہمارا ڈر سنانا کیسا تھا؟

قرآن کے آسان ہونے کا معنی:

﴿وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾﴾

ہم نے قرآن کو بہت آسان کر دیا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لیے، تو کوئی ہے اس سے نصیحت حاصل کرنے والا۔

یہاں "لِلذِّكْرِ" سے مراد یا تو نصیحت حاصل کرنے والا ہے یا اس سے مراد ہے "حفظ کرنا" کہ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے حفظ کرنے کے لیے، تو ہے کوئی اس کو حفظ کرنے والا، اس کو یاد کرنے والا۔

میں اس کو پہلے بھی کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ قرآن کریم کی ایک حیثیت ہے واعظ اور ناصح ہونے کی اور قرآن کریم کی ایک حیثیت ہے شارع ہونے کی۔ یہ جو قرآن کی حیثیت ہے کہ یہ وعظ و نصیحت ہے تو اس اعتبار سے یہ بہت آسان ہے اور جو قرآن کریم کی حیثیت ہے احکامات اور عقائد کی اس اعتبار سے قرآن آسان نہیں ہے، اس اعتبار سے محنت کرنی پڑتی ہے، پوری زندگیاں کھپانی پڑتی ہیں اور پھر بھی آدمی سمجھتا ہے کہ شاید مجھ سے کہیں غلطی نہ ہو گئی ہو۔

آیاتِ قیامت کو سن کر ڈر جانا یہ تو آسان ہے، آیاتِ جنت کو سن کر خوش ہو جانا بھی آسان ہے، گزشتہ قوموں کے حالات کو سننا اور عبرت حاصل کرنا بھی آسان ہے لیکن اس سے عقائد و مسائل کا استنباط کرنا بہت مشکل کام ہے۔

قوم عاد کی تباہی:

﴿كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿١٨﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾﴾

قوم عاد نے بھی تکذیب کی تو دیکھو! ہمارا عذاب اور ہمارا ڈر سنانا کیسا تھا؟ ان پر عذاب یہ تھا کہ ہم نے ان پر سخت ہوا بھیجی مسلسل نحوست والے دن میں جو ان لوگوں کو اکھاڑ کے پھینک رہی تھی اور پھر وہ ایسے پڑے ہوئے تھے جیسے اکھڑی ہوئی

کھجور کے تنے ہوں۔

﴿فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٢١﴾﴾

دیکھو! کیسے ان پر عذاب آیا، ہم ان کو ڈراتے رہے لیکن یہ باز نہیں آتے۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾﴾

ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے، تو ہے کوئی نصیحت حاص کرنے والا۔

قوم ثمود کا انجام:

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿٢٣﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿٢٤﴾﴾

قوم ثمود نے نبیوں کو جھٹلا دیا۔ ایک نبی کی تکذیب چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی تکذیب ہوتی ہے اس لیے یہاں "نُذُر" جمع لائے ہیں، اور وہ کہتے تھے کہ کیا ہم ایک بشر کی پیروی کریں؟ اگر ہم اس کی پیروی کریں گے تو ہم گمراہی میں ہوں گے اور جنون میں ہوں گے۔

"ضَلٰلٍ" سے مراد ہے گمراہی اور "سُعُرٍ" سے مراد ہے جنون اور آگے جو "اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ" آرہا ہے تو اس "سُعُرٍ" سے مراد جہنم ہے۔

مطلب ان کا یہ تھا کہ دیکھو! جب بھی کسی شخص کی اتباع کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اگر ہم اتباع ان کی کریں کہ ان سے دنیا ملے گی تو وہ تو تب ہو گا کہ جس کی اتباع کریں وہ صاحبِ ثروت ہو، دولت والا ہو، یہ تو صاحبِ ثروت آدمی نہیں ہیں تو دنیا کے امور میں ان کی اتباع کیوں کریں؟ اور اگر اتباع کرتے ہیں شریعت میں اور امورِ دین میں تو وہ فرشتہ ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بات مانیں، یہ تو ہماری طرح کا بشر

ہے۔ تو خلاصہ ان کی بات کا یہ تھا کہ یہ نہ تو فرشتہ ہے کہ ہم اس کی اتباع دینی امور میں کریں اور نہ ہی یہ صاحبِ طاقت ہے کہ ہم دنیاوی امور میں اس کی اتباع کریں۔

﴿ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿٢٥﴾﴾

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کیا اسی پر وحی آنی تھی، یہ تو کذاب ہے، جھوٹ بولتا ہے اور شیخی مارتا ہے العیاذ باللہ۔

﴿سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿٢٦﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو عنقریب پتا چل جائے گا کہ جھوٹا کون ہے اور شیخی کون مارتا ہے؟

﴿اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾﴾

ہم ان لوگوں کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیج رہے ہیں اس لیے اے پیغمبر! آپ صبر کریں اور بیٹھ کر انہیں دیکھیں اور یہ بات ان کو بتائیں کہ پانی ان لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر کسی کو اپنی باری پر حاضر ہونا چاہیے۔

یہ واقعہ تو آپ کے ذہن میں ہے، اس لیے تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾﴾

تو ان لوگوں نے اپنے ایک آدمی کو بلایا۔ اس کا نام ”قدار“ تھا۔ اس نے اونٹنی پر حملہ کر دیا اور اس کے پاؤں کاٹ دیے جس سے وہ بیچاری مر گئی۔ دیکھو! ہمارا عذاب اور ہمارا ڈر سنانا کیسا تھا؟! ان پر عذاب کیا تھا؟ فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾﴾

ہم نے ان پر سخت قسم کی چیخ بھیجی جس کی وجہ سے یہ باڑ کے چورے کی طرح ہو گئے۔

کھیتوں کے باہر کانٹوں کی باڑ لگاتے ہیں جو سال چھ مہینے کے بعد بالکل چُورا سا بن جاتا ہے۔ تو اس چیخ کی وجہ سے ان پر ایسا عذاب آیا کہ وہ بھی اس چُورے کی طرح بن کر رہ گئے، ایسے کہ ہاتھ لگاؤ تو ختم ہو جاتے تھے۔

قومِ لوط کی پکڑ:

﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ۝٣٣ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۝٣٤ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝٣٥﴾

قوم لوط نے نبیوں کو جھٹلایا۔ ہم نے ان پر پتھروں کی بارش برسائی، ہاں جو حضرت لوط علیہ السلام کو ماننے والے تھے صرف ان کو نجات ملی۔ ہم نے ان کو سحری کے وقت اس عذاب سے بچا لیا تھا۔ یہ ان کے لیے ہماری طرف سے ایک نعمت تھی۔ یہ صرف ان کے ساتھ نہیں ہے بلکہ جو بھی پیغمبر کی بات مانتا ہے ہم اس کو عذاب سے بچا لیتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ۝٣٦﴾

حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو ہماری پکڑ سے ڈرایا لیکن وہ پھر بھی ہماری تنبیہات اور ڈرانے میں شک کرتے رہے۔

﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝٣٧﴾

انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو ان کے مہمانوں کے بارے میں پھسلانا چاہا۔ وہ فرشتے تھے جو بے ریش لڑکوں کی صورت میں مہمان بن کر آئے لیکن یہ ظالم وہاں پہنچے۔ لوط علیہ السلام نے دروازے بند کیے تو وہ چھتوں کے اوپر سے آئے۔ ان

مہمانوں نے کہا کہ ہم تو بے ریش لڑکے نہیں ہیں، ہم تو اللہ کے فرشتے ہیں اور ان کو عذاب دینے کے لیے آئے ہیں۔ پھر لوط علیہ السلام کی گھبراہٹ ختم ہوگئی۔

آل فرعون کی سرکشی اور اس کا انجام:

﴿وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾﴾

اور فرعونیوں کے پاس ڈر سنانے والی کچھ چیزیں آئی تھیں لیکن ان لوگوں نے ہماری ساری نشانیوں کو جھٹلا دیا تھا تو ہم نے ان کو ایسے عذاب دیا جیسے طاقت والا اور قدرت والا عذاب دیتا ہے۔

"النُّذُرُ" سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش کی تھیں۔

پانچ بڑی اقوام عالم:

پورے قرآن کریم میں بار بار ان پانچ قوموں کا بہت ذکر کیا گیا ہے: قومِ لوط، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ نوح اور قومِ فرعون۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ بہت طاقت والے لوگ تھے، پوری دنیا میں ان کی طاقت کی مثال نہیں تھی۔ تو ان اقوام کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ جب ان طاقت وروں کو ہم نے نہیں چھوڑا تو کمزوروں کو مارنا ہمارے لیے کیا مشکل ہے؟!

﴿اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾﴾

آپ ان سے پوچھیں کہ کیا تمہارے کافر اُن گزشتہ لوگوں سے بہتر ہیں؟ یا تمہارے بارے میں کسی آسمانی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ تمہیں عذاب نہیں ہو گا؟ یا

ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہم طاقت والے ہیں، ہم اپنا بچاؤ کر لیں گے ؟!

تو کیا تمہارے اندر کوئی خاص فضیلت کی چیز ہے کہ ان قوموں کو تو ہلاک کیا لیکن تمہیں ہلاک نہیں کریں گے ؟!

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝٤٥﴾

ایک وقت آئے گا کہ ان کی پوری جماعت کو شکست ہو گی، اور یہ غزوہ بدر اور احزاب میں ہوا تھا، اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ۝٤٦﴾

صرف یہی نہیں ہوا کہ ان کو دنیا میں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا بلکہ ان کے وعدے کا وقت تو قیامت ہے اور قیامت بہت زیادہ خوفناک بھی ہے اور بہت کڑوی بھی ہے۔

﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝٤٨﴾

جس دن ان کو منہ کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ اب جہنم کا عذاب چکھو!

﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝٤٩ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝٥٠﴾

ہم نے ہر چیز کو ناپ تول کر پیدا کیا ہے اور ہم جب فیصلہ کرتے ہیں تو ہمارا حکم ایسے ہوتا ہے کہ پلک جھپکنے میں عمل میں آجاتا ہے۔

"قَدَرٍ" سے مراد تقدیر ہے۔ تقدیر علمِ الٰہی اور امرِ الٰہی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔

﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝٥١﴾

ہم نے تم جیسے کئی لوگ پہلے ہلاک کر دیے تھے۔ کیا اس سے عبرت حاصل

والا کوئی ہے؟

﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿٥٢﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿٥٣﴾﴾

اوران کافروں نے جو جو کام کیے ہیں یہ سب کام اعمال نامے میں لکھے ہوئے ہیں، ہر چھوٹی بڑی بات سب لکھی ہوئی ہے۔

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ﴿٥٤﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٥٥﴾﴾

اور متقین باغات اور نہروں میں ہوں گے، طاقت والے بادشاہ کے ہاں اچھے مقامات پر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی انہیں میں شامل فرمالے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ الرحمٰن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ ﴿۴﴾﴾

سورۃ القمر میں کفار کے لیے جہنم کے عذاب کا ذکر تھا، اب اس سورۃ میں ایمان والوں کے لیے نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

لفظ رحمٰن سے سوت کے آغاز کی وجہ:

﴿اَلرَّحۡمٰنُ ۙ﴿۱﴾﴾

مشرکینِ مکہ میں رحمٰن کا نام زیادہ معروف نہیں تھا۔ اس لیے اللہ نے رحمٰن کے نام سے پوری سورت نازل فرمائی اور اس کا آغاز بھی لفظ رحمٰن سے کیا ہے۔ مشرکین خود کہا کرتے تھے: "مَا الرَّحۡمٰنُ؟" کہ رحمٰن کیا ہے؟ تو اللہ نے پوری سورت اسی نام سے نازل فرمائی۔

قرآن سب کو سیکھنا چاہیے:

﴿عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾

رحمٰن نے قرآن سکھایا ہے۔ "عَلَّمَ" بابِ تفعیل سے ہے جس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ ایک مفعول کا ذکر کیا اور دوسرے کا نہیں۔ مطلب کہ جو سکھایا ہے

اس کا ذکر تو ہے اور جس کو سکھایا ہے اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہر کسی کو پتا ہے کہ قرآن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے۔ تو متعلم اول حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں... یا اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ قرآن کریم کی تعلیم ہر کسی کو دینی ہے اس لیے اس کا مفعول بہ ذکر نہیں فرمایا، یہ بتانے کے لیے کہ قرآن کریم ہر کسی کو سیکھنا چاہیے۔

اللہ کی نعمتیں:

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝۳ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝۴﴾

اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا، پھر اس کو بولنا سکھایا۔

یہاں پہلے تخلیق کا ذکر ہے اور اس کے بعد تعلیم کا ذکر ہے لیکن جب ذکر فرمایا تو تعلیم پہلے اور تخلیق بعد میں ذکر کی، یہ بتانے کے لیے کہ تخلیق سے مقصود یہ ہے کہ بندہ دین سیکھے اور اس پر عمل کرے۔

﴿اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵﴾

سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ متعین ہیں۔ صدیوں سے چل رہے ہیں، نہ تھکتے ہیں اور نہ ہی جگہ بدلتے ہیں، یہ ایک انداز سے چل رہے ہیں۔

﴿وَّ النَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶﴾

نجم بھی درخت کو کہتے ہیں اور شجر بھی درخت کو کہتے ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ شجر سے مراد ہے ایسا درخت جس کا تنا ہو اور نجم سے مراد ایسا درخت ہے جس کا تنا نہ ہو۔ جس طرح انگور وغیرہ کی بیلیں ہوتی ہیں جن کا تنا نہیں ہوتا۔ تو بغیر تنے اور تنے والے درخت اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہاں سجدے سے مراد حقیقی سجدہ نہیں ہے جیسے انسان کرتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ تکویناً اطاعتِ خداوندی پر

مامور ہیں۔ اسی کو سجدے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ﴿٧﴾﴾

آسمان کو اللہ نے بلند کیا۔ پھر اللہ نے میزان رکھا ہے۔

میزان سے مراد ظاہری ترازو نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ آلہ ہے کہ جس سے کسی چیز کو تولا جائے یا ناپا جائے، جس کی ایک صورت ترازو بھی ہوتی ہے۔

﴿اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ﴿٨﴾﴾

اللہ نے میزان بنایا تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو۔

﴿وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿٩﴾﴾

اور انصاف کا خیال کرو ناپ تول میں اور کبھی کمی نہ کرنا۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اصل ہے عدل۔ عدل سے کبھی نہ ہٹنا اور تمام چیزوں میں عدل بنیاد ہوتا ہے۔ عدل سے ہٹ جائیں تو پھر ظلم ہوتا ہے۔

﴿وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿١١﴾﴾

اور خدا نے زمین پھیلائی ہے لوگوں کے لیے، اس میں میوے ہیں اور ایسے کھجور کے درخت ہیں جن کا پھل غلاف میں ہوتا ہے۔

﴿وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾﴾

اور کئی طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسہ بھی ہوتا ہے اور کھانے کے لیے دانے بھی ہوتے ہیں جیسے گندم، مکئی، چاول وغیرہ۔ اللہ نے کیسا نظام بنایا۔ گندم کا دانہ دیکھ لیں کہ کیسے محفوظ ہوتا ہے؟! چاول دیکھ لیں تو کیسے محفوظ ہے؟! مکئی دیکھ لیں کیسے محفوظ ہے؟! اسے محفوظ بنا کر اللہ پھر بندے کے حوالے کر دیتے ہیں۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝١٣﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝١٤﴾

صلصال کہتے ہیں اس مٹی کو جو پانی میں ہو اور پھر خشک ہو جائے اور فخار کہتے ہیں کہ مٹی پانی میں ہو اور پھر وہ آگ پر تپا دی جائے۔ تو اللہ پاک نے انسان کو پیدا فرمایا صلصال یعنی ایسی مٹی سے جو پانی میں ملی تھی اور اس کے بعد وہ مٹی ایسی سخت ہوئی جیسے آگ پر پکائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے نرم ہوتی تھی بعد میں سخت ہو گئی۔

﴿وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۝١٥﴾

اور جنات کو پیدا کیا خالص آگ سے یعنی ایسی آگ سے جس میں دھویں کی آمیزش نہ ہو، اس آگ سے جنات کو پیدا کیا۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝١٦﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟! اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ خدا نے مٹی سے کتنا خوبصورت انسان بنایا۔

﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝١٧﴾

سورج گرمی میں الگ جگہ سے طلوع ہوتا ہے اور سردی میں الگ جگہ سے طلوع ہوتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا جگہوں کا فرق ہے، اس لیے مشرقین اور مغربین فرمایا۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝١٨﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ یہ بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے؟!

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝١٩ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝٢٠﴾

اللہ دو سمندر چلاتے ہیں جو آپس میں ملے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان ایک پردہ ہوتا ہے اور پردہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک سمندر دوسرے میں داخل نہ ہو۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢١﴾﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟! یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، آدمی پڑھ تو سکتا ہے لیکن جب تک خود نہ دیکھے صحیح مزا نہیں آتا۔ سمندری سفر نہ کرے، سمندروں میں نہ جائے تو مزا نہیں آتا۔

﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾﴾

ان دونوں سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔

موتی اور مونگا دونوں قیمتی ہیں جو اس سے نکلتے ہیں۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٣﴾﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟!

﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿٢٤﴾﴾

اور اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں وہ بڑے بڑے جہاز ہیں جو سمندروں میں ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے پہاڑ ہوں۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٥﴾﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے ؟!

سمندر: خدائی قدرت کا کرشمہ

اللہ کی کتنی بڑی قدرت ہے! اور آپ یقین فرمائیں کہ جب تک بندہ سمندری سفر نہ کرے ان چیزوں کو مانتا تو ہے لیکن دلی یقین نہیں آتا۔ عجیب نعمت ہے۔ پانی کے

اوپر انسان تیر رہا ہے، پانی کے اوپر بندہ کھیل رہا ہے اور اتنے بڑے بڑے جہاز ہیں کہ ہمارے گاؤں جیسے دس گاؤں ہوں تو ایک جہاز میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک بحری بیڑا بناتے ہیں جس پر سو سو جنگی جہاز ہوتے ہیں، اترتے ہیں، جاتے ہیں، اترتے ہیں، جاتے ہیں، ایک ایک جہاز میں چھ چھ ہزار بندہ بیٹھا ہوتا ہے اور دو دو ماہ اس نے پانی میں چلنا ہوتا ہے اور پھر چھ ہزار بندوں کی خوراک ساتھ ہے۔ پھر جہازوں میں پورے گراؤنڈ بنے ہوئے ہوتے ہیں، فٹبال اس پر کھیل رہے ہوتے ہیں اور ایک ایک بندے کا الگ الگ کمرہ ہوتا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ اب یہاں یہ بات سمجھ نہیں آتی جب تک بندہ سفر نہ کرے۔ دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سمندر میں سیر کے لیے جاتے ہیں، موبائل بند کیا بیوی بچے ساتھ لیے اور سمندر میں چلے گئے، ہفتہ ہفتہ سمندر میں رہتے ہیں اور سیر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ پاک آپ کو بھی دین کی وجہ سے ایسے اسفار عطا فرمائیں۔ پھر یہ نعمتیں دیکھیں۔ دین کی برکت سے جب یہ چیزیں بندہ دیکھتا ہے تو عجیب سرور محسوس کرتا ہے۔

متکلمِ اسلام کا سمندری سفر:

ابھی ہم ملائیشیا میں تھے۔ میں جب بھی بیرون ملک جاتا ہوں اور اپنے معمولات سے جب فارغ ہوتا ہوں تو پھر خواہش ہوتی ہے کہ سیر کریں۔ اس دفعہ ہم گئے تو ایک سمندر تھا، وہاں ہم گئے، اس کے ساحل کا نام Monkey Beach تھا۔ بندر کو کہتے ہیں Monkey اور ساحل کو کہتے ہیں Beach۔ وہاں بندر بہت تھے۔ ہم ایک جگہ سے گزرے، آگے جانا تھا تو ہم نے کشتی بک کرائی۔ جب ہم بیٹھے تو ہمارے ساتھ ایک فیملی بھی بیٹھ گئی، وہ غالباً ہندو تھے۔ جب ہم بیٹھے تو ایک عورت تھی اس نے کہا کہ ہم ان کے ساتھ نہیں بیٹھیں گے۔ ہمارے ساتھی سادہ تھے، جلدی سے اتر گئے حالانکہ جو چلانے والا تھا اس نے اس فیملی سے کہا کہ اگر تم ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتے

تو تم اتر جاؤ کیونکہ یہ لوگ تو پہلے کھڑے تھے لیکن ہمارے ساتھیوں نے جلدی کی۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں عجیب حکمت ہوتی ہے۔ جس جہاز میں ہم پہلے جانے لگے تھے وہ جہاز چھوٹا تھا اور اس کی سیٹیں بھی سوزوکی کی سیٹوں کی طرح تھیں، باہر سے پانی آتا تو گندگی وغیرہ اندر آتی۔ خیر ہم اس سے اتر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ایک اور جہاز آیا تو وہ بڑا تھا اور اس کی سیٹیں بھی کرسیوں کی طرح تھیں اور صاف بھی تھا، بڑا مزا آیا۔ ساتھی مجھے کہنے لگے کہ استاد جی! آپ کے ساتھ اللہ کا عجیب نظام چلتا ہے، چھوٹے جہاز سے اتارا اور بڑے اور اچھے جہاز میں بٹھایا۔ پھر وہاں سے ہم سیر کے لیے گئے۔ یہ میں اس لیے بتاتا ہوں کہ اگر اللہ بندے کو مواقع دے تو بندے کو جانا چاہیے۔

ایک مرتبہ میں کوالالمپور سے کِلنتَن گیا تو گھر والے میرے ساتھ تھے۔ میں نے میزبانوں سے کہا بھائی! کیا پروگرام بنایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ تھوڑی دیر آرام کریں، کھانا کھالیں تو عصر سے پہلے اٹھیں گے، عصر کی نماز کے بعد جائیں گے ساحل پر سیر کرنے کے لیے۔ میں نے کہا کہ عصر کے بعد کیوں جانا ہے؟ صبح چلیں گے! تو انہوں نے کہا کہ عصر کے بعد گیدرنگ ہوتی ہے، بہت مزا آتا ہے۔ گیدرنگ رش کو کہتے ہیں۔

وہ تو کہنے لگے رش میں بہت مزا آتا ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی! گیدرنگ میں تو وہ جائے جس نے دوسرے کی بیوی دیکھنی ہو، مجھے تو گیدرنگ میں نہیں جانا کیونکہ میری بیوی میرے ساتھ ہو گی، میں نے تو اپنی بیوی کو دیکھنا ہے۔ وہ لوگ اس پر بہت ہنسے اور ایک دوسرے کو یہ سناتے رہے۔

میں نے کہا: ہم صبح فجر کی نماز کے بعد جائیں گے، فجر کی نماز کے بعد ساحل سمندر پر کوئی شخص نہیں ہوتا، ساحل خالی ہوتا ہے اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، عصر کے بعد لوگ آتے ہیں سیر کرنے کے لیے تو گناہوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اور فجر

کے بعد یہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں اور سمندر بالکل صاف ہوتا ہے، فضائیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی یہ نعمتیں دکھائے۔ آمین

اللہ کی دو اہم صفات؛ ذوالجلال والاکرام

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝٢٦ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝٢٧﴾

ہر چیز جو زمین پر ہے وہ ختم ہو جائے گی اور صرف اللہ کی ذات رہ جائے گی۔

"وَجْهُ رَبِّكَ" سے مراد اللہ کی ذات ہے۔ زمین و آسمان سب ختم ہو جائیں گے لیکن چونکہ پہلے تذکرہ زمین کا تھا اس لیے فرمایا کہ زمین کی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔

"ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ"... یہ ذوالجلال اللہ کی ذاتی صفت ہے اور ذوالاکرام اللہ کی اضافت والی صفت ہے۔ ذوالجلال سے مراد ہے عزت والے اور ذوالاکرام سے مراد ہے احسان والے۔ احسان تو دوسروں پر ہوتا ہے اس لیے یہ اضافی صفت ہے۔ اللہ عظمت والے بھی ہیں اور احسان بھی کرتے ہیں... اور یہ دو صفتیں اللہ کی اکٹھی کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر جو لوگ عظمت والے ہوتے ہیں وہ احسان کا خیال نہیں کرتے تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کی ذات وہ ہے جو عظمت والی بھی ہے اور احسان والی بھی ہے۔

عظیم لوگوں کو صاحبِ احسان ہونا چاہیے:

میں نے جب اس آیت کی تفسیر پڑھی تو یقین کریں مجھے بہت مزا آیا۔ ایک بات میں معاشرے میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جو شخصیات ہوتی ہیں، جن کا معاشرے میں قد کاٹھ ہوتا ہے وہ دائیں بائیں کسی کا خیال نہیں کرتے۔ ان کا مزاج ہوتا ہے کہ کسی کو ضرورت ہو تو ہمارے پاس آجائے اور ضرورت نہ ہو تو نہ آئے کیونکہ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اللہ کرے وہ بات آپ کی سمجھ میں آ

جائے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عام طور پر جو عظمت والے لوگ ہیں وہ احسان نہیں کرتے، اللہ کی ذات ایسی ہے کہ جو عظمت والی بھی ہے اور احسان والی بھی ہے۔

چھوٹوں پر شفقت کریں!

آپ کسی علاقے میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ جو وہاں بڑے لوگ ہوتے ہیں دین کے اعتبار سے یا دنیا کے اعتبار سے خواہ کسی اور اعتبار سے... مثلاً بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں خاندانی وجاہت ہوتی ہے، پردادا پیر تھا، پھر دادا پیر تھا، پھر باپ پیر تھا، پھر اب بیٹا پیر ہے، یوں ایک نسل آرہی ہے تو وہ اس علاقے کی روحانی گدی شمار ہوتی ہے، روحانی شخصیت شمار ہوتی ہے، قوم میں ان کا بہت بڑا احترام ہوتا ہے، ان کی عظمت بہت ہوتی ہے... لیکن وہ دوسروں کا خیال نہیں کرتے کہ کوئی اس علاقے میں غریب ہے تو اس کی مدد کردیں، کوئی بے دین ہے تو اس کو دین پر لائیں، کوئی مصیبت میں ہے تو اس کی مصیبت دور کردیں! نہیں بس وہ اسی میں مست ہوتے ہیں کہ ہم بہت بڑے لوگ ہیں۔

تو اللہ تو عظمت والے بھی ہیں اور اکرام والے بھی ہیں۔ اگر اللہ پاک دنیا میں کسی کو ظاہری عظمت عطا فرمادیں تو عظمت کے ساتھ پھر احسان والی صفت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیں تو بہت ڈر لگتا ہے کہ جو عظمت والے ہیں ان کا کھانا الگ ہوتا ہے، رہنا الگ ہوتا ہے، پینا الگ ہوتا ہے حتی کہ ان کے ساتھ جو چلنے والے ہیں وہ بھی ان نعمتوں کو نہیں کھا سکتے۔ ڈرائیور ساتھ ہوگا، خادم ساتھ ہوگا اور لوگ ساتھ ہوں گے لیکن ہر پل محسوس ہوگا کہ یہ بڑے ہیں اور یہ چھوٹا ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے، اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔

متکلمِ اسلام کی شفقت کے چند واقعات:

[۱]: ہمارے ساتھ یہ چلتے ہیں بھائی نعیم اللہ ڈرائیور وغیرہ تو ضرورت ہو تو بتانا پڑتا ہے کہ یہ ڈرائیور ہے لیکن ویسے معمول کے مطابق اتریں تو کوئی پوچھتے ہیں کہ یہ آپ کا بیٹا ہے؟ آپ دیکھیں اس کا کپڑا میرے کپڑے سے قیمتی ہوتا ہے، اس کا جوتا میرے جوتے سے قیمتی ہوتا ہے، میں چائے بہت کم پیتا ہوں... مجھے چائے کا شوق نہیں ہے، ہاں اگر مجلس کے لوگ ہیں اور چائے آگئی تو پی لی، بوتل آگئی تو پی لی، باقی میرا ذوق چائے کا نہیں ہے... لیکن صرف اپنے ڈرائیور کی وجہ سے میں چار چار مرتبہ چائے بنواتا ہوں اور فون پہ کہتا ہوں کہ بھائی! خالص دودھ ہو، اس میں پتی ڈالو، چینی اور پانی الگ رکھنا ہے... وہ ہم خود ڈالیں گے۔ اس کی وجہ کہ یہ ایسی چائے پیتا ہے جس میں دودھ ہو، پتی ہو لیکن چینی نہ ہو، اس کی وجہ سے میں آرڈر دیتا ہوں تو اس کو مزے کی چائے ملتی ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں بتا رہا کہ میں بہت اچھا کام کر رہا ہوں بلکہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

[۲]: ابھی پرسوں ہم ڈیرہ اسماعیل خان سے واپس آ رہے تھے۔ میں نے سِلانوالی جانا تھا۔ میانوالی سے گزر رہے تھے تو راستے میں ہمارے ایک ساتھی تھے خوشاب کے امیر مولانا فیصل صاحب... ان کو میں نے فون کیا۔ میں نے کہا کہ وقت بہت کم ہے، مدرسے میں نہیں آسکتے۔ انہوں نے کہا کہ قریب آکر رابطہ کریں تو میں سڑک پر آکر مصافحہ کر لوں گا۔ پھر میں نے بھائی نعیم اللہ سے پوچھا چائے پینی ہے؟ کہا کہ جی! پینی ہے۔ میں نے کہا کہ وقت بہت تھوڑا ہے، کوئی طریقہ ایسے بنائیں کہ چلتے چلتے پی لیں گے! کہا کہ چلیں استاد جی پھر رہنے دیں! میں سمجھ گیا کہ پینی ہے۔ بس پھر میں رہنے نہیں دیتا۔ میں نے پھر مولانا فیصل صاحب کو فون کیا کہ ہم نے چائے پینی ہے خالص دودھ میں پتی ڈالنی ہے، چینی نہیں ڈالنی، اس کی کوئی ایسی ترتیب بنائیں کہ وقت بھی بچ

جائے اور چائے بھی پی لیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

روڈ کے اوپر ان کا مدرسہ ہے، ایک گیٹ روڈ پر ہے اور ایک اندر ہے۔ کہنے لگے کہ سڑک والا گیٹ عموماً نہیں کھلتا، ہم سڑک والا گیٹ کھول دیں گے، گیٹ کھلتے ہی ساتھ کمرہ ہو گا وہاں بیٹھ کر چائے پی لیں گے۔ میں نے کہا کہ جب میں آؤں تو دستر خوان لگا ہو۔ اب دودھ پتی چائے پڑی ہے... چینی ساتھ پڑی ہے... سموسے پڑے ہیں... گجریلا پڑا ہے۔ یہ میں نے اپنے لیے مانگا کیونکہ اگر میں اپنے لیے نہ مانگتا اور کہتا کہ ڈرائیور نے چائے پینی ہے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ ایک کپ چائے ہوتا۔ تو بسا اوقات صرف ان کو چائے پلانے کے لیے اپنے لیے چائے کا آرڈر دیتا ہوں اور پھر اتنی اچھی ہوتی ہے کہ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی پی لوں۔

تو میں نے اس لیے کہا کہ بندہ عظمت والا تو ہوتا ہے لیکن اکرام والا نہیں ہوتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَلِظُّوا بِيَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ.[200]

کہ اس لفظ کو لازم پکڑو یعنی جب دعائیں مانگو تو یہ کہا کرو "یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ" اس سے اللہ رب العزت دعائیں قبول فرما لیتے ہیں۔

بس اپنے کام میں برکت چاہتے ہو تو اپنے سے چھوٹوں سے معاملہ ٹھیک رکھو پھر یہ محبتیں دیکھنے والی ہوتی ہیں، بڑا کوئی تمہیں پیار نہیں دے گا، چھوٹے تمہیں پیار دیں گے۔

[۳]: پرسوں جب ہم پہاڑ پور بیان کے لیے گئے تو میرے ساتھ مولانا مصطفیٰ خلیل صاحب تھے۔ وہ کہنے لگے استاذ جی! یہاں لوگ کھڑے ہیں، یہ آپ سے وقت لینا

200۔ سنن الترمذی، رقم:3525

چاہتے ہیں۔ میں نے کہا: گاڑی روکو لیکن وقت نہیں دیں گے کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ گاڑی روکی تو وہ دوڑ کر آئے، ملے، حال حوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ استاد جی! یہاں قریب مسجد ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ آپ سنگِ بنیاد رکھیں۔ میں نے کہا کہ وقت بہت کم ہے، میں نے آگے جانا ہے، میرا سفر بہت لمبا ہے، آپ ناراض نہ ہوں، ان شاء اللہ اس سے اگلے سفر میں ملیں گے۔

خیر ہم آگے چلے گئے۔ بیان سے فارغ ہوئے تو مجھے مفتی عبد الواحد قریشی صاحب نے کہا استاد جی! یہاں ایک بہت بڑے عالم تھے فوت ہو گئے ہیں، اب ان کے بچے ہیں وہ مسجد کا سنگِ بنیاد آپ سے رکھوانا چاہتے ہیں۔ پہلے مجھے اس بات کا پتا نہیں تھا۔ میں نے کہا چلو! وہاں گئے، والد صاحب ان کے فوت ہو گئے تھے، ان کا بیٹا کوئٹہ میں درجہ سادسہ میں پڑھ رہا تھا، اس سال نہیں گیا کیونکہ مدرسہ سنبھالنا ہے۔ ہم گئے، دعا کی اور پتھر رکھا۔ مفتی صاحب نے انہیں پہلے سے کہا تھا کہ استاد جی رکیں گے نہیں، صرف پتھر رکھیں گے اور فوراً نکلیں گے۔

وہ لڑکا میرے ساتھ چل رہا تھا، بڑی منت کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ دو منٹ دو منٹ تشریف رکھیں! کیونکہ اس علاقے میں اہلِ بدعت بہت ہیں، آپ کے یہاں بیٹھنے سے سے میری عزت بڑھے گی۔ مفتی صاحب سے میں نے کہا کہ چلو پانچ منٹ سے کیا ہوتا ہے۔ ہم بیٹھے، تھوڑا سا بیان کیا اور دعا کی۔ انہوں نے دستر خوان پھر بچھا دیا۔ میں نے کہا کہ اب بیٹھ جاؤ یہ خوش ہو جائیں گے۔ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تو مجھے مفتی صاحب نے دو ہزار روپے دیے، مجھے یقین ہو گیا کہ ان غریبوں نے دیا ہو گا کہ ان کو ہدیہ دے دو۔

اب یہ چھوٹے تھے تو دیکھو محبت بھی دی ہے، پھل بھی کھلایا ہے، دو ہزار روپے بھی دیے ہیں اور وہ کتنے خوش ہوں گے کہ ہمارے پاس رکے۔ اس لیے اپنے

سے چھوٹوں سے محبت کرو، پھر اللہ کی عنایات دیکھو کیسے آتی ہیں؟!

﴿يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝۲۹﴾

اللہ سے آسمان والے اور زمین والے اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں، سب اسی کے سائل ہیں ہر دن اللہ کی ایک نئی شان ہے۔

یوم سے مراد وقت ہے کہ اللہ ہر روز اور ہر وقت ایک نئی شان میں ہوتے ہیں، کسی کو کچھ دے رہے ہیں کسی کو کچھ دے رہے ہیں۔

﴿سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝۳۱﴾

ایک وقت آئے گا اے جنو اور انسانو! کہ جیسے ہم تمہارے لیے فارغ ہو گئے ہیں... کیا مطلب؟ کہ قیامت کا دن آئے گا، حساب کتاب کا دن آئے گا۔

اللہ رب العزت کو ایک کام کرنے کے لیے دوسرے کام سے فارغ ہونے کی ضرورت نہیں ہے لیکن بندہ جب سارے کام چھوڑ کر ایک کی طرف توجہ کرے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ کام بہت اہم ہے۔ تو یہ بات مخاطب کی عقل کی رعایت رکھتے ہوئے اس انداز میں اس لیے فرمائی ہے کہ تاکہ مخاطب کو بات سمجھ آجائے کہ ایک وقت آنے والا ہے جس میں حساب کتاب ہو گا اور کوئی کام نہیں ہو گا۔

﴿فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝۳۲﴾

تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟!

یہاں سوال یہ ہے کہ حساب کتاب کی خبر دینا یہ نعمت کیسے ہے؟ جواب یہ ہے کہ نعمت ہی تو ہے کہ اللہ نے آنے والے احوال کی تمہیں خبر دے دی ہے۔ اگر دشمن ہمارے اوپر حملہ کرنے والا ہو اور کوئی بندہ اتنا بتادے کہ تمہارے اوپر حملہ ہونا ہے تو ہم اس کے کتنے احسان مند ہوتے ہیں کہ یار اس نے ہمیں بتادیا۔ تو یہاں اللہ بتا رہے ہیں کہ ایسا ہونا ہے کہ تمہارا حساب کتاب ہو گا۔ میں پہلے بتا رہا ہوں تاکہ تم اس کی

تیاری کرو۔ تو یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾﴾

اے جن اور انس! اگر تم آسمان اور زمین کی حدود سے نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ، لیکن یہ نکلنا بغیر طاقت کے نہیں ہے اور طاقت تمہارے پاس ہے نہیں تو تم کیسے نکلو گے؟

﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾﴾

تم پر آگ کا شعلہ بھی چھوڑا جائے گا اور دھواں بھی چھوڑا جائے گا، پھر تم مقابلہ بھی نہیں کر سکو گے!

شواظ کہتے ہیں آگ کے شعلہ کو اور نحاس کہتے ہیں دھویں کو۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ شواظ آگ کا وہ شعلہ ہے جس میں دھواں نہ ہو اور نحاس وہ دھواں ہے جس میں آگ کا شعلہ نہ ہو۔ یہ دونوں قسم کے عذاب ہوں گے، کبھی شعلہ بھی ہو گا اور دھواں بھی ہو گا، کبھی صرف آگ ہو گی اور دھواں نہیں ہو گا اور کبھی صرف دھواں ہو گا اور آگ نہیں ہو گی۔ یعنی ہر قسم کے عذاب ہوں گے۔

آسمان سرخ ہو جائے گا:

﴿فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا تو یہ ایسے سرخ ہو جائے گا جیسے سرخ رنگا ہوا چمڑا ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت سے ڈرو۔ یہ ایسا سرخ ہو گا جس طرح لوہا تپ کر سرخ ہو جاتا ہے۔

﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾﴾

اللہ کو سب چیزیں معلوم ہیں، اللہ تحقیقِ حال کے لیے بندوں سے نہیں پوچھیں گے۔ جو پوچھیں گے وہ صرف دھمکانے کے لیے تاکہ اپنے اوپر خود گواہی دیں۔ یہ جو معنی کہ اللہ بندوں اور جنات سے ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھیں گے ہی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بغیر پوچھے تمہیں عذاب دے سکتے ہیں لیکن جو پوچھیں گے تو وہ صرف تہدید اور ڈرانے کے لیے اور حجت تام کرنے کے لیے۔

مجرمین کا واصلِ جہنم ہونا:

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝۴۱﴾

وہاں تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، جتنے مجرم ہوں گے ان کی نشانیوں سے پتا چلے گا، پھر ان مجرموں کو سر کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا۔

فرشتے پیشانی اور قدموں سے گھسیٹ گھیسٹ کر جہنم میں پھینکیں گے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

﴿هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝۴۳ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝۴۴﴾

اور کہا جائے گا کہ یہی وہ جہنم ہے جس کا مجرم انکار کرتے تھے۔ یہ جہنم اور گرم پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے۔

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝۴۶ ذَوَاتَاۤ اَفْنَانٍ ۝۴۸﴾

جنتی دو قسم کے ہیں؛ ایک ہیں مقربین اور ایک ہیں اصحاب الیمین۔ اصحاب الیمین سے مراد عام جنتی ہیں اور مقربین سے مراد خاص جنتی ہیں۔ خواص و عوام اللہ نے دونوں کے لیے جنت اور باغات کا ذکر کیا ہے۔ پہلے خواص کے باغات کی بات کی

ہے پھر عوام کے باغات کی۔ دونوں میں فرق کیا ہے؟ وہ بھی ساتھ ساتھ سمجھیں:

مقربین کے انعامات:

﴿وَ لِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتے ہیں ان کے لیے دو باغات ہوں گے۔ کون سے؟ ﴿ذَوَاتَاۤ اَفۡنَانٍ﴾ جو بہت شاخوں والے ہوں گے۔ اس کا معنی ہے کہ بہت گھنے ہوں گے۔ ﴿فِیۡهِمَا عَیۡنٰنِ تَجۡرِیٰنِ﴾ ان میں جاری چشمے ہوں گے۔ ﴿فِیۡهِمَا مِنۡ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوۡجٰنِ﴾ ان باغوں میں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور دو دو قسم کے ہوں گے، ﴿مُتَّكِـِٕیۡنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآىِٕنُهَا مِنۡ اِسۡتَبۡرَقٍ﴾ اور وہ ایسے بچھونوں پر بیٹھے ہوں گے جو اندر سے ریشم کے ہوں گے۔ اندازہ کریں کہ جب اندر والی طرف ریشم کی ہے تو اوپر والی طرف کیسی ہو گی۔

جب بھی کوئی بندہ فرش پر کوئی چیز بچھاتا ہے تو بیٹھنے کے لیے تو نیچے موٹا کپڑا ہوتا ہے اور اوپر پتلا اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کی جو اندرونی تہہ ہو گی وہ ریشم کی ہو گی تو اوپر کتنا خوبصورت ہو گا اس کا اندازہ تم خود کرو، ﴿وَجَنَا الۡجَنَّتَیۡنِ دَانٍ﴾ اور ان باغات کے پھل بہت قریب جھکے ہوئے ہوں گے، ﴿فِیۡهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ لَمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَ لَا جَآنٌّ﴾ ان باغات میں حوریں ہوں گی جو آنکھیں جھکائے ہوئے ہوں گی، یہ ایسی ہوں گی کہ کوئی انسان اور جن ان کے قریب بھی نہیں گیا ہو گا، ﴿كَاَنَّهُنَّ الۡیَاقُوۡتُ وَ الۡمَرۡجَانُ﴾ یاقوت اور مرجان کی طرح سرخ ہوں گی، خوب صورت ہوں گی، ﴿هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ﴾ ہمارا ضابطہ ہے کہ اچھی چیز کا بدلہ بھی ہم اچھا دیتے ہیں۔

اصحاب الیمین کے انعامات:

﴿وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۝٦٢﴾

اور دو باغات ان سے کم درجے کے ہوں گے۔ دون سے مراد یہ ہے کہ وہ مقربین کے باغات تھے اور یہ اب عام جنت والوں کے باغات ہیں۔

﴿مُدْهَآمَّتٰنِ ۝٦٤﴾

یہ باغات گہرے سبز ہوں گے۔

﴿مُدْهَآمَّتٰنِ﴾ کو میں عموماً پیش کرتا ہوں اپنے اوپر ایک اعتراض کے جواب میں۔ ابھی میں ڈی آئی خان میں تھا تو مجھے ایک چٹ آئی کہ پہلے آپ کی ڈاڑھی سفید ہوتی تھی اور اب آپ کی ڈاڑھی سیاہ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ میں نے کہا کہ سیاہ نہیں ہے تمہیں دیکھنے میں دھوکہ لگ رہا ہے، یہ ڈارک براؤن ہے، ایک ہوتا ہے براؤن جو گہرا نہ ہو اور ایک ہوتا ہے ڈارک براؤن جو گہرا ہو۔

یہ رنگ اتنا گہرا براؤن ہے کہ دیکھنے میں سیاہ لگ رہا ہے۔ جس طرح قرآن کریم میں ہے: ﴿مُدْهَآمَّتٰنِ﴾ جنت کے یہ دو باغ اتنے سبز ہوں گے کہ دیکھنے میں سیاہ لگیں گے۔ تو جس طرح سبز اتنے ہوں گے کہ دیکھنے میں سیاہ لگیں گے تو یہ بھی براؤن اتنی ہے کہ دیکھنے میں سیاہ لگتی ہے لیکن ہے نہیں۔ اس لیے آپ کی آنکھ کا قصور ہے، ہماری ڈاڑھی کا قصور نہیں ہے۔

﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ﴾ ان دو باغات میں دو چشمے ہوں گے جو ابلتے ہوں گے، ﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ﴾ اور ان میں پھل ہو گا، کھجوریں ہوں گی اور انار ہوں گے، ﴿فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ﴾ ان باغات میں ایسی عورتیں ہوں گی جو سیرت کے اعتبار سے بھی اچھی ہوں گی اور صورت کے اعتبار سے بھی اچھی

ہوں گی، ﴿حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ﴾ حوریں خیموں میں چھپی ہوں گی، ﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ﴾ یہ حوریں ایسی ہوں گی کہ کوئی انسان اور کوئی جن ان کے قریب بھی نہیں آیا ہو گا۔

﴿مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ﴾ جنتی لوگ سبز رنگ کے رَفْرَف پر اور خوبصورت فرش پر تکیہ لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ رَفْرَف کا معنی بھی سبز رنگ کا بچھونا ہوتا ہے اور خُضْر مزید اس کی تاکید کے لیے ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رَفْرَف کہتے ہیں کہ وہ چیز جس پر نقش و نگار ہو مثلاً ایسے بستر پر بیٹھے ہوں گے کہ جو سبز رنگ والے بھی ہوں گے اور نقش و نگار والے بھی ہوں گے۔ ﴿عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ﴾ کا معنی کہ نہایت خوب صورت قسم کے کپڑے ہوں گے جن پر یہ جنتی لوگ بیٹھیں گے۔ عبقری خوب صورت ہی کو کہتے ہیں اور حِسان اس کی مزید تاکید ہے۔

خواص اور عوام کے باغات میں فرق:

[1]: اب دیکھیں جو خواص کے باغات ہیں ان کے ذکر میں فرمایا: ﴿ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ﴾ کہ یہ باغات بہت شاخوں والے ہوں گے اور جو اصحاب الیمین یعنی عوام کے باغات ہیں ان کے بارے میں ﴿ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ﴾ کا ذکر نہیں ہے۔

[2]: خواص کے باغات کے بارے میں فرمایا: ﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ﴾ اور عوام کے باغات کے بارے میں فرمایا: ﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ﴾ ابلتا تو ہر چشمہ ہے، جو بھی چشمہ ہو گا پانی نکلتا ہے تب ہی تو وہ چشمہ ہوتا ہے لیکن خواص کے چشموں کے بارے میں ﴿تَجْرِيٰنِ﴾ فرمایا اور اصحاب الیمین جو عام ہیں اس میں ﴿تَجْرِيٰنِ﴾ کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی اِن کے چشمے صرف ابلتے ہوں گے اور اُن کے چشمے ابلیں گے بھی

اور ان کا فیض بھی بہت دور تک جائے گا۔

[3]: خواص کے لیے فرمایا: ﴿فِیۡهِمَا مِنۡ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوۡجٰنِ﴾ کہ ان کے باغات میں ہر پھل دو دو قسم کا ہو گا اور عوام کے لیے فرمایا: ﴿فِیۡهِمَا فَاکِهَةٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ﴾ کہ ان کے باغات میں میوے ہوں گے، انار ہوں گے، کھجور ہوں گی۔ تو خواص کے لیے ہر قسم کے میوے فرمادیے اور عوام کے لیے چند ایک میووں کے نام لیے ہیں۔ پھر خواص کے لیے ﴿زَوۡجٰنِ﴾ جوڑا جوڑا فرمایا اور عوام کے لیے یہ لفظ نہیں فرمایا۔

[4]: خواص کے متعلق ﴿قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ﴾ فرمایا کہ وہ عورت ایسی ہو گی جو اپنی نگاہ جھکا کر رکھے گی، اور عوام کے بارے میں فرمایا: ﴿مَقۡصُوۡرٰتٌ فِی الۡخِیَامِ﴾ کہ وہ خیموں میں بند ہو گی۔ دونوں میں فرق کیا ہے کہ جو عام ماحول میں آنکھیں نیچی رکھتی ہو تو وہ خود کو بچانے کے لیے بند کمروں میں کیوں نہیں ٹھہرے گی؟ تو "قٰصِرٰتُ" میں جو مبالغہ ہے وہ "مَقۡصُوۡرٰتٌ" میں نہیں ہے۔ ایک عورت اپنا خود خیال کرتی ہے اور ایک عورت کا خیال اس کا شوہر کرتا ہے۔ تو دونوں میں کتنا فرق ہے!

ان وجوہات سے معلوم ہو رہا ہے کہ خواص؛ عوام سے بہتر ہیں۔ اللہ ہمیں بھی ان خواص میں شامل فرمائے۔ اللہ ہم سب کو دنیا اور جنت کی نعمتیں عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

سورۃ الواقعۃ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۙ﴿۱﴾ لَيۡسَ لِوَقۡعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ﴿۳﴾﴾

فضائل سورت:

امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب شعب الایمان میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب مرض الوفات میں تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: مَا تَشۡتَكِيۡ؟ آپ کس چیز کا درد محسوس کرتے ہیں؟ فرمایا: ذُنُوۡبِيۡ. کہ میں گناہوں کا درد محسوس کرتا ہوں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس امت کے متواضع ترین شخص ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنات کو دعوت دینے کے لیے تشریف لے گئے تو فرمایا اپنے ساتھ اس شخص کو لے کر جاؤں گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر نہیں ہے۔ ہر صحابی کی نظر تھی کہ کس کو بلائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبد اللہ بن مسعود کو بلاؤ، اور اس امت کا متکبر ترین شخص ابو جہل ہے۔ اللہ رب العزت نے متکبر ترین شخص کو متواضع ترین شخص سے جہنم واصل کروایا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مَا تَشۡتَكِيۡ؟ آپ کس چیز کا درد

محسوس کرتے ہیں؟ فرمایا: ذُنُوْبِیْ. گناہوں کا درد محسوس کرتا ہوں۔ فرمایا: کوئی چیز چاہیے آپ کو؟ جیسے بندہ بیمار سے پوچھتا ہے، تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''رَحْمَةَ رَبِّیْ'' مجھے اپنے رب کی رحمت چاہیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''أَلَا نَدْعُوْ لَكَ الطَّبِيْبَ'' کہ ہم کسی طبیب کو بلائیں؟ فرمایا: ''الطَّبِيْبُ أَمْرَضَنِیْ'' مجھے تو میرے طبیب نے ہی بیمار کیا ہے۔ حضرت عثمان نے کہا ''أَلَا اٰمُرُ لَكَ بِعَطَائِكَ؟'' میں بیت المال سے کچھ رقم بھجوا دوں؟ فرمایا: ''فَلَا حَاجَةَ لِیْ فِيْهِ'' کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ آپ کی بچیاں ہیں، آپ کے بعد آپ کی اولاد کے کام آئے گا۔ فرمایا کہ مجھے اولاد کے لیے بھی پیسے نہیں چاہئیں، اس لیے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَرَأَ الْوَاقِعَةَ كُلَّ لَيْلَةٍ لَمْ يَفْتَقِرْ.[201]

کہ جو شخص رات کو سورت الواقعہ پڑھتا ہے اس پر فاقہ کبھی نہیں آتا۔

اور یہ میں نے اپنی بچیوں کو سکھا دیا ہے، اس لیے مجھے ان کے فاقہ کے بارے میں کوئی خوف اور ڈر نہیں ہے۔

تو سورۃ الواقعہ کے بہت سے فضائل ہیں۔ اس لیے اہتمام کے ساتھ سورت الواقعہ پڑھا کریں۔

قیامت کی ہولناکی کا بیان:

﴿ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝١ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢ خَافِضَةٌ

201۔ شعب الایمان للبیہقی: ج2 ص491 رقم الحدیث 2497

رَّافِعَةٌ ﴿۳﴾ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ﴿۴﴾ وَّ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴿۶﴾

جب قیامت آئے گی اور قیامت کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، یہ سچی بات ہے۔ متکبرین کو، کفار کو جھکا کے رکھ دے گی اور ایمان والوں کو بلند کر دے گی۔ جب زمین میں زلزلہ آجائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور پراگندہ غبار کی طرح اڑنا شروع ہو جائیں گے۔

لوگوں کی تین اقسام:

﴿وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿۷﴾﴾

یہ سب انسانوں کو خطاب ہے جو گزر چکے ہیں، جو موجود ہیں یا جو آئندہ آنے والے ہیں کہ تمہاری تین قسمیں ہیں:

1: ایک قسم ہے "مقربین" کی جو خواص ہیں۔

2: ایک قسم ہے "اصحاب الیمین" کی جو عام مؤمنین ہیں۔

3: ایک قسم کفار کی ہے۔

یہ تین قسم کے طبقات ہیں اور تینوں کا ذکر آگے فرمایا ہے کہ مقربین کو یہ ملے گا... اصحاب الیمین کو یہ ملے گا... اور کفار کو یہ ملے گا۔

دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ مقربین کو بھی ملے گا اور عام مؤمنین کو بھی ملے گا لیکن اصطلاح میں "مقربین" ان کو کہتے ہیں جو اللہ کے مزید خاص ہوں اور "اصحاب الیمین" سے مراد وہ ہیں جن کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا لیکن یہ بڑے درجے کے لوگ نہیں ہوں گے بلکہ عام ایمان والے ہوں گے۔

﴿فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۸﴾ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ

اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ ؕ﴿۹﴾ وَ السّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ۚ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۚ﴿۱۱﴾ فِيۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ﴿۱۲﴾﴾

دائیں ہاتھ والے! سبحان اللہ وہ تو کیا ہی اچھے ہیں، اور بائیں ہاتھ والے کیا ہی بدتر ہیں، اور جو اعلیٰ درجے کے ہیں وہ تو اعلیٰ درجے کے ہیں! یہی لوگ اللہ کے خواص ہیں۔ وہ تو نعمتوں کے باغات میں ہوں گے۔

پہلی قسم؛ مقربین

﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ قَلِيۡلٌ مِّنَ الۡاٰخِرِيۡنَ ؕ﴿۱۴﴾﴾

پہلے مقربین کی بات کی ہے کہ مقربین پہلے کے لوگوں میں بہت زیادہ ہیں اور بعد کے لوگوں میں کم ہوں گے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ زمانہ اولین کا ہے۔ مقربین ان میں زیادہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک اس امت کے مقربین کم ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سارے انبیاء اور ان کی امتیں... اور تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت... تو اُن میں مقربین زیادہ ہیں اور اِن میں کم ہیں۔

اُن میں زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مقربین میں انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیاء اللہ اور شہداء سب شامل ہیں جو بڑے درجے کے ہیں۔ اب ان میں سوا لاکھ تو صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں، بعد والوں میں سوا لاکھ انبیاء تو نہیں ہیں، اب ہر نبی کے ساتھ ایک صحابی بھی ہو تو پھر بھی وہ اڑھائی لاکھ بن جاتے ہیں، اس لیے مقربین پہلوں میں زیادہ ہیں اور عام جنتی اس امت میں زیادہ ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أَهْلُ الْجَنَّةِ مِائَةٌ وَعِشْرُونَ صَفًّا... کہ اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی۔ ان میں فرمایا کہ هٰذِهِ الْأُمَّةُ مِنْهَا ثَمَانُوْنَ صَفًّا... کہ اَسی صفیں تو اس امت کی ہیں اور "وَالنَّاسُ سَائِرُ ذٰلِكَ" اور چالیس صفیں ساری امتوں کی ہیں۔[202]

فرقہ جماعت المسلمین کا دعویٰ:

میں نے آپ کو سنایا تھا کہ فرقہ جماعت المسلمین کا ایک آدمی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ صرف ہم مسلمان ہیں، باقی سارے کافر ہیں۔ تو ان سے ایک آدمی نے کہا کہ اگر باقی سارے کافر ہیں تو قیامت کے دن ایک سو بیس صفیں اہلِ جنت کی ہوں گی، ان میں اَسی صفیں صرف اسی امت محمدیہ کی ہوں گی اور چالیس صفیں باقی ساری امتوں کو ملا کر ہوں گی۔ اگر صرف تم مسلمان ہو اور باقی سارے کافر ہیں تو تم تو صرف ایک صف بھی پوری نہیں کر سکتے، باقی صفیں تمہارے باپ نے پوری کرنی ہیں؟! اب دیکھیں بعض لوگ کتنے حاضر جواب ہوتے ہیں کہ مخالف بندہ خاموش ہو جاتا ہے۔

تو مقربین تو پہلوں میں زیادہ ہیں اور اصحاب الیمین اس امت میں زیادہ ہیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں اور اس پر بعض روایات بھی ہیں کہ دونوں اِسی امت کے افراد ہیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے مقربین پہلے طبقے میں زیادہ ہیں یعنی قرون اولیٰ میں اور اصحاب الیمین بعد کے زیادہ ہیں۔

مقربین کے انعامات:

﴿عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾﴾

202۔ جامع الاحادیث للسیوطی: جزء 10 ص 231 رقم الحدیث 9495

سونے کی تاروں سے بُنے ہوئے تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں گے، اور چھوٹے بچے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے ان کی خدمت کے لیے متعین ہوں گے۔ وہ بچے گلاس، جگ اور صاف شفاف شراب کے جام لے کر پھر رہے ہوں گے۔

جس طرح حوریں ہیں اسی طرح ﴿وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ﴾ ہیں۔ یہ وہ مخلوق ہے جو اللہ جنت سے پیدا فرمائیں گے۔ اس سے مراد دنیا کے بچے نہیں ہیں جو بلوغ سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ تو اپنے والدین کے پاس ہی ہوں گے بلکہ ان سے مراد وہ چھوٹے بچے ہیں جو جنت میں خدمت کے لیے ملیں گے، یہ جنت ہی کی مٹی سے پیدا ہوں گے۔ اللہ پاک خدمت کے لیے جنتیوں کو دیں گے۔

﴿لَّا یُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا یُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾﴾

اس شراب کے جام پینے سے نہ ان کے سر میں درد ہو گا، نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔

نزف اس کنویں کو کہتے ہیں کہ جس کا پانی نکال دیا جائے۔ تو یہاں مراد یہ ہے کہ وہ شراب ایسی نہیں ہو گی جس سے آدمی کی عقل ختم ہو جائے۔

﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَحْمِ طَیْرٍ مِّمَّا یَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

اور ان کے لیے پسندیدہ پھل ہوں گے اور پرندوں کا گوشت ہو گا جو ان کو پسند ہو گا۔

جس طرح کا گوشت کھانے کی دل میں خواہش پیدا ہو گی اسی طرح کا گوشت پرندے کا کھانے کو تیار ہو گا۔ یہ چاہیں گے تو تکے بن کر آئیں گے، چاہیں گے تو کباب بن کر آئیں گے، یہ چاہیں گے کہ کڑاہی ہو تو کڑاہی بن کر آئے گی۔ خدا نے کیا نعمتیں رکھی ہیں! بس تھوڑی سی زندگی ہے، اس کو حرام سے بچا لو، آخرت کی نعمتیں ہماری منتظر ہیں ان شاء اللہ۔

﴿وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ﴿٢٢﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿٢٣﴾﴾

حوریں ہوں گی سفید رنگ کی اور بڑی بڑی آنکھوں والی جس طرح کوئی موتی چھپا کے رکھتے ہیں تو اس طرح وہ صاف شفاف ہوں گی۔

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِيْمًا ﴿٢٥﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿٢٦﴾﴾

یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔ جنت میں وہ کوئی لغو اور بے ہودہ بات نہیں سنیں گے اور نہ وہاں کوئی گناہ کی بات ہو گی بلکہ سلامتی ہی سلامتی کی باتیں ہوں گی۔

دوسری قسم؛ اصحابِ یمین

﴿وَ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿٢٧﴾﴾

اور دائیں ہاتھ والے کیا ہی اچھے ہیں دائیں ہاتھ والے!

اصحابِ یمین کے انعامات:

﴿فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿٢٨﴾ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿٢٩﴾ وَّ ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿٣٠﴾ وَّ مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿٣١﴾﴾

یہ دائیں ہاتھ والے کون ہیں؟ فرمایا: وہ ایسی بیریوں میں عیش کر رہے ہوں گے جن پر کانٹا نہیں ہو گا، اور کیلے ہوں گے تہہ بہ تہہ، لمبے سائے ہوں گے، پانی چلتا ہو گا۔ کھڑا پانی بھی ٹھیک ہے لیکن چلتا پانی ذرا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

﴿وَّ فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾ وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿٣٤﴾﴾

اس کے علاوہ بہت سارے پھل ہوں گے، نہ تو ختم ہوں گے اور نہ ہی کوئی رکاوٹ ہو گی اور ان کے لیے اونچی نشستیں ہوں گی۔

ظاہر ہے کہ جب جنت بلند ہو گی تو اس میں جو بچھونا ہے وہ بھی بلند ہو گا اور بعض کہتے ہیں کہ بلند ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ چونکہ موٹا ہو گا جیسے ہمارے ہاں گدے ہوتے ہیں اس لیے اس کو "فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ" کہتے ہیں، اور ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ "فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ" سے مراد عورتیں ہیں۔ چونکہ عورت کو فراش کہتے ہیں تو وہاں عورتیں ہوں گی اور مرفوعہ سے مراد ظاہری مرفوعہ مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بلند درجے والی ہوں گی۔

﴿اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿٣٥﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿٣٦﴾﴾

ہم ان عورتوں کو ایک انداز سے بنائیں گے اور ان کو باکرہ رکھیں گے۔ باکرہ بنائیں گے نہیں بلکہ باکرہ رکھیں گے۔ جنت میں جانے کے بعد عورت کی خاصیت ہو گی کہ آدمی اگر اس سے مباشرت کرے گا تو اس کے بعد پھر باکرہ، پھر جائے گا تو پھر باکرہ، ہر بار ایسا ہو گا جیسے پہلی بار اس کے پاس جا رہا ہو۔

یا تو اس سے جنت کی حوریں مراد ہیں یا مراد دنیا کی عورتیں ہیں جنہیں جنت میں ان کے خاوندوں کے لیے خوبصورت بنا دیا جائے گا۔

﴿عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾﴾

"عُرُبًا" کہتے ہیں محبوبہ کو یعنی یہ ایسی عورتیں ہوں گی جو محبوبہ کی طرح ہوں گی، پیار ان سے بہت زیادہ ہو گا۔ "اَتْرَابًا" کہ یہ ہم عمر ہوں گی۔ ہم عمر ہونے کا معنی یا تو شوہر اور بیوی کی عمریں برابر ہوں گی جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ جنتی مرد اور عورتیں دونوں کی عمریں 33 سال کی ہوں گی۔ اب اس میں مرد اور عورت کی عمر برابر ہو تو آپس میں اُنس بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اور دوسرا معنی یہ ہے کہ عورتیں آپس میں ہم عمر ہوں گی۔ اگر عورتیں

آپس میں ہم عمر ہوں اور ان کا مزاج ملتا تو تو سوکن پن بہت کم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ دوستوں کی طرح چلتی ہیں۔ میں نے چونکہ دونوں منظر دیکھے ہیں اس لیے اچھی طرح احساس ہے۔ اللہ یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بیوی اور شوہر کی عمر کا قریب قریب ہونا اچھا ہوتا ہے۔ اس میں فائدہ بہت ہوتا ہے لیکن اگر شوہر کی عمر زیادہ ہو اور بیوی کی عمر کم ہو تو پھر شوہر کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس کو محسوس نہ ہو کہ یہ بوڑھا ہے، پھر اس کو بڑھاپے کا احساس ختم کرنا چاہیے۔ میں اس لیے بات سمجھاتا ہوں کہ عام بندے کے بڑھاپے کا احساس کا معنی صرف جنس اور شہوت ہوتی ہے... یہ معنی قطعاً نہیں ہے بلکہ شوہر کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، بات کرنے کا طرز ایسا ہو جیسے جوانوں کا ہوتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

﴿لِّاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ ﴿۳۸﴾ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۳۹﴾ وَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۴۰﴾﴾

یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ اصحاب الیمین کو دیں گے۔ اصحاب الیمین کون ہیں؟ فرمایا کہ یہ پہلوں میں بھی بہت ہیں اور بعد والوں میں بھی بہت ہیں۔

مقربین پہلوں میں زیادہ ہیں اور بعد والوں میں کم ہیں اور اصحاب الیمین یہ پہلوں میں بھی بہت ہیں اور بعد والوں میں بھی بہت ہیں۔ اس سے مراد عام جنت والے لوگ ہیں۔

دیہاتی اور شہری مزاج کی رعایت:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں لکھتے ہیں کہ اللہ نے مقربین کے لیے جو نعمتیں بیان فرمائی ہیں یہ تمام نعمتیں وہ ہیں جو اصحابِ شہر کی پسندیدہ ہوتی ہیں اور اصحاب الیمین کے لیے جو نعمتیں بیان فرمائی ہیں یہ تمام نعمتیں وہ ہیں جو اہلِ دیہات کی پسندیدہ ہوتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقربین کا مزاج کیا ہو گا اور

اصحاب الیمین کا مزاج کیا ہو گا؟ اب ذرا دیکھیں کہ مقربین کی نعمتیں کیا ہیں؟

[1]: "عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَۃٍ" سونے کی تاروں کے تختوں پر بیٹھنا

[2]: "وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ" چھوٹے چھوٹے بچے خدمت پر الگ رکھے ہوئے ہیں

[3]: "بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ" گلاس، جگ اور جامِ شراب کا دور چل رہا ہے

[4]: "وَلَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَھُوۡنَ" پرندوں کا گوشت اور تکے چل رہے ہیں

[5]: "وَحُوۡرٌ عِیۡنٌ" حوریں خدمت کر رہی ہیں

تو یہ شہریوں کا مزاج ہوتا ہے اور جب دیہاتیوں کی باری آئی تو فرمایا:

[1]: "فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ" بیریاں ہوں گی، یہ بیر کھائیں گے

[2]: اور "وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ" تہ بہ تہ کیلے کھائیں گے

[3]: "وَّ ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ" لمبے سایہ دار درخت ہوں گے

[4]: "وَّ مَآءٍ مَّسۡکُوۡبٍ" اور جاری پانی ہو گا۔ چشمے شہروں میں ہوتے ہیں یا دیہاتوں میں ہوتے ہیں؟ (دیہاتوں میں۔ سامعین) یہ دیہاتی مزاج ہے۔

[5]: "وَّ فَاکِھَۃٍ کَثِیۡرَۃٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقۡطُوۡعَۃٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَۃٍ ﴿۳۳﴾" اور پھل ہوں گے جو ختم نہیں ہوں گے اور نہ کوئی روک ٹوک ہو گی۔ پھلوں کا ماحول دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ دیہاتیوں کو خوف ہوتا ہے کہ فلاں پھل کا سیزن ختم ہو گیا، تو فرمایا کہ جنت میں نہ سیزن ختم ہو گا اور نہ پھل پر پابندی ہو گی۔ شہروں میں تو پھل کا سیزن ختم بھی ہو جائے تب بھی کولڈ اسٹور سے مل جاتا ہے لیکن دیہاتوں میں نہیں ملتا۔ اس لیے یہ جملے شہریوں سے زیادہ دیہاتیوں کے مناسب ہوتے ہیں۔

تیسری قسم: اصحاب الشمال

﴿وَ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ﴿۴۲﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾﴾

اور بائیں ہاتھ والے کتنے بدتر ہوں گے بائیں ہاتھ والے! یہ لوگ آگ اور کھولتے ہوئے پانی کے عذاب میں گرفتار ہوں گے، سیاہ دھویں کے سائے میں پڑے ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا اور نہ ہی عزت و خوشحالی کا ذریعہ ہو گا۔

﴿اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ﴿۴۵﴾ وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴۶﴾﴾

یہ لوگ دنیا میں بہت خوشحال تھے اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ خوشحال ہونا برا کام نہیں ہے، یہ اللہ کی نعمت ہے لیکن ان کی خوش حالی کا اثر یہ تھا کہ یہ لوگ بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔ یہ غلط بات ہے۔

یہاں دیکھو: ﴿یُصِرُّوۡنَ﴾ فرمایا کہ یہ لوگ گناہوں پر اصرار کرتے ہیں، کیونکہ متقین کے اوصاف میں سے ہے: ﴿وَ لَمۡ یُصِرُّوۡا عَلٰی مَا فَعَلُوۡا﴾[203] کہ وہ اصرار نہیں کرتے۔ متقی وہ نہیں ہوتا جس سے گناہِ کبیرہ نہ ہو، اس سے گناہِ کبیرہ بھی ہوتا ہے لیکن فوراً توبہ کرتا ہے۔ بس تقاضائے بشریت غالب آیا اور اس نے گناہ کرلیا، پھر فوراً توبہ کرتا ہے۔

﴿وَ کَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۬ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾

یہ لوگ کہتے تھے کہ جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے پھر ہڈیاں ہو

203۔ آل عمران 135:3

جائیں گے تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا؟ اور کیا ہمارے آباء واجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟

﴿قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِیۡنَ وَ الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ ۬ۙ اِلٰی مِیۡقَاتِ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۵۰﴾﴾

اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ ان سے فرمائیں کہ پہلے والے بھی اور بعد والے بھی سب لوگ وقت مقرر پر اٹھائے جائیں گے۔

﴿ثُمَّ اِنَّکُمۡ اَیُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُکَذِّبُوۡنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰکِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَیۡهِ مِنَ الۡحَمِیۡمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡهِیۡمِ ﴿۵۵﴾ هٰذَا نُزُلُهُمۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۵۶﴾﴾

پھر اے گمراہ جھوٹے لوگو! تم زقوم کے درخت کو کھاؤ گے، اسی سے پیٹ بھروگے، پھر اس کے اوپر گرم پانی پیو گے جیسے پیاسا اونٹ پیتا ہے۔ قیامت کے دن تمہاری یہی مہمانی ہے۔

اللہ کی چار عظیم نعمتیں:

[1]: تخلیق انسانی

اللہ آگے چار چیزیں بیان فرماتے ہیں:

﴿اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۵۹﴾﴾

یہ بتاؤ! کہ تم جو نطفہ ٹپکاتے ہو کیا تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں؟!

تم تو نطفہ رکھ کے چھوڑ دیتے ہو، باقی اس سے انسان کو پیدا کرنا یہ تم نہیں کرتے، یہ ہم بناتے ہیں۔

﴿نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَیۡنَکُمُ الۡمَوۡتَ وَ مَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤی اَنۡ

نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَكُمۡ وَ نُنۡشِئَكُمۡ فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

پھر ہم نے ہی تمہارے درمیان موت رکھی ہے، اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو ہمیں عاجز کر دے! ہم عاجز نہیں ہیں کہ تم جیسے اور بندے پیدا نہ کر سکیں اور تمہیں ایسی مخلوق بنادیں جس کو تم جانتے نہ ہو! یعنی تمہاری خلقت تبدیل کر دیں۔

﴿وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی فَلَوۡ لَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾

اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ پہلے بھی ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، تو اس بات سے تم نصیحت کیوں نہیں لیتے؟!

[2]: کھیتی اگانا

﴿اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ﴿۶۴﴾ لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰهُ حُطَامًا فَظَلۡتُمۡ تَفَكَّهُوۡنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۶۷﴾﴾

یہ بتاؤ! کہ جو کھیتی تم بوتے ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟! اگر ہم چاہیں تو پورا پودا ختم کر دیں اور تم حیرت سے باتیں ہی بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر تو تاوان پڑ گیا ہے، ہم تو محروم ہو گئے ہیں۔

[3]: پانی کی فراہمی

﴿اَفَرَءَیۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِیۡ تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡهُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ﴿۶۹﴾ لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ اُجَاجًا فَلَوۡ لَا تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾﴾

یہ بتاؤ! جو پانی تم پیتے ہو کیا تم اس کو بادلوں سے اتارتے ہو یا ہم اتارتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کڑوا بنادیں، تو پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟!

حدیث پاک میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب پانی پیتے تو پانی

پینے کے بعد یہ دعا فرماتے تھے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ سَقَانَا عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِہٖ وَلَمْ یَجْعَلْہُ مِلْحًا أُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا." [204]

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنی رحمت سے میٹھا پانی پلایا جس سے ہماری پیاس بجھ گئی اور ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے اس پانی کو کڑوا نہیں بنایا۔

جس کو یہ دعا یاد ہے تو وہ اس کو پڑھا کرے، نہیں یاد تو اس کو یاد کرے۔

[4]: آگ کی نعمت

﴿اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَہَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰہَا تَذْکِرَۃً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ ﴿۷۴﴾﴾

اچھا یہ بتاؤ! یہ جو آگ تم جلاتے ہو اس کا درخت تم اگاتے ہو یا ہم اگا رہے ہیں؟ ہم نے اس کو سامانِ نصیحت بنایا ہے اور جو لوگ صحرا کا سفر کرتے ہیں ہم نے اس درخت کو ان لوگوں کے لیے نفع مند چیز بنایا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ اپنے رب کے نام کی تسبیح کیجیے!

﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾﴾

یہ جو قسم کے شروع میں "لا" آتا ہے تو بعض کہتے ہیں کہ یہ "لا" زائدہ ہوتا ہے۔ یہ عرب کا دستور و مزاج ہے کہ "لا" زائدہ کے بعد "اُقسِمُ" کا لفظ لاتے ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ لا زائدہ نہیں ہوتا بلکہ یہ محاورات میں استعمال ہوتا ہے

204۔ کنز العمال: ج7 ص42 رقم الحدیث 18222

جیسے ہمارے ہاں بندہ عام بات کہتا ہے کہ ”نہیں! بات تو آپ نے ٹھیک کی ہے“ حالانکہ لفظ نہیں کا کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح عرب کی بھی عادت تھی، ان کے یہ محاورات تھے جیسے ہمارے ہاں ایسے محاروات میں استعمال ہوتا ہے۔

یا ”لا“ کے ذریعے مخاطب کے گمان کی نفی کرتے ہیں پھر قسم کھاتے ہیں۔

”لَآ... وہ بات نہیں جو تم کہتے ہو!، اُقْسِمُ... قسم ہے میں یہ بات کہتا ہوں۔“

اور یہاں قسم ہے ستارے کے ڈوبنے کی جگہ کی اور بتانا یہ مقصود ہے کہ جو چڑھتا ہے اس نے ڈوب جانا ہے، ڈوبتے ستارے کو دیکھ کر بندے کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

بلا طہارت قرآن چھونا جائز نہیں:

﴿وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝٧٦ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝٧٧ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝٧٨ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝٧٩﴾

یہ قسم ہے اگر تم سمجھو تو بہت بڑی قسم ہے کہ یہ قرآن عظمت والا ہے، ایک محفوظ کتاب میں ہے جس کو وہی چھو سکتے ہیں جو پاک کیے گئے ہیں۔

﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ﴾ میں ”ہ“ ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اگر کتاب ہے تو اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے اور ﴿الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں، دوسری کوئی تفسیر ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم لوحِ محفوظ میں ہے تو لوحِ محفوظ کو کون چھوتا ہے؟ انسان یا فرشتے؟ (فرشتے۔ سامعین) تو انسان تو چھو ہی نہیں سکتا۔

یا ”ہ“ ضمیر کا مرجع قرآن ہے، ﴿لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾۔ اب یہاں قرآن کریم سے خاص قرآن نہیں ہے بلکہ قرآن کریم سے مراد وہ تمام صحیفے ہیں ﴿فِيْ صُحُفٍ

مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾[205] تو قرآن سے مراد مصحف ہے، وہ تمام کتابیں جو صحیفوں میں ہیں۔ اس کا معنی کہ کسی بھی آسمانی کتاب کو آسمان سے زمین پر لانے والے ملائکہ ہوتے ہیں، ملائکہ کے بغیر کوئی اس کو چھو نہیں سکتا، تو پاکیزہ ہاتھ ہی اس کو لگتے ہیں۔

اور بعض کہتے کہ "ہ" ضمیر کا مرجع تو قرآن ہے لیکن اس سے مراد صحف نہیں ہیں بلکہ خاص قرآن کریم ہے اور "اَلْمُطَهَّرُوْنَ" سے مراد ہے انسان۔ مطلب یہ ہوگا کہ انسان پاک ہو تو قرآن کو چھوئے اور ناپاک ہو تو قرآن کو چھو نہیں سکتا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ قرآن کریم کو چھونا جنبی اور مُحدِث (بے وضو) کے لیے جائز نہیں ہے اس کی بنیاد یہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد المعجم الکبیر میں حدیث ہے:

لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرٌ.[206]

قرآن کریم کو پاک بندہ چھوئے، ناپاک بندہ قرآن کو ہاتھ نہ لگائے۔

اب یہاں یہ بات سمجھنا کہ اختلاف اس میں نہیں ہے کہ قرآن کریم کو چھونے کے لیے پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس پر تو ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ ناپاک آدمی قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، خواہ محدث ہو یا جنبی ہو، اس میں حائضہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ اس میں تو اتفاق ہے۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ آیت دلیل بن سکتی ہے یا نہیں؟ تو بعض کہتے ہیں کہ اس آیت کو بطورِ دلیل پیش کرنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ "اَلْمُطَهَّرُوْنَ" سے مراد ملائکہ ہیں۔ باقی ناپاک آدمی قرآن کو ہاتھ

205۔ عبس80:13،14

206۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج6 ص185 رقم الحدیث13039

نہیں لگا سکتا، اس کی دلیل حدیث ہے "لَا یَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّاطَاھِرٌ"، یہ آیت دلیل نہیں ہے۔

تو اختلاف مسئلے میں نہیں ہے، اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ آیت اس مسئلے کے لیے دلیل ہے یا نہیں ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ اس کو بطورِ دلیل پیش کر سکتے ہیں اور بطورِ دلیل پیش کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمۃ بنت خطاب رضی اللہ عنہا نے جب حضرت عمر آئے تھے تو بہن کی پٹائی کے بعد کہا کہ فاطمہ! لاؤ کیا پڑھ رہی تھیں؟ اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ نہیں! اس قرآن کو ناپاک بندہ ہاتھ نہیں لگا سکتا، "إِنَّكَ رِجْسٌ وَلَا یَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ" غسل کر کے آؤ، پھر تمہیں دکھاتی ہوں، وہ غسل کر کے آئے تو پھر وہ اوراق ان کو دیے جن پر قرآن کریم لکھا ہوا تھا۔[207]

ورق اس دور کا جو بھی ہوتا ہو گا۔ تو انہوں نے بطورِ دلیل اس آیت کو پیش کیا ہے۔

تو بسا اوقات مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوتا، اختلاف اس میں ہوتا ہے کہ یہ دلیل بن سکتی ہے یا نہیں؟ اس لیے جب بھی آپ دلیل پیش کریں کہ ناپاک مرد یا ناپاک عورت قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تو اس آیت کے بجائے دلیل میں حدیث پیش کریں "لَا یَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّاطَاھِرٌ" اور اگر اس آیت کو بطور دلیل پیش کرنا ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن والا حوالہ بھی پیش کریں کہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غسل کروایا اور بنیاد یہ آیت تھی۔

حائضہ قرآن نہیں پڑھ سکتی... دلیل:

ایک تو مسئلہ ہے مرد کا۔ اب مسئلہ ہے عورت کا کہ عورت اگر حائضہ ہو تو

207۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج5 ص79 رقم 6981

اس حالت میں قرآن کو چھو نہیں سکتی یہ تو نص آگئی "لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرٌ" اب قرآن پڑھ سکتی ہے یا نہیں؟ تو ہم کہتے ہیں کہ قرآن نہیں پڑھ سکتی اور آج غیر مقلدین نے مسئلہ چھیڑا ہوا ہے کہ حائضہ عورت قرآن پڑھ سکتی ہے، نفاس والی عورت قرآن پڑھ سکتی ہے کیونکہ اس کے قرآن پڑھنے کی ممانعت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

حائضہ اور نفاس والی عورت اور حالت جنابت میں قرآن کریم کو نہ پڑھ سکنے پر احادیث مبارکہ موجود ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَقْرَأُ الْحَائِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ [208]

حائضہ عورت اور حالت جنابت والا مرد یا عورت قرآن کریم نہیں پڑھ سکتا۔

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾﴾

یہ کتاب اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے، کیا تم اس کتاب کو سرسری اور معمولی سی بات سمجھتے ہو؟!

لفظ مُدهِنون یہ دُهن سے ہے، دُهن کہتے ہیں تیل کو، اِدْهان کا معنی ہوتا ہے تیل نکالنا۔ جب کسی چیز پر تیل لگائیں تو وہ بہت نرم ہو جاتی ہے۔ فرمایا تم قرآن کریم کو معمولی چیز سمجھتے ہو کہ جیسے چاہا موڑ لیا، چاہا تو مان لیا، چاہا تو نہیں مانا! ایسی بات نہیں ہے۔

﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾﴾

اور تم نے قرآن کو جھٹلانا اپنی خوراک بنا رکھا ہے کہ بس تم نے ضرور ہی جھوٹ بولنا ہے۔ جیسے ہمارے محاورات میں کہتے ہیں نا کہ جب تک فلاں شخص جھوٹ

208۔ جامع للترمذي رقم 131

نہ بولے اس وقت تک اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا! یہ ہمارے محاورات ہیں۔ تو یہاں عرب کے محاورات پر بات کی جارہی ہے کہ جب تک تم جھوٹ نہ بولو تو تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔

﴿فَلَوْ لَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَاَنْتُمْ حِیْنَىِٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾

یہ ان کو دھمکایا جارہا ہے جو کہتے ہیں کہ ہم کیسے پیدا ہوں گے؟ ہم نہیں اٹھیں گے! تو فرمایا کہ تم اٹھنے کو روک سکتے ہو؟ تمہارے بس میں ہوتا تو تم تو بندے کو مرنے بھی نہ دیتے۔ تم نکلتی روح کو نہیں روک سکتے تو جب روح دوبارہ ڈالی جائے گی تو تم کیا کر سکتے ہو؟ جب حلقوم تک روح نکل آتی ہے تم دیکھ بھی رہے ہوتے ہو اور ہم تم سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تمہیں پتا نہیں چلتا۔

﴿فَلَوْ لَآ اِنْ كُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۸۷﴾﴾

اگر دوبارہ تم نے نہیں اٹھنا تو اس روح کو تم لوٹالو اگر تم سچے ہو!

تین گروہوں کا اجمالی بیان:

﴿فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِیْمٍ ﴿۸۹﴾﴾

اب پھر مقربین کی بات فرمائی ہے کہ جو مقربین خواص ہیں ان کو راحت ہو گی اور ان کے لیے خوشبوئیں ہوں گی اور نعمتوں والے باغات ہوں گے!

﴿وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ ﴿۹۱﴾﴾

اور جو اصحاب الیمین؛ دائیں ہاتھ والے ہیں ان کے لیے فرمایا: اگر کوئی شخص اصحاب الیمین میں سے ہو گا تو ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے! یہاں اصحاب الیمین کے ساتھ ان نعمتوں کا تذکرہ نہیں کیا جو مقربین کے ساتھ کیا تھا، اس

لیے کہ یہ خواص نہیں ہیں، یہ عوام ہیں۔ خواص کی بات الگ ہوتی ہے اور ر عوام کی بات الگ ہوتی ہے۔

اصحاب الیمین میں صرف وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو نیک اعمال کریں اور گناہ کبھی نہ کریں بلکہ جو نیک اعمال کریں وہ بھی اصحاب الیمین میں شامل ہیں اور جو گناہ کریں اور توبہ کر لیں تو وہ بھی اصحاب الیمین میں شامل ہیں اور جو لوگ اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے جہنم میں چلے جائیں گے پھر جہنم سے نکل کر جنت میں جائیں تو وہ بھی اصحاب الیمین میں شامل ہیں، اور یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مسلمان اگر اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے جہنم میں جائے گا تو یہ عذاب نہیں ہو گا یہ تزکیہ ہو گا البتہ صورت عذاب کی ہوتی ہے۔ اس لیے بسا اوقات لفظ عذاب کا اس پر اطلاق ہو جاتا ہے ورنہ حقیقتاً وہاں تزکیہ ہوتا ہے گناہوں سے پاک کرنے کے لیے۔ اس مقام پر قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ ان کو پاک کر کے جنت میں داخل کیا جائے گا۔[209]

میں ایک بات کہتا ہوں کہ بسا اوقات شیطان یہاں پر انسان کو دھوکہ دیتا ہے کہ یار مقربین نہ سہی... بڑی جنت نہ سہی... چھوٹی ہی سہی، اس لیے زیادہ اعمال نہ کریں تو کیا ہوا! یہ آج کہہ رہا ہے لیکن وہاں جا کر بندہ کہے گا کہ بڑی جنت ہی ملے... یہ الگ بات ہے کہ جنت میں حسد، بغض اور کینہ نہیں ہو گا، اللہ دل کو صاف فرما دیں گے اور چھوٹی جنت پر انسان راضی ہو جائے گا لیکن دل تو یہی چاہے گا کہ مجھے بڑی جنت ہی ملے۔

﴿وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّ تَصْلِیَةُ

209۔ التفسیر المظہری: ج9 ص171

جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾

اور اگر بندہ ان لوگوں میں سے ہوا جو جھٹلانے والے ہیں، گمراہ ہیں تو گرم پانی سے اس کی مہمانی ہوگی، جہنم میں داخل ہوگا اور یہ بات حق ہے، یقینی ہے اور ہو کر رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جو تمہارا رب ہے اس کی تسبیح بیان کیا کرو۔

اللہ ہم سب کو مقربین میں شامل فرمالیں۔ اللہ ہم سب کی خطاؤں سے درگزر فرمادیں، دعاؤں کا سلسلہ مسلسل بندے کو جاری رکھنا چاہیے اور گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرنا چاہیے۔ اگر کبھی گناہ ہو جائے تو فوراً اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.